مطبوعات مؤتمر المصنفین ۲۶

کاروانِ آخرت

رشحاتِ قلم

مولانا سمیع الحق

مُرتّب

مولانا محمد ابراہیم فانی

مشاہیر علما، مشائخ، سیاسی زعماء، عالمی سیاستدانوں،
اُدبا، شعراء اور اہم شخصیات کی وفات پر مدیر "الحق"
مولانا سمیع الحق کے سحر نگار قلم سے تعزیتی تاثرات، شذرات اور تبصرے

مؤتمر المصنفین
دار العلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک پشاور
پاکستان

نام کتاب ـــــــ کاروانِ آخرت
مصنف ـــــــ مولانا سمیع الحق
مرتب ـــــــ مولانا حافظ محمد ابراہیم فانی
کتابت ـــــــ ابو عثمان محمد لطیف کیلانی (حضرت کیلیانوالہ گوجرانوالہ)
ضخامت ـــــــ ۴۴۸ صفحے
تعداد ـــــــ گیارہ سو (۱۱۰۰)
پرنٹر ـــــــ طبع فی المطبعة العربية
۴۰- لیک روڈ، بالمقابل فشی چیمبر، پرانی انارکلی، لاہور۔ پاکستان
قیمت ـــــــ ۷۵/-
ناشر ـــــــ مؤتمر المصنفین اکوڑہ خٹک (پشاور)

آئینۂ کتاب

بجہانِ دردمنداں تو بگو چہ کار داری

تب و تابِ ما شناسی دلِ بیقرار داری

چہ خبر ترا ز اشکی کہ فرو چکد ز چشمی

تو بہ برگِ گل ز شبنم دُرِ شاہوار داری

اقبال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

الحمد لحضرۃ الجلالۃ والصلوٰۃ علی خاتم الرسالۃ

"کاروانِ آخرت" احقر کے ان مضامین اور تحریری تاثرات کا مجموعہ ہے جو مشاہیر علماء، سیاسی زعماء، ادباء، شعراء، اساتذہ و مشائخ، معاصر قومی رہنماؤں، عالمی سیاستدانوں نامور سیاسی قومی اور ملی شخصیات کی وفات پر ماہنامہ "الحق" کے ادارتی صفحات کے لیے وقتاً فوقتاً قلمبند کیے گئے۔ یہ مضامین دنیا سے جانے والی شخصیات کے سوانح یا اُن کے مفصل تذکرہ کے طور پر نہیں لکھے گئے اور نہ ان مضامین کو جانے والوں کے سوانح اور کمالات کا مکمل تجزیہ سمجھا جائے۔ اس لیے کہ ان مضامین کا مقصد نہ کسی جانے والے کا مکمل تذکرہ و سوانح ہوتا تھا اور نہ "الحق" کے ادارتی صفحات (جو عموماً ابتدائی تین صفحات ہوتے ہیں) اس کے متحمل ہو سکتے تھے بلکہ اکثر ایسا ہوتا کہ پرچہ کی اکثر کاپیاں مرتب ہو کر جا چکی ہوتیں۔ پہلی کاپی شذرات کے لیے رُکی ہوتی کہ اچانک کسی کے حادثۂ انتقال پیش آجانے پر مصروفیات، مشاغل اور اسفار کے باوجود عجلت اور رواروی میں ذہنی یادداشتوں، مشاہدات، قلبی احساسات اور تاثرات سے جو مضمون اُبھرتا تھا اُسے بھی سمیٹ سمیٹ کر حسبِ گنجائش صفحہ ڈیڑھ صفحہ میں سمونا پڑتا تھا تاکہ وفات پانے والوں کا ذکرِ خیر ہو جائے، انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا جائے اور پسماندگان کے لیے تعزیت ہو اور اگر کسی کی زندگی ظلم و ستم یا کفر و استبداد اور رعونت و جبر کا پہلو لیے ہوتے ہو تو اسے بھی مُرقّع عبرت کے طور پر سامنے لایا جا سکے۔ مگر باایں ہمہ اس کتاب میں بعض نامور شخصیات کے ایسے خدّ و خال، نقوش اور زندگی کی عمومی جھلک سامنے آگئی ہے جو سوانح نگاروں اور تذکرہ نویسوں کے لیے کارآمد ثابت ہوگی کہ بعض اوقات قلبی احساسات اور وقتی تاثرات پر مبنی مرثیاتی تحریروں سے وہ پہلو سامنے آجاتے ہیں کہ کسی شخصیت کے

حالات و واقعات، ماحول اور زندگی کے عمومی رنگ کے لیے ضخیم ماخذ اور تذکرے بھی اتنے مدگار ثابت نہیں ہو پاتے۔

مجھے اس کا بھی اعتراف ہے کہ زیرِ نظر مجموعہ، علم و ادب اور تذکرہ و سوانح کے دفترِ گرانمایہ میں چند ہلکے پھلکے مضامین اور کم سواد صفحات کے اضافہ کے سوا کچھ بھی نہیں ماسوائے اس کے کہ ایک عدیم الفرصت پراگندہ حال شخص کے پریشان خاطری کے عالم میں تاثراتِ غم و الم کو "کاروانِ آخرت" کے نام سے ایک لڑی میں پرو دیا گیا ہے جس کے لیے مولانا محمد ابراہیم فانی مدرس دارالعلوم حقانیہ شکریہ کے مستحق ہیں جو میرے انکار اور تردد کے باوجود اس مجموعہ کی ترتیب کے لیے مُصر رہے اور پھر پچھلے دو ایک سال سے اس کی ترتیب و تالیف اور حواشی میں ضروری توضیح و تشریح کے کام پر لگے رہے۔ یہ اُن کے تالیفی سلسلہ کا نقشِ اوّل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خداداد صلاحیتوں کو مزید اُجاگر فرمائے اور ان کی علمی، ادبی اور تالیفی زندگی کا بہترین آغاز ہو۔ بیس سال کے طویل عرصہ پر پھیلے ہوئے اس مجموعۂ کتاب کے مندرجات، احساسات یا اظہارِ عبرت یا کسی کی مدح و قدح اور حُسن و قبح کے بیان میں کوئی غلطی، مبالغہ، افراط و تفریط یا اطراء و تنقیص کا امکان ہے ایسی کوتاہی پر حق تعالیٰ کے عفو و صفح اور جانے والوں کے وابستگان اور قارئین کے درگزر کا طالب ہوں کہ انسان ہوں وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي۔

وباللہ التوفیق وھو خیر رفیق

(مولانا) سمیع الحق صدر مؤتمر المصنفین
و مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور

صَوتِ دَرائے کارواں

فنِ تاریخ کے ساتھ مسلمانوں کی گہری دلچسپی اور وابستگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے۔ کہ ہر دور میں مسلمان مؤرخین نے اس فن میں معتدبہا ذخیرے کا اضافہ کیا ہے۔ اور ان کی یہ قلمی جولانیاں صرف تاریخِ اسلام تک محدود نہ تھیں۔ بلکہ انہوں نے غیر مسلم اقوام اور مدن و بلاد پر بھی اپنی پوری توانائیاں صرف کیں۔ بعد میں جب سیرت نگاری کا چرچا ہوا تو سیرتِ طیبّہ پر تمام جزئیات سمیت ضخیم کتابیں منصۂ شہود پر آگئیں۔ اور یہ سلسلہ تاہنوز جاری و ساری ہے۔ اس کے ساتھ مختلف سلاطین و ملوک اور خلفاء کے تذکرے بھی لکھے گئے۔ پھر جب علمِ حدیث کا رواج ہوا۔ اور روایت حدیث کیلئے فنِ اسماء الرجال کی ضرورت پڑی۔ تو مسلمان مؤرخین اور نابغۂ روزگار محدثین اس اہم اور مہتم بالشان کام کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور علم اسماء الرجال کو ایسا امتیاز بخشا کہ آج تک دیگر اہل مذاہب اسکی نظیر پیش نہ کرسکے۔

رفتہ رفتہ علم اسماء الرجال نے ترقی کی۔ اور تاریخ مختلف شاخوں اور طبقات میں بٹ گئی۔ کسی نے علماء کا طبقہ لیا۔ کسی نے ایک مذہب اور ایک مسلک کے رجال پر تحقیق شروع کی۔ کسی نے ایک صدی کے اعاظم اور نادرۂ روزگار شخصیات پر کتابیں لکھیں اس طرح کئی ضخیم مجموعے منظرِ عام پر آئے۔ یہاں پر ان موسوعات اور تاریخ کے عظیم ذخیروں سے بخوف طوالت صرف نظر کیا جارہا ہے۔ کیونکہ کتب سیر ہوں یا کتب مغازی تاریخ کامل ابن اثیر کا تذکرہ کیا جائے۔ یا البدایہ والنہایہ ابن کثیر کا۔ تاریخ طبری کو لے لیں یا تاریخ ابن خلدون کو۔ خطیب بغدادی کی تاریخ بغدادی سے بحث کریں یا علامہ سمعانی کی کتاب الانساب سے۔

حافظ ابن عساکر کی تاریخ دمشق کا ذکر ہو۔ یا حافظ سخاوی کی اعلان بالتوبیخ سے بات شروع کریں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی کی الدرر الکامنہ کیلئے وقت نکالیں یا علامہ سخاوی کی الضوء اللامع کیلئے۔ ابن فرحون کی کتاب دیباج الذہب کو دیکھیں یا سبکی کی کتاب طبقات الشافعیہ کو شیخ قاسم قطلوبغا کی کتاب تاج التراجم الاحناف کو سرمۂ نظر بنائیں یا ابن رجب کی طبقات الحنابلہ۔ الغرض تاریخی تصنیفات کا ایک دریائے ناپیدا کنار اور بحر مواج ہے جس کے لئے عمر بیکراں اور حیاتِ جاوید چاہئے۔

وفیات الاعیان کے نام سے علامہ ابن خلکان نے ایک عظیم تاریخ کی داغ بیل ڈالی۔ لیکن اس کا تعلق ہمارے اس زیرِ نظر وفیات سے نہیں۔ اس لئے کہ اس میں کسی کے مرحوم ہونے کے بعد اس کے حالات وغیرہ مرتب نہیں کئے گئے۔ بلکہ محض اس میں ان مذکورہ شخصیات کا تاریخی تذکرہ ہے۔ اس وجہ سے بجائے وفیات کے اس کو تاریخ ابن خلکان کہتے ہیں۔ پھر اس کے بعد باقاعدہ وفیات کے عنوان سے اردو زبان میں برصغیر میں اسکی ابتداء علامہ سید سلیمان ندوی ؒ نے اپنے مشہور و شہرۂ آفاق جریدہ المعارف میں کی۔ اور انتہائی اہتمام کے ساتھ یہ سلسلہ جاری رکھا۔ ایک تو آپ جس شخصیت پر تعزیتی شذرہ قلمبند کرتے وہ شخصیت اس قابل ہوتی۔ دوسری طرف مولانا کے سحر طراز قلم کی جادو نگاری اس پر مستزاد۔ چنانچہ اس دور میں اکثر حضرات اس بات کے متمنی ہوتے۔ کہ مولانا ہی کی زندگی میں ہماری موت آجائے۔ تاکہ مولانا ہم پر تعزیتی شذرہ سپردِ قلم کریں۔ گو کہ ان تعزیتی شذرات کا مجموعہ آپ کی زندگی میں شائع نہ ہوا۔ لیکن یادِ رفتگاں کے نام سے اس کی اشاعت کے بعد اس مجموعہ کو قبول دوام حاصل ہو۔ اور اربابِ علم و قلم اور اصحابِ بصیرت نے اس کو حرزِ جاں اور سرمۂ نورِ نظر کی طرح دیکھا۔ اور حلقۂ علماء و اردو دان طبقہ سے دادِ تحسین و آفرین وصول کی۔ گو کہ اس کیلئے کسی کی داد و خراج تحسین کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اس لئے کہ علامہ کی تحریر خود اس کیلئے بہت بڑی داد ہے۔ ع

حاجتِ مشاطہ نیست روئے دلآرام را

اسی طرح سید صاحب کے رفیق اور اسی مکتبۂ فکر کے ایک اور نامور اہل قلم اور سحر طراز انشاء پرداز مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی نے اپنے رسالہ صدق میں وفیات کا سلسلہ اسی اہتمام سے جاری رکھا۔ اور ایسے دلکش و دلربا عنوانات اختیار کیے کہ بے ساختہ دل و دماغ اس کیطرف متوجہ ہوجاتے۔ چنانچہ آپ کے تعزیتی شذرات کا انتخاب "وفیات ماجدی یا نثری مرثیے" کے نام مارکیٹ میں آچکا ہے۔ اس میں مضامین کی جدت، عناوین کی ندرت سے عیاں ہے۔ بطور نمونہ چند عنوانات پیش خدمت ہیں۔ اپنی والدہ ماجدہ کی وفات پر — "ماں کے قدموں پر" — اپنی ہمشیرہ صاحبہ کیلئے — "ہمشیر کی رخصتی" — اہلیہ محترمہ کیلئے — "بوڑھی محبوبہ" — حکیم الامت حضرت تھانویؒ کیلئے — "قطب الارشاد کا وصال" — مولانا عبدالماجد بدایونی کیلئے — "ہمنام نامور" — علامہ سید سلیمان ندوی کیلئے — "سید الطائفہ" — گاندھی جی کیلئے — "شہید حق پرستی" — تصدق حسین خان شیروانی کے لئے — "خوش نصیب گول کیپر" — مولوی بیر احمد علوی کیلئے — "ایک گمنام نامور" — اور شفاء الملک حکیم عبدالمجید کیلئے — "طبیب کی موت" — جیسے نادر و نایاب عنوانات منتخب کئے۔

ندوہ ہی سے سلسلہ چلا تو مفکر اسلام داعی کبیر مولانا علی میاں مدظلہ نے اپنے خامہ معجز رقم سے اپنے مخصوص طرز انشاء و انداز تحریر سے "پرانے چراغ" کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں ایک عہد اور ایک تاریخ کو قلمبند کیا جس میں اپنے مشائخ و اساتذہ کی جدائی کا ماتم ہے — معاصرین اور اپنے احباب و متعلقین کی موت پہ نوحہ ہے۔ خاندان کے نامور افراد کی فرقت کا غم ہے۔ اور جس حسین ترتیب سے مولانا نے اس کو مرتب کیا ہے۔ وہ بذات خود ایک بہت بڑی خدمت ہے۔

پھر اسی سلسلہ سے "بزم رفتگاں" کے نام سے ایک اور کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ نام سنا ہے لیکن ابھی تک اس کے دیکھنے اور مطالعہ کا موقعہ نہیں ملا ہے۔ چونکہ اس کا مصنف بھی ندوۃ العلماء ہی کے ایک فاضل علامہ سید سلیمان ندویؒ کے سچے جانشین سید

صباح الدین عبدالرحمان مرحوم ہیں۔ اور جو کئی وقیع و ضخیم کتابوں کے مصنف ہونے کے ساتھ المعارف کے ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں۔ لہٰذا مولانا کا نام ہی اسکی ثقاہت کی دلیل ہے۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔

اسی طرح ماضی قریب میں فاران کے ایڈیٹر مولانا ماہر القادری مرحوم کے تعزیتی شذرات کا مجموعہ سنا ہے شائع ہوا ہے۔ جو کہ یقیناً ایک نیک فال ہے۔ اور اگر یہی سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو آئندہ نسلوں کیلئے ایک قیمتی سرمایہ محفوظ ہو جائے گا۔ اور عروس تاریخ کی مانگ میں قیمتی موتیوں کا اضافہ ہوگا۔

زیر نظر کتاب کاروانِ آخرت اس کو نوائے سروش یا القاء غیبی ہی سمجھئے کہ بغیر ان متذکرہ بالا کتابوں کے دیکھے بندہ راقم کے دل میں تین چار سال پہلے یہ داعیہ پیدا ہوا۔ کہ اُستاذ محترم مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہٗ نے وفیات کے علاوہ الحق کے دیگر نقوش آغاز کا مجموعہ بنام اسلام اور عصر حاضر شائع کرایا۔

چنانچہ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ اگر ان تعزیتی نقوش آغاز کو کتابی شکل دی جائے۔ تو یہ تاریخ کا ایک حصہ بن جائے گا۔ اور قوم و ملت کو اس سے کافی فائدہ پہنچے گا۔ تو اُستادِ محترم نے فرمایا کہ مجھے تو فرصت نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس کی ترتیب کیلئے تیار ہوں چنانچہ انہوں نے ہامی بھرلی۔ اور انتہائی سست رفتاری سے اس پر کام شروع ہوا۔ اب الحمدللہ خدا کے فضل و کرم سے یہ کتاب جو کہ کاروانِ آخرت کے نام سے موسوم ہے منصۂ شہود پہ آگئی۔

الحق کا آغاز ۱۹۶۵ء سے ہوا تو ۲۳ سال یعنی تقریباً ربع صدی کا عرصہ اس کا پورا ہونے والا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا۔ کہ کاروانِ آخرت میں جن سوانح و حالات کا تذکرہ ہے۔ یہ بقول حفیظ جالندھری (آپ کی روح سے معذرت کے ساتھ) ؎

یہ ربع صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں[1]

---

[1] اصل مصرعہ یوں ہے یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں۔

اس دوران عالم اسلام یورپ مشرق بعید و مشرق وسطیٰ۔ الغرض عرب و عجم میں بڑے بڑے نامور علماء زعماء مشائخ سیاستدان لیڈر صحافی ادیب شاعر نقاد اور دانشور ہم سے جدا ہوئے اور مولانا نے وقتاً فوقتاً ان میں سے اکثر حضرات پر تعزیتی نوٹ اور اداریے لکھے۔ لیکن سچ بات یہ ہے کہ اگر استاذ محترم پوری یکسوئی اہتمام اور فرصت کیساتھ یہ وفیات قلمبند فرماتے تو آج یہ نقشہ کچھ اور ہوتا۔ اور بجائے اس ایک کتاب کے دو تین جلدیں اس طرح کی مرتب ہو جاتیں۔

اب بھی ایسی شخصیات پر تعزیتی مضامین اور شذرات باقی ہیں جن کے استاذ محترم کے ساتھ خصوصی مراسم تھے۔ یا وہ آپ کے محسنین، علماء مشائخ فضلاء اور دوست یا صحافی برادری کے افراد میں سے تھے۔ چنانچہ شیخ الحدیث برکۃ العصر مولانا زکریا صاحبؒ مولانا سعید احمد اکبر آبادی مولانا سید صباح الدین عبدالرحمان، مولانا امروٹیؒ، مولانا عبدالحلیم اثر، ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی، حتیٰ کہ اپنی والدہ محترمہ اور اسی طرح بیسیوں حضرات آپ کی نگارشاتِ قلم سے محروم رہے۔ فالی اللہ المشتکیٰ۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ الحق میں وفیات کیلئے کوئی خاص اہتمام نہ تھا۔ بس کیف ما اتفق کوئی حادثہ پیش آیا۔ کسی بزرگ شخصیت کا انتقال ہوا۔ تو مولانا محترم نے اس پر افراتفری کے عالم میں چند سطور سپردِ قلم کیں۔ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا۔ کہ پرچہ پریس میں ہوتا صرف اداریہ کیلئے دو ایک صفحے چھوڑ دیئے جاتے۔ اسی دوران کسی شخصیت نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اس کے مقام و مرتبہ کے لحاظ سے اس پر بشرطِ وجود مواد تفصیل کے ساتھ کچھ لکھا جاتا۔ لیکن وہاں پر محدود صفحات کی تنگ دامنی تفصیلی تذکرہ سے مانع ہو جاتی یا نقشِ آغاز کا کچھ حصہ لکھا گیا ہے۔ اس دوران پتہ چلا کہ فلاں عالم یا فلاں بزرگ یا فلاں اُستاد یا فلاں لیڈر کا انتقال ہوا ہے تو پھر اس کیلئے مواد تلاش کرنا پڑتے۔ اور اگر فرصت ہوتی تو پھر تفصیل کے ساتھ اس پر کچھ لکھا جاتا۔

الغرض یہ تمام شذرے اور نقوشِ آغاز باستثنائے چند کے اس افراتفری اور عدیم الفرصتی کے عالم میں لکھے گئے ہیں۔ اور بعض تو دورانِ سفر گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ضبطِ تحریر میں آئے ہیں۔ اس میں اگر کسی کے شایانِ شان تذکرہ نہیں یا اس کے مناسبِ حال تفصیل نہیں۔ تو اس میں قصد و ارادہ کی کوئی دخل اندازی نہیں۔ بعض مقامات پر تو ایسا بھی ہوا ہے کہ مولانا محترم نے ایک شذرہ کیساتھ لکھا "جاری ہے"۔ لیکن پھر فرصت نہ ملی۔ اور وہی مضمون ادھورا رہ گیا۔ یہ تمام اسی افراتفری کی کرشمہ سازیاں ہیں۔

حضرت الاستاذ مدظلہٗ کے اشہبِ قلم کی جولانی، فاضلانہ و ناقدانہ خامہ کی سحرکاری اور عالمانہ و ادیبانہ کلک کی روانی سے کون واقف نہیں۔ ہزاروں صفحات پر مشتمل الحق کے نقوشِ آغاز اس پر شاہد عدل ہیں۔ ان صفحات میں آپ کو ایک طرف حالاتِ حاضرہ، مسائلِ دینیہ اور وقائع ملیہ پر تبصرہ ملے گا۔ تو دوسری جانب ادبی چاشنی سے ذوق و وجدان کے کام و دہن کو بھی تسکین اور حلاوت ملے گی۔ چنانچہ آپ کے اداریات و شذرات پر مشتمل کتاب "اسلام اور عصرِ حاضر" جب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی۔ تو نہ صرف علمی دنیا میں اس کا "زبردست" خیر مقدم کیا گیا۔ بلکہ ادبی اور صحافتی طبقہ نے بھی اس کو از حد سراہا۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ مولانا کا معجز رقم قلم خشک سے خشک موضوع میں بھی ادبی طراوت اور علمی تازگی پیدا کرتا ہے۔ اس انداز سے کہ قاری کو وقت اور وقت کا احساس نہیں ہوتا۔ اور دورانِ مطالعہ قاری کے دل و دماغ پر آپ کی جولانیٔ قلم کی گرفت پوری طرح حاوی رہتی ہے۔ بس یہی آپ کے براقِ خامہ کی معراج ہے۔

سید ابوعاصم ایڈوکیٹ صاحب یادِ رفتگاں کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں۔ کہ:

"یہ مضامین یوں تو گوناگوں حیثیت سے اہم ہیں لیکن میرے نزدیک اسکی تاریخی و ادبی حیثیت زیادہ نمایاں ہے۔ یہ نہ صرف سید صاحب کے سحر نگار قلم کا نمونہ ہے۔ بلکہ ان حروف کی تہ میں مصنّف کے رفیقِ قلب، محبوبِ دل اور مفکر دماغ کے گہرے نقوش ہیں۔ وہ نقوش جو دل سے نکلتے ہیں اور دل میں بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ اوراق ادب و انشاء

کے انمول جواہر پارے تاریخ وسوانح کے قیمتی شہ پارے اور مصنف کے وسیع قلب اور وسیع دماغ کا نگارخانہ ہے۔ اس مجموعہ میں ہندو بھی ہیں مسلمان بھی۔ عیسائی بھی ہیں، یہودی بھی۔ ہندوستانی بھی ہیں اور انگریز بھی۔ مصری بھی ہیں اور ترکی بھی۔ ان میں جج بھی ہیں بیرسٹر بھی۔ عالم بھی ہیں ہنسر بھی۔ پیر بھی ہیں فقیر بھی۔ شاعر بھی ہیں اور خطیب بھی سیاستدان بھی ہیں اور ادیب بھی۔ غیر بھی ہیں عزیز بھی۔

بجنسہٖ یہی ریمارک زیرِ نظر مجموعہ کاروانِ آخرت پر بھی صادق آتا ہے۔ کیونکہ اس کتاب میں اگر ایک مشائخ وعلماء زعماء ملت وفضلاء مثلاً شاہ عبدالقادر رائے پوری شاہ عبدالغفور عباسی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، قاری محمد طیب صاحب قاسمی، علامہ شمس الحق افغانی، شاہ فیصل اور صدر ناصر جیسے اعاظم رجال ہیں۔ ان کی جدائی پر ماتم اور ان کی موت پر نوحہ ہے۔ تو دوسری طرف خروشیف جیسے دہریہ، شاستری جیسا کٹر ہندو اور سرظفراللہ جیسے ملحد و زندیق کا تذکرہ بھی ہے۔

کاروانِ آخرت نہ صرف ایک تاریخی دستاویز ہے۔ بلکہ یہ ایک ادبی فن پارہ اور صنائع وبدائع اور تلمیحات سے بھرپور مرصع بھی۔ چنانچہ اس میں اکثر شذرے بطور قند مکرر بار بار پڑھنے کے قابل ہیں۔ مثلاً حکیم الاسلام قاری محمد طیب، علامہ شمس الحق افغانی، مولانا عبدالحلیم صدر المدرسین، مولانا سلطان محمود ناظم دارالعلوم حقانیہ اور اسی طرح مولانا غلام غوث ہزاروی پر جو قلبی تاثرات مولانا محترم نے صفحہ قرطاس پر بکھیرے ہیں، اپنے ساتھ قاری کو بھی ایک نئی کیفیت سے سرشار کرتا ہے۔ خروشیف، وبھٹو، ماوزے تنگ اور شاہ ایران واسکندر مرزا کے بارے میں جس انداز سے مولانا نے قرآنی تلمیحات پیش کی ہیں وہ آپ کے کلک زرنگار کی سحرکاری ہے۔ اسی طرح کینیڈی اور لوتھر کنگ کے قتل کے پس منظر میں یورپ کے کھوکھلے پن اور مغربی تہذیب پر جس حکیمانہ طریقے سے تیشہ زنی کی ہے، گویا نوک قلم سے نشتر طرازی کا کام لے رہے ہیں۔ یہ دونوں شذرے نہ صرف کینیڈی ولوتھر کنگ کے قتل پر اظہارِ غم ہے۔ بلکہ ایک گونہ مغربی تہذیب و

تمدن پر ایک نوحہ اور اس کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔

کاروانِ آخرت کی ترتیب کچھ اس انداز سے دی گئی ہے کہ سب سے پہلے مثلاً علماء و مشائخ عظام ہیں۔ ان میں فرقِ مراتب کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ بلحاظ ماہ و سن وفات ان کو ترتیب دی گئی ہے۔ اسی طرح دوسرے عنوانات میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

بعض حضرات کے تذکروں کی مناسبت کیساتھ ان کی مجالس ان کے ساتھ ملاقات اور ان کے ملفوظات کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالغفور عباسی کیساتھ حضرت استاد محترم کی طویل مجلس اور آپ کے ملفوظات دئے گئے ہیں۔ حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ کے تعزیتی نقشِ آغاز کیساتھ مدیر الحق کا انٹرویو بعنوان قاری محمد طیب قاسمی سے ملاقات برائے افادۂ عام شاملِ اشاعت کیا گیا ہے۔ علامہ یوسف بنوریؒ کیساتھ مدیر محترم کے سفر حج کی چند یادیں کا بھی تذکرہ آیا ہے۔ اسی طرح شاہ ایران و شاہ فیصل اور ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ ان کے متعلق دیگر اداریئے بھی شاملِ اشاعت ہیں۔ تاکہ قارئین کی معلومات میں اضافہ ہو اور وہ اس پس منظر و پیش منظر سے پوری طرح لطف اندوز ہوں۔

آخر میں اس طویل خامہ فرسائی پر معذرت کیساتھ اور اس دعا کے ساتھ قارئین سے رخصت کی اجازت چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس زیرِ نظر کتاب کو ہمارے متاعِ گمگشتہ کے حصول اور عظمتِ رفتہ کی واپسی کیلئے مشعلِ راہ بنائے۔ ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ نہ آید
نسیمے از حجاز آید کہ نہ آید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ نہ آید

[illegible] مزید قحط الرجال کی متحمل نہیں ہو سکتی ہے

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

العبد الجانی!

محمد ابراہیم فانی (زروبی)
دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
۱۰ محرم الحرام ۱۴۰۹ھ

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے

بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

غالبؔ

مشائخِ عظام و عُلماءِ کرام

رحمہم اللہ تعالیٰ

یاس و حسرت کی فضا چھائی ہوئی ہے چار سُو
برقِ غم سے مضطرب احساس کا خرمن ہے آج
نالۂ اندوہ ہے ہر بانگِ مرغانِ سحر
نوحۂ فریاد ہر آہنگِ جان و تن ہے آج

فانی

امیرِ شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ [1]

یادِ ماضی ○ اُن کی باتیں [2]

رورہی ہے آج ایک ٹوٹی ہوئی مینا اسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے

رمضان المبارک ۱۳۷۸ھ کا زمانہ کتنا پُرکیف اور پُرلطف تھا، اور کتنے حسین ذجمیل تھے زندگی کے وہ چند ایام جو لاہور کے بقیۃ السلف حضرت شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحب مدظلہ کی صحبت میں گذرے، ایک طرف رمضان کا مبارک مہینہ پورے برکات سے سایہ فگن دوسری طرف صبح وشام حضرت الاستاذ مدظلہ کے درس میں قرآن مجید کے علوم ومعارف کا ذکر ومذاکرہ، روحانی فیوضات کی ہر طرف بارش، پوری فضا روحانیت میں بسی ہوئی تھی اور مجھ جیسے نامۂ سیاہ پراگندہ خاطر انسان کو بھی چین وسکون کی دولت نصیب تھی۔ زہے نصیب، ایک مردِ کامل اور شیخ کے جوار میں قیام وسکونت اور خصوصی شفقتوں کی دولت حاصل ہورہی تھی ؎

نظر میں ہے اب تک وہ رنگین زمانہ
نشیلا نشیلا سہانا سہانا

---

[1] سنِ ولادت: ۲۴ ربیع الاوّل ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۱ء

وفات: بروز ۲ شنبہ ۹ ربیع الاوّل ۱۳۸۱ھ مطابق ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء

[2] عشق ومحبت اور عقیدت و دارفتگی کی تسنیم وکوثر میں ڈوبی ہوئی یہ تحریر مولانا محترم نے الحق کے اجراء سے قبل ۱۹۶۲ء میں ہفت روزہ "پیامِ اسلام" لاہور کے "امیرِ شریعت نمبر" کے لیے زیرِ قلم کی تھی۔ اسی مناسبت سے گویا یہ مضمون زیرِ نظر کتاب "کاروانِ آخرت" کیلئے نقطۂ آغاز ہے۔ ابشکریہ "پیامِ اسلام" شریکِ اشاعت ہے (م)

۸ رمضان المبارک کو ایک دن حوض پر وضو کر رہا تھا عصر کی جماعت ہو چکی تھی اور وضو سے فارغ ہو کر پیچھے مڑا، کچھ مبہوت سا رہ گیا، حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری علیہ الرحمۃ دو تین افراد کا سہارا لیے گرتے پڑتے سامنے کھڑے ہیں۔

برٹش سامراج کو للکارتے ہوئے اس ضیغم اسلام کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ وہ مہیب اور پُر وقار وجیہہ چہرہ جس کے خد و خال میں کسی یوریپین عیسائی افسر نے حضرت عیسیٰ مسیح السلام کی جھلک دیکھی تھی اور جس نے اس وجیہاً فی الدنیا والآخرۃ پیغمبرؑ کا اسٹیچو اور تمثیل اس بارعب چہرے کو قرار دیا تھا، اب ایک منحنی لاغر ڈھانچہ تھا مگر پھر بھی اس کا رُواں رُواں اس سکون وطمانیت، جلال و وقار میں بسا ہوا معلوم ہو رہا تھا جس کا جلوہ صرف حق تعالیٰ کے مقربین میں ہوتا ہے اذا راؤ ذکر اللہ (الحدیث)[1]

حیرت گھبراہٹ کے ملے جلے جذبات لیے آگے بڑھا، مصافحہ کیا۔ چند لمحے بعد پہچانا، فرمایا سمیع ہو؟ پیار سے سینے سے لگایا۔ ابھی مولانا لاہوری مدظلہ اپنے کمرہ میں تشریف نہیں لائے تھے اور نہ ان کو شاہ جیؒ کی اطلاع ہوئی تھی۔ اس لیے میں شاہ جیؒ کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ فرمایا چٹائی پر ہی بستر بچھاؤ، لیٹ گئے۔ برادر محترم مولانا شیر علی شاہ مدرس دارالعلوم حقانیہ میرے رفیقِ سفر و قیام تھے ہم نے جلدی جلدی پاؤں اور کمر دبانا شروع کیا۔ ہم نے کہا حضرت، صحت بہت گر گئی ہے، فرمانے لگے ہاں! آخر گرنا ہے بقا صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اتنے میں مولانا لاہوری تشریف لائے۔ دونوں بزرگ جس والہانہ شوق اور محبت سے۔ قرآن السعدین کے اس دلکش نظارے کا تصور اب بھی دل و دماغ کو عجیب فرحت بخشتا ہے۔ چند لمحوں کے لیے فضا ساکت اور خاموش تھی۔ اور پھر حضرت لاہوری انہیں ساتھ ہی اپنے کمرے میں لے گئے اور میں اس خیال سے سرشار تھا کہ اس عارضی مستقر کو ایک بطلِ جلیل کے چند ساعات نزول کی سعادت حاصل ہوئی۔ مجھے خوب یاد تھا جب حضرت قدس سرہ العزیز دارالعلوم حقانیہ کے

---

[1] ان کے دیکھنے سے خدا یاد آجائے۔ (مرتب)

سالانہ جلسوں میں تشریف لایا کرتے تھے تو پشاور کی قہوہ چائے کو بہت پسند فرماتے تھے۔ میں نے یہاں بھی عشاء کے بعد قہوہ تیار کرانے کی اجازت مانگی، بخوشی قبول فرمایا مگر ذیابیطس کی وجہ سے میٹھا نہ کرنے کی ہدایت کی، قہوہ چائے تیار کر کے پیش کی، بڑے شوق سے نوش فرمائی۔ حضرت لاہوریؒ کچھ دیر بیٹھ کر دولت خانہ تشریف لے گئے۔ ہم نے حضرت شاہ جی کو حضرت لاہوری کے بے پناہ اشغال اور پھر ان کی صحت کے گرتے جانے کا ذکر کیا۔ فرمایا جی ہاں اس معمہ کو میں بھی نہیں حل کر سکا ہیں اور گھروالے کئی پہروں سوچتے ہیں کہ یہ بندہ خدا کرتا کیا کچھ ہے اور کھاتا کیا ہے۔ ہم ان کا کھانا تو لتے ہیں اور پھر ان کے شب و روز عظیم مشاغل کو دیکھتے ہیں، فرمایا ہاں ان لوگوں کا معاملہ ہی اور ہے۔ ان کی زندگی کا دم خم ان اشغال و مصروفیات سے ہے[1] یہ اگر آرام کریں (تو) پھر ان کی صحت بھی جواب دے دے۔

آپ رات گئے تک خوش طبعی، ظرافت، حکمت، عبرت و موعظت کے انمول موتی بکھیرتے رہے کبھی مجلس کشت زار زعفران بن جاتی اور کبھی حاضرین درد و یاس کی گہرائیوں میں ڈوب جاتے، اب شاہ جیؒ پورے جوبن میں تھے[2] اور برادر محترم صاحبزادہ مولانا عبید اللہ انور فرما رہے تھے کہ شاہ جیؒ پھر وہی شاہ جیؒ ہیں ضعف و اضمحلال کے سارے آثار مٹ گئے، اور چہرے میں سرخی اور نور کی وہی لہریں دوڑنے لگیں۔ حضرت لاہوریؒ کی اس قیام گاہ میں چند احباب کی اس محفل میں شاہ جیؒ نے علوم و حکم طنز و مزاح، پیار و محبت کے وہ پھول نچھاور کیے جس سے دل و دماغ میں فرحت اور انبساط اور پھر حیرت و عبرت کی کتنی موجیں مضطرب ہوئیں اور پھر دب گئیں۔ کل تک جب وہ مجلس یاد آتی تو فرحت و ابتہاج کا باعث بنتی، اور اب جب سوچتا ہوں تو سوہانِ روح ہے۔

---

[1] ولنعم ماقیل ؎ و ذکرک للمشتاق خیر شراب
و کل شراب دونہ کسراب

[2] ولنعم ماقیل ؎ میرے ذوقِ رنگ و بو کو نہ بدل سکی اسیری
پھر وہی چمن کی باتیں وہی یادِ آشیانہ
(مرتب)

اب رات ڈھل گئی تھی اور مجلس برخاست ہوئی، اس سیاہ کار کو حکم ہوا سمیع اپنا بستر یہاں اٹھا لاؤ، بستر اٹھا کر لایا اور شاہ جیؒ کی چارپائی کے ساتھ اس مسند پر بچھایا جس پر مخدوم العلماء والمسلمین حضرت مولانا لاہوری تنہائیوں میں مشغول ہوتے ہیں اور جلوتوں میں یہاں سے رشد و ہدایت کے خزانے تقسیم ہوتے ہیں۔ ابھی میری آنکھ لگی تھی کہ بڑھاپے، فالج، ذیابیطس کا شکار یہ ضعیف مجاہد دبے پاؤں اٹھا، جب میری آنکھ کھلی تو یہ مردِ مؤمن میرے سرہانے مصلّے پر بیٹھے اپنے رب کے ساتھ مصروف عجز و نیاز تھا، دنیا و مافیہا سے بے پرواہ عشقِ الٰہی اور سوزِ درون میں مستغرق "قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلوٰۃ" میں نے بستر سے اٹھنا چاہا۔ سختی سے منع کیا فرمایا سو جاؤ تمہیں سحری کیلئے بھی اٹھنا ہے اور پھر دن کو درس میں شریک ہونا ہے۔ تعمیلِ حکم لازمی تھی، لحاف میں منہ لپیٹ لیا مگر عشقِ رسولؐ اور یادِ الٰہی سے معمور سینہ پورے زور سے لہٗ اَزِیْزٌ[1] کا زیز القدر کا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ بدقسمتی ہوتی اگر اس موقعہ کو غنیمت نہ جانتا اٹھا اور دعا کے لیے درخواست پیش کر دی۔

اس رات وہ خصوصی توجہات و شفقتیں نصیب ہوئیں جو مدّتِ مدید کی تمناؤں اور آرزوؤں سے بھی شاید نصیب نہ ہوتیں۔

میں نے ایک بزرگ سے لاہور کے بارہ میں کچھ اشعار سنے تھے جن میں ایک یاد ہے اور شاہ صاحبؒ فرمانے لگے سمیع! میں تمہیں آج ایک حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں، شاید ملاقات ہو یا نہ ہو کیونکہ میں تو اب جا رہا ہوں میں نے زندگی بھر کسی کی ذات کے بارہ میں مال و متاع عزت و آبرو کی برائی کا تصور بھی نہیں کیا، الحمدللہ میں اس صفائی کا اثبات کر سکتا ہوں۔ پاؤں دبانے کے دوران میں نے کہا کہ یہ پاؤں حضرت الشیخ الامام الکبیر مولانا مدنی علیہ الرحمۃ نے دبائے تھے تو ہم یہ سعادت کیسے حاصل نہ کریں، فرمایا لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اَسْتَغْفِرُ وَاللّٰہِ ایسا نہ کہیں۔

---

[1] ہانڈی کے اُبلنے کی آواز۔ (بعض روایات میں لہٗ ازیزٌ کازیز المرجل کے الفاظ آتے ہیں) (مرتب)

پھر سوچ میں ڈوب کر انگلی دانتوں میں دبا گئے، اور آہ بھرتے ہوئے فرمایا سب چلے گئے حضرت مدنی ؒ نے بھی رحلت فرمائی صرف میں اس قافلہ کا تنہا سپاہی رہ گیا ہوں۔ اللہ بھی ایک اس کا رسول ؐ بھی ایک اور آج اس پوری دُنیا میں میں بھی تنہا ہوں۔

میں نے حضرت علامہ انور شاہ کشمیری ؒ کے بارہ میں پوچھا کہ حضرت نے اُن سے کیا حاصل کیا؟ شاہ جیؒ فرمانے لگے میں نے ان سے بہت کچھ حاصل کیا، میں نے جو کچھ پایا ان کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔ اس پورے ہندوستان میں میں نے ایسے وجیہہ حسین چہرہ وجلال وجمال کے بزرگ نہیں دیکھے۔ ایک رات دیوبند میں تقریر کرنے کا ارادہ فرمایا، بھلا علم ومعرفت کے اس مرکز میں ان کے سامنے تقریر کی کیا مجال تھی، میں نے انکار کیا تو فرمایا تمہیں تقریر کرنا پڑے گی اب حکم سے سرتابی کی مجال کہاں تھی۔ تقریر عشاء کو شروع ہو کر رات کے تین بجے تک جاری رہی حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ کرسی پر تمام رات ایک ہی ہیئت میں پاؤں پر رکھ کر بیٹھے رہے، پورے محو ہو کر سنتے رہے اور برابر آنسو جاری تھے حالانکہ تقریر بھی "وراثت" جیسے خشک موضوع پر تھی اور پھر اختتام پر بے تحاشا دُعائیں دیں ـــــ رہا اُن کا درس تو وہاں ہم جیسوں کی رسائی کہاں تھی۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحب مدظلہ (رحمہ اللہ) میرے اُستاذ ہیں بڑے معقولی اور فلسفی، لیکن جب شاہ صاحب کشمیریؒ کے درس میں شریک ہوئے تو فرمانے لگے کہ جہل کا اعتراف لے کر ان کے درس میں شرکت کرنا پڑی، تو وہاں ہم جیسوں کی کیا مجال انتہیٰ۔

دورانِ گفتگو میں انہوں نے حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کے ان کے ہاتھ بیعت کرنے اور انہیں امیر شریعت منتخب کرنے کے واقعہ کو بھی بیان فرمایا۔ نیز اس ضمن میں فرمایا کہ میں نے زندگی میں تین افراد کو نماز پڑھتے دیکھا، خشوع وخضوع میں ڈوبی ہوئی نماز تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پڑھنے والے تڑپ تڑپ کر بھیک مانگ رہے ہیں، عاجزی اور ذلت ان کے ہر ہر جز سے نمایاں ہوتی تھی۔ ایک علامہ انور شاہ علیہ الرحمۃ کی نماز،

ایک مولانا ابوالکلام آزادؒ کی نماز تیسرا نام غالباً پیر مہر علی شاہ علیہ الرحمۃ کا لیا۔

دورانِ گفتگو میں ایک دفعہ فرمایا میری مایوسی قنوطیت کی حد تک پہنچ گئی ہے اور میری قنوطیت انکشافِ حقیقت ہوا کرتی ہے کہ یہ لوگ مرنے کے بعد میت دفنانے کی اجازت بھی دیں گے یا نہیں — زندگی کے آخری ادوار کے لیے ملتان کا انتخاب — اس کے بارہ میں فرمایا کہ یہ ایک مجذوب کی دعاء کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہوا کہ تقسیم سے قبل ملتان کے ایک بہت بڑے اجتماع میں تقریر کر رہا تھا کہ اتنے میں مجمع سے ایک شخص اُٹھ کھڑا ہوا اور چیخ چیخ کر رونے لگا اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگا کہ: — "شاہ اللہ تیرا ایتھے مزار بنڑا دے" (یعنی خدا یہاں تیرا مزار بنا دے — میں نے کہا کہ رہاں بابا جی کہ تُوں مجاور نبیڑ جاوے) (یعنی کیونکہ تم اس کے مجاور بن جاؤ — بات آئی گئی مگر اس قلندر کی دعا مقبول معلوم ہوتی ہے —" عشاء کے بعد مولانا شبیر علی شاہ[1] صاحب نے کہا —

تمتع من شمیم عرار نجدٍ فما بعد العشیۃ من عرارٍ[2]

فرمایا تمہارا ساتھی بڑا خطرناک معلوم ہوتا ہے، اس نے شاعری شروع کر دی۔

پھر ایک سرد آہ کھینچی اور فرمایا: "ہاں شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک"......

ایک ساتھی نے جوتے اٹھانے کی کوشش کی، آپ نے منع کیا اور فرمایا "اگر خواہ مخواہ اٹھانا ہے تو مجھے اٹھاؤ، تب دیکھوں،" دو چھٹانک جوتے اٹھا کر خوش ہوئے کہ شاہ جی کا احترام کیا۔"

بہرحال سعادت اور مسرت سے بھرپور یہ ایک سہانی رات تھی جو زندگی میں نصیب ہوئی جس کی یادیں تا حینِ حیات دل و دماغ پر نقش رہیں گی۔[3]

---

[1] سابق مدرس دار العلوم حقانیہ حالاً مقیم مدینہ منورہ۔ (مرتب)

[2] نجد کے گلِ نرگس (گاؤ چشم) کی خوشبو سے فائدہ اٹھاؤ — کیونکہ شام کے بعد یہ پھول نہیں ہوگا۔ (م)

[3] تفصیلی سوانح کے لیے ملاحظہ ہو: — سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ : از شورش کاشمیریؒ

بہت بڑے مسلمان : از حافظ عبدالرشید ارشد۔

حیاتِ امیرِ شریعتؒ : از جانباز مرزا۔ (مرتب)

مولانا محمد بدرِ عالم میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ

مدینہ طیبہ کے ایک مکتوب سے معلوم ہوا کہ حضرت العلامہ المحدث الشیخ محمد بدرِ عالم میرٹھی[1] مہاجر مدنی کا طویل علالت کے بعد مؤرخہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۶۵ء بمطابق یکم رجب بروز جمعرات انتقال ہوا، دوسرے دن نمازِ جمعہ کے بعد مسجدِ نبوی میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور جنت البقیع میں بالکل اہلبیت کی قبور کے قریب ان کو دفنا دیا گیا۔

مولانا مرحوم نے اپنی زندگی علوم نبویہ بالخصوص علمِ حدیث کی خدمت واشاعت میں صرف کی، وہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے اجلّہ تلامذہ میں سے تھے فیض الباری شرح بخاری (چار جلدوں میں) کے ذریعہ انہوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کے امالیٔ درس کو مرتب ومحفوظ کرکے علمی دنیا پر عظیم احسان کیا۔ ان کا دوسرا عظیم کارنامہ ترجمان السنّۃ کی تالیف ہے، جس میں آپ نے نئے تقاضوں کی روشنی میں احادیث کے تراجم کی ازسرِنو ترتیب وتبویب اور اردو زبان میں نہایت محققانہ تشریح کا التزام فرمایا جس کی کئی جلدیں شائع ہوچکی ہیں مگر افسوس کہ علالت کی

---

[1] وطن میرٹھ تھا، ۱۳۱۶ھ میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ۱۳۳۶ھ میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور سے حدیث کی تکمیل کی اور اسی سال وہاں معین المدرس مقرر ہوئے۔ دوبارہ دورۂ حدیث کے لیے دیوبند تشریف لے گئے اور ۱۳۳۹ھ میں صحیح بخاری حضرت شاہ انور شاہ کشمیریؒ سے پڑھی ۱۳۴۰ھ میں دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے ۱۳۴۶ھ میں شاہ صاحبؒ کے ساتھ ڈابھیل چلے گئے ۱۳۶۲ھ میں ندوۃ المصنفین سے وابستہ ہوئے جہاں آپ نے ترجمان السنّۃ جیسی ضخیم کتاب کو مرتب کیا ــــــ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آئے، یہاں سے عشقِ نبوی کی تڑپ نے انہیں مدینہ منورہ پہنچا دیا۔ بالآخر طویل علالت کے بعد یکم رجب ۱۳۸۵ھ کو جان جانِ آفریں کے سپرد کرکے جنت البقیع میں آسودۂ خواب ہوئے۔ بیعت کا تعلق مولانا خلیل احمد انبیٹھوی اور پھر اس کے بعد مفتی عزیز الرحمٰن اور مولانا قاری محمد اسحٰق سے رہا۔ (مرتب)

وجہ سے اس کتاب کی تکمیل نہ ہوئی۔ تقسیم ہند کے بعد آپ نے مدینہ طیبہ ہجرت کی اور بالآخر سنّت کے اس ترجمان کو صاحب سنت علیہ السلام کے قدموں میں جگہ ملی۔ زندگی کے آخری کئی سال بسترِ علالت پر گذارے۔ فالج اور ضُعف کی وجہ سے خود کروٹ بھی نہ بدل سکتے تھے مگر پھر بھی آخر دم تک ارشاد و اصلاح، وعظ و تبلیغ بلکہ درس قرآن وحدیث تک کا سلسلہ جاری رہا۔ بہت بڑے عالم فاضل، مناظر، محدث اور مصنف ہونے کے علاوہ آپ سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے شیخ بھی تھے، اور زندگی کے آخری دور میں پاک و ہند اور عرب ممالک کے علاوہ افریقی ممالک کے حجاج و زائرین نے خاص طور پر آپ سے رُوحانی فیض پایا۔ حضرت کے وصال کے بعد مدینہ طیبہ میں اب صرف جامع شریعت و طریقت مولانا عبد الغفور عباسی مہاجر مدنی کی مجلس علم و عرفان ہی رہ گئی ہے۔ حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی رحؒ کے وصال سے علم و معرفت کی دنیا میں بہت بڑی خلاء محسوس کی جائے گی۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ وبرد اللہ ضریحہ و نور اللہ برھانہٗ۔ آمین

المحقق

دسمبر ۱۹۶۵ء

◎

مولینا عبد الرحمٰن صاحب کاملپوری رح

پرچہ الحق تکمیل کے آخری مراحل میں تھا کہ مجسمۂ علم و عمل، محدث وقت، فقیہ بے بدل، شیخ العصر، جامع شریعت و طریقت، بقیۃ السلف حضرت شیخ الحدیث مولانا عبد الرحمٰن صاحب[1] بہبودی ضلع کیمبلپور کی وفات کا سانحۂ فاجعہ پیش آیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت مرحوم پر ۱۰ر دسمبر ۱۹۶۵ء بروز جمعہ نماز تہجد کے دوران اچانک دائیں طرف فالج کا حملہ ہوا۔ دوسرے دن آپ کو کنٹونمنٹ ہسپتال راولپنڈی داخل کرایا گیا۔ بہترین اور ماہر ڈاکٹروں نے ممکنہ کوششیں کیں۔ ابتداء میں صحت سنبھلی پھر بگڑتی چلی گئی۔ اور حضرت کی زندگی کا ٹمٹماتا چراغ بالآخر ۱۲ر دسمبر ۱۹۶۵ء کو ۴ بج کر ۳۵ منٹ پر گل ہوگیا۔ کیا عجب کہ اس وقت عالم بالا میں یہ صدا گونجی ہو کہ: یٰایتھا النفس المطمئنۃ ٥ ارجعی الی ربك راضیۃً مرضیۃ ٥ فادخلی فی عبادی ٥ وادخلی جنتی۔

وصال کا سانحۂ ہائلہ راستہ ہی میں پیش آیا جبکہ صحت سے مایوس ہو کر آپ کو راولپنڈی

---

[1] آپ کا سلسلۂ نسب مشہور افغان قبیلہ یوسف زئی سے منسلک ہے، ۲۷ر اگست ۱۸۸۲ء کو بہبودی ضلع کیمبل پور (اٹک) میں پیدا ہوئے آبائی وطن کیمبل پور ہونے کی وجہ سے نسبت کیمبل پوری ہونی چاہیئے تھی لیکن یہ نسبت آپ کے نام کے ساتھ مناسبت نہ رکھنے کی وجہ سے کامل پوری نسبت مشہور ہوئی ۱۳۲۱ھ میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور سے سند فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد دوبارہ کتب حدیث حضرت شیخ الہند رح سے پڑھنے کیلئے ۱۳۳۳ھ میں دیوبند میں داخلہ لیا۔ وہاں سے فراغت کے بعد مظاہر العلوم میں مدرس مقرر ہوئے ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کی وجہ سے پاکستان آئے اور یہاں مختلف مدارس میں شیخ الحدیث کے منصب جلیلہ پر فائز رہے۔ ۱۶ جمادی الآخر ۱۳۸۶ھ کو آپ کا انتقال ہوا۔ تفصیل کیلئے تجلیات رحمانی ملاحظہ ہو۔ (مرتب)

سے آبائی گاؤں بہبودی لایا جارہا تھا اور اس طرح علم وعمل، تقویٰ اور تصوف کا وہ روشن ستارہ غروب ہوا جس کی روشنی اور تابناکی سے نصف صدی تک علم وعمل کے ایوان جگمگاتے رہے اور جس سے ہزاروں تشنگانِ علم سیراب ہوئے۔ کل من علیہا فان اللّٰھم اجرنا فی مصیبتنا واخلف لنا خیراً منہا ـــ ۲۲ر دسمبر بروز بدھ ۲ بجے نماز جنازہ ادا کی گئی۔ نماز جنازہ حضرت شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین صاحب مدظلہ (غورغشتی) نے پڑھائی۔ اور بے شمار علماء و صلحاء و عقیدت مندوں نے شرکت فرمائی۔ دارالعلوم حقانیہ سے حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے علاوہ کئی اساتذہ اور مقامی اراکین نے نماز جنازہ میں شرکت فرمائی۔ نماز جنازہ کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ اور دیگر علماء کرام نے مرحوم کے مناقب و کمالات پر روشنی ڈالی اور مرحوم کی ذات کو علم وعمل، شریعت و طریقت کا مجمع البحرین اور ان کی جدائی کو علمی و روحانی دنیا کے لیے عظیم خلا قرار دیا۔

مولانا مرحوم کی ذات برصغیر میں بقیۃ السلف تھی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی کے تلمیذ رشید، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری شارح ابی داؤد کے محبوب شاگرد، حضرت اقدس سیدنا شاہ عبدالرحیم رائے پوری کے منظورِ نظر اور حضرت حکیم الامت شاہ اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ کے چہیتے خلیفہ اجل ہیں۔ علم و حکمت، اخلاق و کردار، تقویٰ و طہارت کی تمام صفات موجود تھیں۔ زندگی بھر علم و حکمت ان کا زیور اور حیا و شرافت ان کا لباس رہا۔ حیاتِ مستعار درس و تدریس، اصلاح و ارشاد میں بسر ہوئی تو زندگی بھی پاکیزہ اور موت بھی رشکِ آفریں۔ طاب حیًّا و میتًا بعد وفات چہرہ پر عجیب طمانیت اور نورانیت پائی جاتی تھی اور محبوبیت و دلکشی، مسکراہٹ اور دل آویزی کا وہی عالم جو عمر بھر ان کا وصف خصوصی رہا۔

غرض خصائص و کمالات کی ایک دنیا تھی جو اس جسدِ خاکی میں سمٹ گئی تھی۔ مولانا کے یہی اوصاف مدت تک لوگوں کو رلاتے رہیں گے۔ علمی شغف و انہماک، تبحر و تعمق کے ساتھ تواضع و فروتنی، ہر لمحہ اتباعِ سنت کا جذبہ اور اصلاحِ نفس و ہدایتِ خلق کی

انتھک سعی مولانا مرحوم کی زندگی کے وہ درخشاں نقوش و خطوط ہیں جن پر حضرت مرحوم کے تلامذہ متوسلین و مریدین اور عقیدت مند چل کر سرمایۂ دارین حاصل کر سکتے ہیں۔

دارالعلوم حقانیہ اور ادارۂ الحق حضرت مرحوم کے سانحۂ ارتحال میں حضرت مرحوم کے تمام متعلقین، صاحبزادگان و دیگر اعزہ کے ساتھ اس صدمہ میں برابر کا شریک اور حضرت مرحوم کے رفع درجات کا متمنی ہے۔ خود غمزدہ راقم تو برادرِ عزیز مولانا قاری سعید الرحمٰن صاحب اور دیگر برادران کے ساتھ تعلق کی بنا پر شفیق سرپرست سے محروم ہو گیا ہے اور خود تعزیت کا مستحق ہے۔

اللہ تعالیٰ برادرِ مکرم اور دیگر برادران کو اس صدمۂ عظمیٰ کے تحمل و برداشت کی توفیق دے اور اولوالعزم والد بزرگوار کی عظیم ذمہ داریوں کے نباہنے کی ہمت دے۔ اللّٰھم اغفر لہ و نوّر ضریحہ واجزہ عنا و عن جمیع المسلمین خیرا لجزء وارفع درجتہ فی علیین وعوض المسلمین فیہ خیرًا ــــــــ

الحق

جنوری ۱۹۶۶ء

حضرت مولانا عجب نُور صاحب رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا عجب[1] نور رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ان شخصیات میں سے تھی جو اپنے پیچھے فضائل و کمالات کی ناقابلِ فراموش دُنیا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، ان کی زندگی کا ایک ایک ورق بصیرت افروز ہے۔ طالبعلمی کا زمانہ ہو یا تدریس کا ہو یا علمی و عملی کارناموں کا دور ہو اُستاذ العلماء مولانا مرحوم جو محض بلند پایہ عالم ہی نہیں بلکہ طریقت و تقویٰ کے مقام پر بھی فائز تھے ـــــ ۱۸۹۶ء میں ضلع بنوں کے مقام بوزہ خیل میں پیدا ہوئے۔ بارہ سال کی عمر میں بڑے بھائی صاحب کے ساتھ علاقہ چھچھ بغرض تعلیم تشریف لے گئے، وہاں چند سال ابتدائی تعلیم حاصل کر کے ٹونک (انڈیا) گئے۔ اور وہاں سے بھوپال جہاں آپ نے بیس برس کی عمر میں تعلیم سے فراغت حاصل کی علوم ریاضی، فلسفہ، منطق، صرف وغیرہ کی تعلیم علامہ عبدالسلام قندھاریؒ سے حاصل کی۔ بعد از فراغت اپنے وطن بنوں آئے اور ایک سال تک درس دیتے رہے ـــــ اس کے بعد مراد آباد جا کر جامعہ قاسمیہ شاہی مسجد مراد آباد میں نائب صدر کی حیثیت سے تیئس سال تک اعلیٰ علوم و فنون کی تدریس کی۔ اس عرصہ میں سینکڑوں تشنگانِ علم ان کے علوم و فیوض سے سیراب ہوئے۔

پاکستان بننے کے بعد اپنے وطن بنوں آکر مدرسہ معراج العلوم کے نام سے ایک دینی مدرسہ کی داغ بیل ڈالی جس سے سینکڑوں افراد نے فائدہ اٹھایا، اور حضرتؒ کے اخلاص اور للّٰہیت کی وجہ سے مدرسہ نے علاقہ بھر میں مرکزی حیثیت حاصل کر لی ـــــ حضرت مولانا کو کتابیں جمع کرنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ ان کی لائبریری میں دینی علوم و فنون کا بڑا مفید ذخیرہ موجود ہے

---

[1] مفکرِ اسلام مولانا مفتی محمودؒ نے فقہ کی مشہور و متداول کتاب "ہدایہ اخیرین" آپ ہی سے پڑھی تھی (مرتب)

جس کو حضرتؒ نے مدرسہ کے نام وقف ہونے کی وصیت کی۔ حضرت مولاناؒ اہم فتاویٰ کا جواب خود لکھتے۔ ذہن اور حافظہ کا یہ عالم کہ کھڑے کھڑے پیچیدہ علمی مسائل کو حل فرما دیتے۔

آپ نے اپنے پیچھے ایک بیوہ، تین لڑکیاں اور تین لڑکے چھوڑے۔ اللہ کے فضل سے تینوں فرزند اور ایک صاحبزادی حافظِ قرآن ہے ـــــ اللہ تعالےٰ آپ کی مغفرت فرمادے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین

علم و فضل کا یہ تابناک ستارہ طویل علالت کے بعد ۸ / مارچ ۱۹۶۶ء کو ٹوٹ گیا اور علاقہ بھر کے مسلمانوں کے دل دہل گئے ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

الحق
مئی ۱۹۶۶ء

مولانا شبیر محمد مہاجر مدنی رحمہ اللہ

کتنی رشک آفریں تھی وہ پاکیزہ زندگی جو پاکستان کے ایک گمنام فرزند حضرت مولانا شبیر محمد صاحب سندھی مہاجر مدنیؒ نے مدنی آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مجاورت کے شوق میں مدینہ طیبہ کے ایک گوشۂ خمولت میں بسر کی، انہوں نے اپنے وطن سندھ کو خیر باد کہا، تمام خویش و اقارب، متوسلین اور وابستگان کی ایک جماعت سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مدینہ طیبہ کی غریبانہ سکونت کو ترجیح دی[1] تقریباً ستر ۷۰ سال وہاں رہے اور بالآخر ۸۷ برس کی عمر میں ۱۶ ذی الحجہ سنہ ۱۳۸۹ھ کو اپنے محبوبِ حقیقی سے جا ملے، اور جگہ بھی اپنے محبوبِ مدنی کی آلِ اطہارؓ کے قدموں میں پائی۔

انہوں نے حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری، حضرت مولانا تھانوی، حضرت مولانا تاج محمود امروٹی (رحمہم اللہ) جیسے اکابر سے تربیت و فیض حاصل کیا۔ اس دور میں جیسا کہ معاصر علماء کا اعتراف ہے۔ بلاشبہ وہ مناسکِ حج کے امام تھے حضرت الامام مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مختصر رسالہ "زبدۃ المناسک" کو انہوں نے برسوں کی محنت اور تحقیق سے ایک ضخیم کتاب کی شکل دی۔ آخر عمر تک حج و زیارت کے مناسک و مسائل کی تحقیق اور تنقیح ان کا محبوب مشغلہ رہا۔ دو سال قبل راقم کو قیام مدینہ کے دوران ان کی زیارت کی سعادت بارہا حاصل ہوئی۔ (جبکہ وہ باب بصری میں مدرسۃ الشرعیۃ کے دار الاقامہ کے کنج عزلت میں مقیم تھے اور اس ضعف و پیرانہ سالی میں تمام حوائج ضروریہ خود انجام دیتے تھے) جب بھی ان کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا "زبدۃ المناسک" کے تعلیقات، حواشی اور حک و اضافہ میں انہیں مصروف پایا، صحن میں ایک پھٹی چٹائی پر بیٹھے اور ارد گرد انہی مسائل و احکام کے مسودات بکھرے

---

[1] ع بلاکشانِ محبت بسوئے یار روند (مرتب)

ہوتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ "اس بارہ میں میری مثال اس بڑھیا کی مانند ہے جو ذرا بھی فرصت پاتی تو چرخہ کاتنے بیٹھ جاتی"۔ بایں ہمہ علم و فضل اور زہد و مشیخت اس فنا فی اللہ کی سادگی، وارفتگی اور عجز و انکسار کا یہ عالم تھا کہ انہیں دیکھ کر یہ گمان بھی نہ ہو سکتا کہ یہ گدڑی پوش فقیر ایک برگزیدہ عارف باللہ اور اپنے وقت کے مناسکِ حج کا امام ہے۔

کیا اچھا ہو اگر ان کے اخلاف اور متوسلین میں سے کوئی صاحب اُن کی سوانح اور مقاماتِ رفیعہ کو قلمبند فرما کر یہاں کے دینی طبقوں کو "زبدۃ المناسک" کے اس جلیل القدر شارح کے احوال سے روشناس کرا سکے[1]

رضی اللہ عنہ وارضاہ ونور اللہ ضریحہٗ بانوارہ

الحق
جون ۱۹۶۶ء

---

[1] مولانا شیر محمد صاحب گھوٹکی سکھر میں ۱۳۰۰ھ میں سید محمد عارف صاحب گھر پیدا ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق آپ کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ اکثر تنہائی میں حضورؐ کی شان میں نعت پڑھتے رہتے، اپنے ایک عزیز کو فرمایا کرتے حبیب اللہ! دعا کرو کہ حضورؐ کے قدموں میں سو جاؤں مجھے اِدھر چین نہیں آتا، اکثر یہ شعر وردِ زبان رہتا ہے

فرض کردم کہ بہ یادے تو دلم خرسند است — لیکن ایں دیدۂ دیدار طلب را چہ علاج

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "بزمِ اشرف کے چراغ"۔ (مرتب)

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب آف سرگودھا

پچھلے مہینہ سرگودھا کے مشہور عالم دین حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ انتقال فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ علم کے اس دورِ زوال اور رجالِ حق کی اس قحط سالی میں علم اور دین کی دنیا معمولی نقصان کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ کجا کہ ایسے جامع صفات، حاملِ شریعت و ہادئ طریقت عالم اور حق گو، نڈر مجاہد کی موت، حضرت مرحوم نے ساری زندگی دین کی اشاعت میں صرف کی، اور اس بڑھاپے میں بھی دیگر دینی مشاغل کے علاوہ جمعیت العلماء اسلام کی اہم ذمہ داریوں کو سنبھالا۔ مرحوم کی جدائی مسلمانانِ سرگودھا اور جمعیۃ العلماء اسلام کے لیے خصوصاً اور عام مسلمانوں کے لیے عموماً ناقابلِ برداشت صدمہ ہے۔

خداوند تعالےٰ مرحوم کو درجاتِ عالیہ سے نوازے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور امتِ مرحومہ کے اس نقصان کی تلافی ہو۔

الحق

اگست ۱۹۶۶ء

مولانا عبدالخالق صاحبؒ

اس ماہ دو ممتاز اور برگزیدہ دینی شخصیتیں ہم سے جدا ہوئیں۔ (مولانا عبدالخالق و قاضی احسان احمد شجاع آبادی) اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

حضرت مولانا عبدالخالق صاحب[1] مرحوم ایک جید عالم اور اسلامی علوم وفنون کے ممتاز مدرس تھے۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند ہی میں معقول ومنقول کی ممتاز کتابیں پڑھاتے رہے۔ بعد از تقسیم پاکستان میں علومِ نبویہ اور فنونِ اسلامیہ کی درس وتدریس میں منہمک رہے۔ تعلیم وتدریس ان کا اوڑھنا بچھونا تھا تجرّد، یکسوئی، نفاستِ طبع، خوش ذوقی اور خوش لباسی، زُہد وتقویٰ ہر لحاظ سے منفرد اوصاف کے حامل تھے۔

سانحہ وصال بھی بعد از تہجد بحالتِ وظیفہ اور مراقبہ ہی پیش آیا جو ان شاء اللہ ان کی سُرخروئی اور خوشنودیٔ مولیٰ حاصل ہونے کی علامت ہے۔

الحق

دسمبر ۱۹۶۶ء

---

[1] دارالعلوم دیوبند میں سنہ ۱۳۶۳ھ تا سنہ ۱۳۶۷ھ مدرس رہ چکے تھے۔ (مرتب)

قاضی احسان احمد شجاع آبادی

ممتاز دینی شخصیت حضرت مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی[1] ۹ شعبان المعظم ۱۳۸۶ھ کو طویل علالت کے بعد ملتِ مسلمہ کو داغِ مفارقت دے گئے۔ دینی اور ملی محاذ کے اس ممتاز اور نڈر سپاہی کی زندگی بھی حق کی سربلندی اور مدافعت میں گذری مجلس احرار اسلام کی اسٹیج ہو یا تحفظِ ختمِ نبوت کا محاذ، اسلام کے اس شعلہ بیان خطیب کی قائدانہ صلاحیتیں ہر جگہ ممتاز و نمایاں شکل میں ابھریں، ان کی شعلہ فشانی سے دل پگھل جاتے، گھنٹوں حاضرین کو ہنساتے اور رُلاتے۔ نبوت و رسالت اور دینی اقدار کے خلاف جہاں بھی اشرار نے یورش برپا کی، قاضی صاحب مرحوم خرمنِ باطل پر اپنے مقتدا حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کی طرح ایک صاعقہ بن کر گرے۔

زندگی جہاد میں گذری اور وفات سے قبل سرطان جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو کر قرب اور ولایت کے مقامات پر فائز ہوئے۔ ان کی جدائی پوری ملتِ مسلمہ کے لیے ناقابلِ برداشت خسارہ ہے، اسلام کے خلاف باطل کی یلغار بہت شدید ہے اور ہمارے دینی محاذ تیزی سے خالی ہوتے جا رہے ہیں۔ فالی اللہ المشتکی۔

---

[1] قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی مجلسِ احرار کے سٹیج کی رونق، ملک و ملت کی نامور شخصیت اور شعلہ بیان و آتش نوا خطیب تھے۔ ۳ مئی ۱۹۰۶ء کو قصبہ شجاع آباد ضلع ملتان میں پیدا ہوئے تحریکِ استخلاصِ وطن اور فتنہ قادیانیت کے علاوہ تمام قومی و ملی تحریکوں میں حصہ لیا، نو برس تک قید و بند میں پابہ زنجیر رہے، ۱۹۶۰ء میں ایوبی مارشل لاء کے زیرِ عتاب آئے تھے۔ ۲۳ نومبر ۱۹۶۶ء مطابق ۹ شعبان المعظم ۱۳۸۶ھ میں انتقال فرمایا اور اپنے گاؤں شجاع آباد میں سپردِ خاک کر دیئے گئے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "قاضی احسان احمد شجاع آبادی" مؤلفہ قاری نور الحق قریشی۔ (مرتب)

بظاہر جانے والوں کی جگہ خالی ہی رہے گی۔ کچھ عرصہ بعد دیگر ممالکِ اسلامیہ کی طرح یہاں کے لوگ بھی ایسے قدسی صفات، ایثار وقربانی کے پیکر، زہد وتقویٰ کی مجسم تصویروں کو دیکھنے کے لیے ترسیں گے، مگر حالت یہ ہوگی کہ ؎

خزاں رسید وگلستاں بآں جمال نماند — سماعِ بلبلِ شوریدہ رفت وحال نماند
نشانِ لالۂ ایں باغ از کہ می پرسی — بروکہ آنچہ تو دیدی بجز خیال نماند

حضرت قاضی صاحبؒ کی جدائی میں الحق اور دارالعلوم حقانیہ پورے علمی اور دینی طبقوں کے غم میں شریک ہے، اللہ تعالیٰ انہیں بہترین درجاتِ قرب اور مقاماتِ رفیعہ سے نوازے۔ اللّٰھم ارحمھما وارزقھا عیشۃً راضیۃً واجزھم عن الاسلام والمسلمین۔

الحق

دسمبر ۱۹۶۶ء

صاحبِ سند وارشاد بزرگ

مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمہ اللہ

پچھلے ماہ ۲۵ نومبر کو ہندوستان کے مشہور صاحبِ ارشاد بزرگ شاہ وصی اللہ صاحب[1] کا وصال ہو گیا اور وہ بھی عجیب وقت میں تہجد اور نمازِ فجر کے درمیان اور سفرِ حج و زیارت پر جاتے ہوئے مظفری جہاز میں، روحِ مبارک محبوبِ حقیقی سے ملنے کی اتنی

---

[1] مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ فتحپور ز جا کے ایک گاؤں میں ۱۳۱۴ھ میں پیدا ہوئے۔ حفظِ قرآن اور ابتدائی عربی فارسی کتب پڑھنے کے بعد ۱۳۲۸ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ اور ۱۳۳۵ھ میں سندِ فراغ حاصل کی۔ ۲۲ نومبر ۱۹۶۷ء کو آپ نے حج کی غرض سے بحری سفر اختیار کیا، اور ۲۵ نومبر ۱۹۶۷ء پر ہی آپ کا انتقال ہو گیا۔ مکہ مکرمہ میں دفن کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی، مگر تقدیرِ الٰہی اور منشائے ایزدی کے تحت آپ کو سمندر کے حوالے کر دیا گیا۔ آخر عمر میں وفورِ کیفیت کے موقعہ پر مرزا غالب کا یہ شعر اکثر وردِ زبان رہتا تھا ؎

ہوئے ہم جو مر کے رُسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

مولانا ابوالحسن علی ندوی "پرانے چراغ" میں رقمطراز ہیں: ـــــ "مولانا کی روانگی سے ایک دو روز پیشتر ـــ بڑی رازداری کے ساتھ لبِ مبارک کو میرے کان کے پاس لا کر فرمایا ـ "دعا کرو کہ حاضری ہو جائے"۔ میں اس جملہ کا مطلب بالکل نہیں سمجھا۔ کہ اب حاضری میں کیا تردد رہا۔ لیکن بعد کے واقعہ نے ثابت کر دیا کہ یہ جملہ بڑا معنی خیز تھا...... سُنا ہے کہ مولانا بمبئی سے رخصت ہونے سے پہلے بار بار یہ شعر پڑھتے تھے ؎

پھول تُربت پر میری ڈالو گے کیا!
خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائے گی"

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:ـ بزمِ اشرف کے چراغ ـ مشاہیر علماءِ دیوبند اور پرانے چراغ ـــ (مرتب)

مشتاق تھی کہ اس کے گھر پہنچنے سے قبل ہی رب البیت سے جا ملی۔ یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ — قدرت نے جو غیبی انتظامات فرمائے اس کی بنا پر یقین ہے کہ تدفین مدینہ طیبہ کے جنت البقیع میں ہو چکی ہوگی۔

حضرت مولانا مرحوم حکیم الامت مولانا تھانویؒ کے خلفاء میں بلحاظ جامعیت، فیض رسانی اور افادۂ خلق کے ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے ان حالات میں ان کا وجود عافیت اور تسلی کا ایک بڑا سرچشمہ تھا۔ خداوند تعالیٰ حضرت مرحوم کو درجاتِ عالیہ عطا فرما کر ملتِ مسلمہ اور ہندوستانی مسلمانوں کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ (آمین)

الحق

رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ

امام المنقول والمعقول

علامہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمہ اللہ

صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم[1] بلیاوی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کا وصال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون. حضرت علامہ علمی تبحر، علوم نقلیہ وعقلیہ میں جامعیت، سلامتِ طبع، علمی وقار و تمکنت، زہد و تقویٰ اور بے نفسی ہر لحاظ سے بے نظیر شخصیت اور اپنے

---

[1] سنہ ۱۳۰۴ھ میں مشرقی یو۔پی کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے سنہ ۱۳۲۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور سنہ ۱۳۲۷ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ سنہ ۱۳۳۱ھ میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس مقرر ہوئے سنہ ۱۳۴۰ھ سے سنہ ۱۳۴۲ھ تک دارالعلوم مئو ضلع اعظم گڑھ اور مدرسہ امدادیہ دربھنگہ بہار میں تدریس کی سنہ ۱۳۴۴ھ میں پھر دارالعلوم دیوبند بلائے گئے سنہ ۱۳۶۲ھ میں پھر دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کی۔ اولاً جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، اس کے بعد مدرسہ عالیہ فتحپوری میں صدارتِ تدریس کی خدمات انجام دیں۔ بعدازاں بنگال میں ہاٹ ہزاری ضلع چاٹگام کے مدرسہ میں صدرالمدرسین رہے۔ بالآخر سنہ ۱۳۶۶ھ میں قاری محمد طیب صاحب قدس سرہٗ کی سفارش اور شوریٰ کی منظوری سے دارالعلوم دیوبند آ گئے۔ سنہ ۱۳۷۷ھ میں حضرت مدنیؒ کی وفات کے بعد آپ دارالعلوم کی مسند صدارت تدریس پر فائز ہوئے اور تا دمِ واپسیں اس پر متمکن رہے۔ حضرت شیخ الہندؒ سے تلمذ کے علاوہ بیعت کا شرف بھی حاصل تھا ==== تصانیف میں رسالہ مصافحہ اور رسالہ تراویح اردو میں ہیں، ایک رسالہ منطق و حکمت کے مضامین پر مشتمل انوار الحکمۃ فارسی میں ہے۔ سلم العلوم پر عربی میں حاشیہ ضیاء النجوم ہے۔ آخر میں جامع ترمذی پر حاشیہ لکھ رہے تھے جس کی تکمیل کی نوبت نہ آسکی۔ ۲۴ رمضان المبارک سنہ ۱۳۸۷ھ کی دوپہر کو ۸۴ سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا۔ (مرتب)

اسلاف اکابرِ دیوبند کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ ۱۳۳۱ھ سے تادمِ واپسیں تقریباً ۶۵ سال کی طویل مدت تک عالمِ اسلام کے دینی و علمی مرکز دارالعلوم دیوبند کو اپنے علوم اور فیوضات سے سیراب کیا۔ برِ صغیر کے اجلّہ علماء میں شاذونادر ایسے ہوں گے جو ان بالواسطہ یا براہِ راست شرفِ تلمّذ نہ رکھتے ہوں۔

دارالعلوم کو تائیدِ ایزدی سے جو عبقری شخصیتیں نصیب ہوئیں ان میں سے ایک حضرت علامہؒ کی ذات تھی منطق اور فلسفہ کلام، عقائد اور دیگر علومِ عقلیہ میں انہیں ملکۂ خاص حاصل تھا۔ اس کے ساتھ علومِ نقلیہ، حدیث و تفسیر میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز کے وصال کے بعد رونق آرائے مسندِ صدارت بنے اور دارالحدیث کی روایات کو برقرار رکھا۔

عقلیات اور فلسفہ میں اپنے وقت کے امام ہونے کے باوجود بے نفسی اور روحانی ولولہ کا یہ عالم تھا کہ کچھ عرصہ قبل اپنے ایک تلمیذ اور اپنے وقت کے صاحبِ نسبت و ارشاد بزرگ حضرت شاہ وصی اللہ الہ آبادی سے روحانی تعلق قائم کیا افسوس کہ ایک ماہ کے قلیل وقفہ میں شیخ و تلمیذ اور مرشد و مسترشد دونوں نے ملّتِ مسلمہ کو داغِ مفارقت دیا۔

علامہ مرحوم حضرت شیخ الہندؒ کے ممتاز شاگرد اور حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ العزیز کے علوم و معارف کے امین اور حامل تھے۔ اور اس وقت دارالعلوم دیوبند کے علمی وقار و عظمت کا ایک نایاب اور کمیاب سہارا علم و عمل کی عبقری شخصیتیں اٹھتی جا رہی ہیں ان کی جگہ پُر نہیں ہو رہی۔ احادیث میں اسے قربِ قیامت کی نشانی قرار دیا گیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند اس تشویشناک اور المناک صورتِ حال کا خاص طور سے شکار رہا ہے جو پوری ایک صدی تک ایک سے ایک نابغہ روزگار شخصیتوں کا مرکز بنا رہا اور ہر جانے والے کی مسندِ فیض و تدریس دوسرے اہل افراد سنبھالتے رہے، مگر پورے برِ صغیر اور عالمِ اسلام پر علم و تقویٰ کے لحاظ سے جو اضمحلال اور جمود چھا رہا ہے اس سے دارالعلوم دیوبند کا متاثر ہونا بھی انوکھی بات نہیں۔ تاہم اس نگارخانہ علم و دین میں علم و حکمت کے

دو تابناک ستارے جُنیدِ وقت مولانا فخر الدین مراد آبادی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اور حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب مدظلہ کی شکل میں فروزاں ہیں ۔۔۔ ہماری دُعا ہے کہ ان کی چمک دمک اور ضیا پاشیوں سے یہ چمنستانِ دین و علم تا دیر روشن اور آباد رہے۔ اور خداوند کریم آئندہ بھی تا قیامت اپنے غیبی لطائف سے دارالعلوم کو ایسے افراد عطا فرماتا رہے جن کی ذات سے علم کی رونق، تقویٰ کی زینت اور دین و حکمت کی محفلیں قائم رہیں۔

الحق
شوال ۱۳۸۷ھ

◎

مولانا محمد اکرم صاحبؒ

مشرقی پاکستان کے مولانا محمد اکرم خان وفات پا گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔
مرحوم ان بزرگ اور ممتاز اصحاب فکر و ارباب قلم میں سے تھے جن کا مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ اور تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ تھا۔ قوم و ملت کے لیے مصائب جھیلے اور مادی زندگی بے لوث خدمات میں خرچ کی۔ آج جو قوم آزادی کے نشہ میں مدہوش ہو کر اپنا تن من دھن سب کچھ کھو چکی ہے، اپنے آپ کو، اپنے دین و ثقافت کو، اپنے تہذیب و تمدن کو فراموش کر چکی ہے، اپنی عزت نفس اور خودی کا سودا سر راہ یورپ کے طوائف خانہ میں لگا چکی ہے اس قوم کی اکثریت اگر اپنے محسنوں کو بھول چکی ہو جس قوم کے نوجوانوں کو اپنے بے لوث اور مخلص خادموں کے احوال و سوانح تک کا علم نہ ہو تو اس پر تعجب کیوں ہو سچے خادموں کو قربانیوں کا صلہ زندگی میں نہیں ملتا۔ بناوٹ اور تصنع کے دور میں زندگی کی سٹیج پر بھی ایکٹروں اور نقالوں کا قبضہ ہو جاتا ہے، حقیقت پردوں میں مستور ہو جاتی ہے شیر شکار کرتا ہے، گیدڑ اور لومڑیاں اس کا مزا اڑاتی ہیں مگر یہ صلہ کیا کم ہے کہ زندگی اصول اور مقاصد کی راہ میں قربان کر دی جائے۔
جب مقاصد پاکیزہ اور بلند ہوں، نیت خالص اور عزائم بے لوث ہوں تو ایسے لوگ کبھی نہیں مرتے، آخرت کی ابدی زندگی ان کا استقبال کرتی ہے۔ وہاں حقیقت ہی حقیقت ہے، وہاں مصنوعی ایکٹروں اور نقالوں کے لیے جگہ نہیں، وہ تو ان لوگوں کی اقلیم سلطنت و فرمانروائی ہے جنہوں نے حق و صداقت کا بول بالا کیا اور جن کا وجود ابدی حقیقتوں کا منادی اور علمبردار رہا۔

الحق ——— ستمبر ۱۹۶۸ء

★★

مولانا مُبارک علی رحمہ اللہ

نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند

پچھلے پرچہ میں دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم مولانا مبارک علی صاحب[1] مرحوم کے وصال کی اطلاع دی جا چکی ہے۔ موصوف کا وجود دیوبند کی روایات اور صفات کا حسین پیکر تھا۔ بے مثل عالم، وسیع النظر فقیہ اور مفتی، جید مدرس اور اس کے ساتھ ہی عابد مرتاض مُتقی اور فرشتہ سیرت انسان تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ سے تلمذ رہا اور مدتوں حاضر باش خادم بھی رہے اور ان کی سیاسی تحریک "ریشمی رومال" میں بھی نمایاں کام کیا۔ ۱۳۵۰ھ میں دارالعلوم کے نائب مہتمم ہوئے اور وصال تک بے لوث اور بے مثال خدمت انجام دی۔ تاریخ دارالعلوم میں ان کا

---

[1] اکابر علماء میں سے تھے، نصف صدی تک دارالعلوم دیوبند میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ۱۳۵۰ھ تا ۱۳۸۸ھ دارالعلوم کے نائب مہتمم رہے۔ ذیل میں ان کا وہ گرامی نامہ جو انہوں نے حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ کے نام ارسال فرمایا تھا، پیش کیا جاتا ہے۔ اس مکتوب میں حضرت مرحوم نے حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے وصال پر اپنے تاثرات غم ظاہر کیے ہیں۔ آپکے بقیہ مکاتیب الحق جون ۱۹۷۰ء میں ملاحظہ ہوں۔ (مرتب)

برادرم محترم و مکرم حضرت مولانا عبدالحق صاحب سلمکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ــــــ گرامی نامہ شرفِ صدور لاکر موجب طمانیت ہوا۔ حضرت مولانا مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے سانحۂ ارتحال پر جن تاثرات کا آپ نے ذکر کیا وہ بالکل بجا اور درست ہیں۔ افسوس صد افسوس! ایسی برگزیدہ ہستی جو سراپا علم و عمل و زہد و تقویٰ اور اخلاقِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کا نمونہ، یکتائے زمانہ اور اپنی نظیر آپ تھی، ایسے دور میں یکا یک ہم سے جدا ہو گئی، جو پُرفتن اور بادِ سموم کے تیز و تند جھونکوں سے پر از تلاطم ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ــــ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے، صبر و سکون عطا فرماوے، اور حضرت مولانا مدنی قدس سرہٗ

(باقی حاشیہ ص ۴۹ پر)

مقام بہت اونچا رہے گا۔ راقم کو سنہ میں پہلی بار کمسنی کے زمانہ میں ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا جب کہ وہ اکوڑہ خٹک تشریف لائے اور دو چار دن یہاں قیام رہا۔ گو آپ بہت کم گو اور خاموش طبع انسان تھے مگر اتنا یاد ہے کہ اس دوران آپ نے دارالعلوم حقانیہ کے طلباء سے بھی خطاب فرمایا۔ اس کے بعد ۱۹۶۰ء میں جبکہ ۸، ۱۰ دن دارالعلوم دیوبند رہنے کی سعادت نصیب ہوئی تو حضرتؒ کی صحبت اور خصوصی شفقت پائی۔

حضرت شیخ الحدیث دارالعلوم حقانیہ سے آن کے زمانہ قیام دیوبند سے لے کر اب تک نہایت مخلصانہ مشفقانہ تعلق رہا۔ ان تعلّقات اور روابط کی بناء پر حضرتؒ کا وصال ایک گونہ ذاتی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸) کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مراتب عطاء فرما دے۔ آمین)

محترما! یہ حادثۂ کبریٰ ہر حالت سے مصیبتِ عظمیٰ ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی دینی و دنیوی ہر قسم کے حوادث اور وقائع میں نہ صرف رائے صائب اور نیک مشوروں سے بلکہ مخلصانہ اور ہمدردانہ عملی جدوجہد سے جس درجہ باعثِ تقویت اور موجب طمانیت بنی ہوئی تھی وہ آج ہم میں نہیں ہے۔ فالی اللہ المشتکی وعلیہ التکلان وھو حسبی ونعم الوکیل یرضی مولیٰ الہم اولیٰ۔ یہ وقت آنا تھا، آکر رہا۔ اندریں صورت بجز صبر و شکر اور چارۂ کار کیا ہے۔ مجھے معلوم ہے آں محترم کو بھی اس ذاتِ گرامی سے خصوصی تعلق اور قلبی شغف تھا، مجھے خوب اندازہ ہے، آپ بھی اسی طرح تڑپتے ہوں گے۔ مگر محترما! اندریں حالات جس پر اپنا عمل ہے وہی آپ سے عرض کروں گا کہ صبر و شکر سے کام لیجئے اور ایصالِ ثواب اور ترقیٔ درجات کے لیے دعا فرماتے رہیے اور اجر حاصل کیجئے۔

زیادہ کیا عرض کروں، تاخیرِ عریضہ کا باعث منجملہ دیگر وقتیہ امور کے اپنا ضعف اور سستی بھی اس کا سبب ہے۔ میں ایک عرصہ تک سخت علیل اور صاحبِ فراش رہا۔ اس موقعہ پر ایک اور بات یاد آگئی۔ ایک طرف حضرت مرحوم و مغفور بیمار تھے، دوسری طرف اس احقر کی طبیعت خراب تھی۔ اہل خانہ کے ذریعہ طرفین کے حالات معلوم ہوتے رہے۔ جب طبیعت سنبھلتی حضرت کے پاس آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا۔ کبھی حضرت خود یاد فرماتے کبھی یہ احقر خود حاضر ہوتا۔ دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور مزاحی جملوں سے نوازتے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ حضرتؒ کی طبیعت سنبھلی اور باہر مردانہ میں آنے جانے لگے مگر عصر کے بعد مکان پر

(باقی حاشیہ صفحہ ۵۰ پر)

صدمہ ہے مگر پورے علمی حلقہ بالخصوص دارالعلوم دیوبند کے لیے تو اس لحاظ سے صدمے کا احساس شدید ہو جاتا ہے کہ حجتہ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رح کی بچھائی ہوئی بساطِ علم و فضل بڑی تیزی سے لپٹی جا رہی ہے اور جانے والوں کی جگہ پُر نہیں ہو رہی ہے حجتہ الاسلام رح کی مسندِ علم کو حضرت شیخ الہند رح نے آباد رکھا حضرت شیخ الہند رح کی مجلسِ علم و فضل اور مسندِ جہاد و عزیمت کو حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رح نے آراستہ رکھا۔ داعیٔ کبیر مولانا محمد الیاس رح کے مقامِ دعوت و ارشاد کو امیر التبلیغ مولانا یوسف رح نے سنبھال دیا۔ شبلی رح کی مسندِ کمال پر سید سلیمان ندوی رح جلوہ افروز ہوئے۔ تھانہ بھون کی خانقاہِ امدادیہ کے فیض کو حکیم الامت

(بقیہ حاشیہ ص ۴۹) عام اجتماع ہونے کے وقت اور بھی زیادہ پُر لطف اور پُر کیف صحبتیں رہیں مگر پھر یکایک طبیعت بگڑی اور تقریباً ایک ہفتہ حضرت مرحوم باہر تشریف نہیں لا سکے۔ اُس حالت میں بھی ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آخری ملاقات پیر کے دن ہوئی، اس کے بعد باوجود کوشش کے ملاقات نہ ہو سکی۔ یہی مقدر تھا۔ پنجشنبہ کے روز ظہر کے وقت بلا وہم و گمان یکایک حضرت مدنی رح نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا دارِ فانی سے رخصت ہو کر محبوبِ حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اس حادثہ کے مسموع ہوتے ہی کیا حالات پیش آئے، لکھتا، مگر اپنا مانع ہے۔ اخبارات میں برابر حالات شائع ہو رہے ہیں۔ آپ کے ملاحظہ میں یہ بھی آتے ہوں گے۔ مجھے نزلہ کا عارضہ ہے، موسم سرما میں اس کا زیادہ اثر رہتا ہے۔ بفضلہٖ تعالیٰ چند دنوں سے طبیعت سنبھلی ہوئی ہے، مگر ضعف زیادہ ہے۔ علاج اور پرہیز کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ دعا فرمایئے اللہ تعالیٰ صحتِ کامل اور جسمانی و روحانی قوت عطا فرماوے، اعمالِ خیر کی توفیق بخشے اور جب وقت آئے اپنے فضل و کرم حسنِ خاتمہ نصیب فرمائے۔ آمین

امید ہے مزاج مع الخیر ہوں گے۔

فقط والسلام

احقر مبارک علی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند

۱۹ رجمادی الثانی ۱۳۷۷ھ

حضرت تھانوی رح نے کمال تک پہنچایا۔ خانقاہِ رائے پور کی رونق مولانا عبدالقادر رح سے قائم رہی۔ اور ذرا پیچھے کی طرف نگاہ دوڑائیں تو حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ رح کا دور نظر آئے گا۔ جو علمی عروج کا زمانہ تھا، وہ جب گئے تو اپنے پیچھے شاہ عبدالعزیز رح، شاہ عبدالقادر رح، شاہ اسمٰعیل شہید رح اور سید احمد شہید رح جیسے روحانی اخلافِ رشید چھوڑ کر گئے۔ مگر اب تو یہ چیز عنقاء نظر آتی ہے۔ علم، علماء کے اٹھ جانے سے اٹھتا جا رہا ہے۔ علمی اضمحلال اور قحط الرجال کا یہی عالم رہا تو معلوم نہیں اگلی نسلوں کا کیا بنے گا! مگر حفاظتِ دین کی غیبی دستگیری کا جو سلسلہ اب تک چلا آ رہا ہے۔ حوصلے اور امید باندھنے کے لیے یہی ایک چیز رہ گئی ہے۔

الحق

اکتوبر ۱۹۶۸ء

◎

مولانا حمید الدین صاحب رحمہ اللہ

دینی و علمی حلقوں اور خاص طور سے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ کے متعلقین نے یہ افسوسناک اطلاع نہایت رنج و غم سے سنی کہ مجلس شوریٰ[1] دارالعلوم دیوبند میں شمولیت کیلئے آتے ہوئے مظفر نگر میں حضرت مولانا حمید الدین صاحب شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ کلکتہ اور حضرت مولانا اسعد مدنی کے فرزند گرامی قدر صاحبزادہ محمد صاحب کا کار کے حادثہ میں انتقال ہوگیا۔ اس حادثہ میں مولانا اسعد مدنی کی اہلیہ اور خوشدامن بھی زخمی ہوئیں۔

مولانا حمید الدین صاحب مرحوم جید عالم، ممتاز ادیب و انشاء پرداز اور حضرت مولانا اسعد مدنی (صاحبزادہ حضرت شیخ الاسلامؒ) کے خسر تھے۔ مرحومین کو قبرستان قاسمی میں حضرۃ مدنیؒ کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا —— نہ صرف دارالعلوم حقانیہ اور ادارہ الحق بلکہ پورے برصغیر کے علمی و دینی حلقے حضرت شیخ الاسلامؒ کے قابلِ فخر فرزند مولانا اسعد مدنی کے ساتھ اس غم میں شریک ہیں۔ اس ملک (پاکستان) میں بھی حضرت شیخ الاسلامؒ کی کفش برداری کو ذریعۂ نجات سمجھنے والوں کی کمی نہیں اور بجا طور پر مدنی خاندان کا ہر دکھ درد انہیں اپنا ہی غم محسوس ہوتا ہے۔

حق تعالیٰ مرحومین کو درجاتِ عالیہ اور صاحبزادہ محترم برادر مکرم مولانا محمد اسعد مدنی اور دیگر برادران کو اس مصیبتِ عظمیٰ میں صبر و استقامت عطا فرمائے اور اُمتِ محمدیہ کی خدماتِ جلیلہ کی زیادہ سے زیادہ توفیق دے۔

الحق —— دسمبر ۱۹۶۸ء

---

[1] آپ ۱۳۸۲ھ میں دارالعلوم دیوبند کے رکنِ شوریٰ منتخب ہوئے تھے۔

شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین غورغشتوی

سرحد کا شاہ ولی اللہ

رونق آرائے مسند درسِ حدیث ، سرخیلِ علماءِ حق ، پیکرِ سنت ، ترجمانِ حدیث شیخ الحدیث بقیۃ السلف مولانا نصیر الدین صاحب غورغشتوی قدس اللہ سرہٗ العزیز تقریباً ۹۳ برس کی عمر میں ملّتِ مسلمہ کو داغِ جدائی دے گئے ۔ ۴ ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ مطابق ۲۳ جنوری ۱۹۶۹ء کی صبح پونے سات بجے جبکہ آفتاب عالمتاب طلوع ہو رہا تھا ، واہ کینٹ کے فوجی ہسپتال میں علمی اور معنوی دنیا کا یہ روشن آفتاب غروب ہو گیا[1] دوسرے دن جمعہ کو جب کہ عالمِ رنگ و بو کا آفتاب مغربی افق پر ڈھلنے والا تھا کہ ملک کے طول و عرض سے پروانہ وار جمع ہونے والے حضرت کے لاتعداد معتقدین اور تلامذہ نے علم و عمل ، زہد و اخلاص ، فقر و قناعت ، تقویٰ و للّٰہیّت کا یہ معنوی آفتاب آغوشِ لحد کے سپرد کر دیا ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ؎

---

[1] وفات سے کچھ قبل ۱۹۶۸ء میں حسبِ معمول دارالعلوم کے جلسۂ دستار بندی میں تشریف لائے تھے ۔ زائرین کا ہجوم حضرت کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے بیتاب تھا ۔ دارالعلوم سے دو فرلانگ کے فاصلہ پر موٹر سے اُترے ایک طالب علم نے آپ کو کاندھوں پر اٹھایا کہ زائرین کو دیکھنے میں سہولت ہو ۔ صدر المدرسین دارالعلوم حقانیہ مولانا عبدالحلیم نور اللہ مرقدہ کی اقامت گاہ میں آپ قیام پذیر تھے ۔ جیسے ہی سریر آرائے مسند ہوئے حضرۃ شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہٗ اور حضرۃ مولانا مرحوم نے ان کے پاؤں دبانے شروع کئے ۔ محفل قدسیاں کا ایک عجیب منظر تھا ۔ (مرتب)

نمازِ جنازہ حضرت کے بڑے صاحبزادے نے پڑھائی، اور اندازہ لگانے والوں کے خیال میں شرکاءِ جنازہ کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز تھی جس نے العزۃ للّٰہ والرسولہ وللمومنین کا سماں باندھ دیا۔

روحِ مبارک شوقِ لقاء میں عرصہ سے مضطرب اور بے قرار تھی اگر کسی نے درازیٔ عمر کی دعا کی تو فرمایا کہ اب تو عافیت اور سلامتیٔ ایمان کی دعا چاہیئے۔ پچھلے دو چار سالوں سے حج و زیارت کے پردۂ مجاز میں تسکین ڈھونڈھ رہے تھے۔ اس سال قرعۂ فال سب سے پہلے اسی "دیوانۂ عشقِ حقیقی" کے نام نکلا، رختِ سفر باندھنے کی تیاری ہونے لگی، جس ذات قدسی صفات علیہ السلام کے اقوال و فرمودات کی اشاعت میں عمر بھر مصروف رہے، اب جب اس کی چوکھٹ کی جبہ سائی کا مژدہ آپہنچا تو فرحت و اشتیاق کا کیا عالم رہا ہو گا۔؟ ملنے والے دعا لینے اور الوداع کہنے حاضر ہونے لگے۔

ادھر سمیع و بصیر محبوبِ حقیقی ربِ کریم اپنے ایک عاشقِ زار بندہ کے سوز و جذب اور شوق و ولولہ سے بخوبی آگاہ تھا، اپنے بندہ کی ناتوانی اور جسمانی ضعف اور کمزوری اس کی نگاہ میں تھی، اس کے علم میں تھا کہ پیمانۂ شوق اب لبریز ہو چکا ہے۔ اور خاکی قالب کو لافانی احساسات اور ولولوں کا مزید تحمل نہیں کہ یکایک آغوشِ رحمت وا ہوئی اور حج و زیارت میں مستور "مجازی وصال" کی نعمت "ابدی اور حقیقی وصال" کی دولت سے بدل گئی اور بیت اللہ سے پہلے رب البیت تک پہنچ گئے۔ یاایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربك راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔

حضرت کی زندگی اس قحط الرجال میں ایک مثالی زندگی تھی، علم کے ساتھ تواضع، سادگی، خلوص، استغناء، دردِ دین اور احیاءِ سنت کا جذبۂ بیکراں، اس زندگی کے نمایاں خد و خال ہیں۔ اس دور کے بعد شاید ہی ایسے بے لوث اور سراپا اخلاص و عمل بزرگ مل سکیں گے۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک ایک بوسیدہ مسجد کی چھت اور کبھی درختوں کی چھاؤں میں زمین کے فرش پہ بیٹھ کر تشنگانِ حدیثِ رسول کو علومِ نبویہ سے سیراب کرتے رہے۔ تلامذہ کا حلقہ پاک و ہند کے علاوہ افغانستان بلکہ پورے وسط ایشیا

تک وسیع ہے۔ تعداد آٹھ دس ہزار کے لگ بھگ تو ضرور ہوگی، پھر یہ ساری خدمت خالص رضائے مولیٰ کی خاطر، نہ عہدہ نہ منصب نہ تنخواہ نہ کوئی وظیفہ اور نہ کوئی ادارہ بلکہ وہ خود اپنی ذات سے ایک انجمن تھے، بڑے بڑے اداروں کے منصب تدریس و صدارت کی پیشکش بھی اس مجسمۂ توکل کی آبروئے فقر و قناعت پر اثر انداز نہ ہو سکی، پوری زندگی قرونِ اولیٰ کے محدثین کا نمونہ تھی۔ اور جس طرح ہندوستان کی سرزمین میں شاہ ولی اللہ مرحوم نے حدیثِ نبوی کی قندیل روشن کی اسی طرح شمال مغربی سرحدی علاقے اور وسطِ ایشیا کے بلاد میں، جو علمی زوال و انحطاط کا شکار ہو چکے تھے۔ حدیث کا غلغلہ حضرت مرحوم کی ذات سے ہوا۔ پھر صرف مسندِ تدریس کی رونق قائم نہیں رکھی، بلکہ میدانِ تصنیف میں ایک ممتاز شارح اور مصنفِ حدیث ہونے کا ثبوت مشکوٰۃ شریف کی فاضلانہ شرح کی شکل میں دیا۔ ارشاد و تزکیۂ باطن میں ایک نامور شیخ کا مقام پایا۔ اس کے ساتھ ساتھ دینِ حق پر جب بھی کوئی نازک وقت آیا اور دین کی متاعِ مقدس پر اہلِ زیغ و الحاد نے دست اندازی کرنا چاہی یا دینی اقدار میں رخنہ ڈالنا چاہا تو حمیتِ دینی سے سرشار بڑھاپے اور بیماری کے احساس سے بے نیاز شیخ اعلاءِ حق کے لئے میدان میں کود پڑے۔ تحریکِ ختمِ نبوت کی تاریخ اس عمر رسیدہ محدث کی قربانی اور جذبۂ جہاد کو فراموش نہ کر سکے گی۔ ولی اللّٰہی خانوادہ اور قاسمیؒ و محمودیؒ قافلہ، علم و عمل اور دعوت و عزیمت کے اس فرزندِ جلیل پر بجا طور پر نازاں رہے گا۔

چودھویں صدی ختم ہو رہی ہے، اکابر و اسلاف کا سلسلۃ الذہب (سنہری زنجیر) ٹوٹتا جا رہا ہے۔ دو ایک کڑیاں رہ گئی تھیں وہ بھی بکھرنے لگیں۔ مگر فتنوں کا زور بڑھ رہا ہے۔ آثارِ قیامت نمایاں ہیں اگر آنے والی نسلوں کا رشتہ اپنے زریں ماضی سے بالکل کٹ گیا، اور بیچ کی کوئی کڑی باقی نہ رہی تو یہ یقیناً قیامت کے آثار میں نمایاں اور واضح نشانی ہوگی، یہ بزرگ، آئے اور زندگی کے روشن مینار فتنوں کے اندھیروں میں جلا کر چلے گئے۔ اب ان ہی خطوط پر چلنا ہے۔ ہم ایک ایسے دور میں داخل ہونے والے ہیں جس میں زہد و اخلاص علم و عمل، توکل و قناعت اتباعِ سنت اور دین کی دردمندی کی ایسی بے لوث اور جامع

مثالیں عنقا ہوں گی، علم و عمل جیسی روحانی چیزوں کو مادیت کے حقیر ترازو سے تولا جائے گا، اگر دین کے حاملین اور علم نبوت کے نام لیواؤں نے اپنے ان اسلاف کی زندگی سے سبق نہ سیکھا تو خود غرضی، لالچ خوف اور طمع حب جاہ و مال میں ڈوبی ہوئی عالمانہ زندگی سے بھٹکنے والوں کی رہنمائی نہ ہو سکے گی یہ علم کا زوال ہوگا جسے قیام قیامت کا پیش خیمہ کہا گیا ہے۔

وہ دیکھئے ملاءِ اعلیٰ میں امام ابوحنیفہؒ اور احمد بن حنبلؒ کی محفل کہ شیخ احمد سرہندیؒ ولی اللہ الدہلویؒ، محمد قاسم نانوتویؒ، شیخ الہند محمود الحسنؒ اور حسین احمد مدنیؒ، احمد علی لاہوریؒ کے جلو میں نصیر الدین غورغشتویؒ بھی پہنچ گئے ہیں، اور سب مل کر ہمیں دعوت عمل دے رہے ہیں کہ وراثت نبوت کے دعویدارو اور تاجدار ختم نبوت کے نام لیواؤ اگر تم ہماری جیسی ابدی زندگی اور درجات قرب خداوندی چاہتے ہو تو اپنی زندگی کی ہر متاع کو حفاظت دین پر نثار کردو، اپنی ہر حرکت و عمل اور ہر بات میں رحمۃ للعالمینؐ کی زندگی کا مجسم نمونہ بن جاؤ کہ وقت نازک سے نازک تر ہوتا جا رہا ہے۔ اور ذمہ داری تمہاری سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی ہے۔

ان قدوسیوں کا پیغام بس یہی ہے کہ تمہارا جینا اور مرنا صرف اور صرف اسلام کے لئے ہونا چاہئے، تم اگر سوچو تو اسی معیار پر، بولو تو اسی پیمانے سے اور کرو تو وہی جو ہم نے کر دکھایا۔ یہی فوز و فلاح ہے، یہی سرخروئی اور یہی تمہارے منصب کا تقاضا۔

کاش! شیخ الحدیث غورغشتویؒ کے تازہ داغ مفارقت سے ہمارے زخم ہرے ہو جائیں۔ جذبات تحفظ دین اور مدافعت اسلام کے احساسات تیز تر ہوں تو جانے والے کی بارگاہ میں یہی ہمارا بہترین خراج تحسین ہوگا۔ اللھم اعظم اجرہٗ ولا تحرمنا بعدہٗ وارزقہ الجنّۃ۔

الحق :- ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ

حضرۃ مولانا شاہ عبدالغفور صاحب عباسی مجدّدی

صد افسوس کہ سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے مایہ ناز بزرگ اور روحانی رہنما حضرۃ مولانا شاہ عبدالغفور صاحب عباسی مجدّدی مہاجر مدینہ طیبہ بھی امت کو داغ مفارقت دے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ سانحۂ وفات یکم ربیع الاوّل ۱۳۸۹ھ (سعودی عرب کے مطابق) ۱۷ رمئی ۱۹۶۹ء بروز ہفتہ عشاء کے بعد پیش آیا جنازہ مسجد نبوی میں نماز فجر کے بعد ہُوا اور طلوع آفتاب کے ساتھ رشد و ہدایت کا یہ آفتاب قدسیوں کی خوابگاہ بقیع الغرقد میں روپوش ہوگیا جس ذات والاصفاتؐ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی اتباع اور نقش قدم پر ساری زندگی نچھاور کردی تھی موت کے بعد اس کے قدموں میں ہی جگہ پائی۔ طاب حیًا و میتًا رحمۃ اللہ ورضی عنہ وارضاہ ذیابیطس، ضعف اعصاب وغیرہ تکالیف عرصہ سے لاحق تھے۔ اسی ضعف و علالت میں اس سال بھی ادائیگی حج کے لئے تشریف لے گئے۔ عرفات جاتے ہوئے منیٰ میں طبیعت نڈھال ہوئی، بیہوش ہوگئے۔ اور اسی حالت میں وقوف عرفہ کا فریضہ ادا ہُوا، عرفات سے واپسی پر راتوں رات مدینہ طیبہ پہنچا دئے گئے۔ بقیہ مناسک حج قربانی وغیرہ کے لئے اوروں کو مامور فرمایا۔ پچھلے ۳۰، ۳۵ برس سے حج کرتے چلے آئے تھے مگر اس حج پر عجیب مسرّت اور ناز تھا، بڑے مزے لے لیکر اس کا ذکر کرتے اور ایسا محسوس ہوتا کہ شاید یہی حج ان کا حجۃ الوداع ہے۔

۱۱ رمارچ کو احقر مدینہ طیبہ پہنچا، دوسرے دن حاضری دی، ضعف و نقاہت کافی تھی مگر طبیعت سنبھلنے لگی تھی۔ ۲۷ رمارچ تک وہاں احقر کا قیام رہا، اس دوران وعظ و ارشاد کی مجالس زائرین اور مہمانوں کی خاطرداری اور پُرتکلف مہمان نوازی

کا وہی سلسلہ جاری رہا جو عمر بھر ان کا شیوہ تھا، جسم اندر ہی اندر جان لیوا بیماریوں سے گھل رہا تھا مگر چہرہ پر وہی بشاشت اور طمانیت، ذکر و فکر میں وہی ذوق و شوق اور استغراق اور وعظ و ارشاد میں وہی سوز و گداز۔

۲۳ اپریل کو مخلصین کے اصرار پر بغرض علاج و آرام کراچی لائے گئے مگر مرض میں افاقہ کی بجائے اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اس دوران ذرا بھی ہوش آتا تو طبیعت فراق مدینہ میں بے چین اور مضطرب محسوس ہوتی اور جلد از جلد واپس پہنچانے کا تقاضا ہوتا[۱] ــــ ڈاکٹروں کی تشخیص تھی کہ فم معدہ پر کینسر ہے اور اس حالت میں حضرت کے زندہ رہنے پر حیرت، ظاہر کرتے۔ کراچی ہفتہ عشرہ قیام کے بعد مدینہ طیبہ پہنچا دئے گئے اور مشاہدہ کرنے والوں کا بیان ہے کہ سرزمین حجاز پر قدم رکھتے ہی حضرت کی بے چینی مسرت اور سکون سے بدل گئی، مدینہ طیبہ پہنچنے پر حق تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اسی دن کیلئے تو مدتوں آستانۂ یار[۲] پر ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے۔ بالآخر ہفتہ کی شب[۳] بعد از عشاء وصال محبوب میں تڑپنے اور سلگنے والا یہ روشن چراغ وصال حقیقی کی دولت سے سرفراز ہو کر خاموش ہو گیا ؎

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

حضرت مولانا مرحوم غالباً ستر پچھتر برس[۴] قبل صوبہ سرحد کے شمال مشرق کے یاغستانی علاقہ چغرزئی کے موضع جدبی میں پیدا ہوئے، قدرت کی فیاضی دیکھئے کہ علمی اور روحانی چرچوں سے بہت دور ایک دور افتادہ علاقہ اور حصول علم کی آسائشوں سے محروم

۱؎ جی میں آتا ہے کہ نکلے دم تمہارے سامنے — تم ہمارے سامنے اور ہم تمہارے سامنے

۲؎ بقول جگر مراد آبادی مرحوم ؎

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر — عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

۳؎ سن ولادت ۱۸۹۴ء (مرتب)

ایک کوہستانی بستی کے ایک معصوم بچے کو آگے چل کر اپنے وقت کا شیخ مدینہ بننا تھا۔ اور
جن کے فیض سے نہ صرف عجم بلکہ عرب اور افریقہ کے بیشمار لوگ فیضیاب ہونے تھے۔
ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ میں حاصل کی تکمیل ہندوستان میں اکابر دیوبند بالخصوص حضرت
مفتی کفایت اللہؒ سے فرمائی۔ بعد از فراغت مدتوں دہلی میں مسند تدریس کو رونق بخشی
اور عقلی و نقلی علوم میں نہایت تبحر اور ید طولیٰ حاصل کیا، سلوک اور تزکیۂ باطن کے مراحل
سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک ممتاز مرشد حضرت خواجہ فضل علی مسکین پوری سے طے
فرمائے عشقِ حقیقی سے سرشار طبیعت کو قرار مدینہ طیبہ میں نظر آیا۔ ۳۰، ۳۵ برس
پہلے ہجرت فرمائی ابتدا میں ابتلاء و آزمائش کے نہایت صبر آزما مراحل سے گذارے
گئے اور کامیابی و استقامت کے بعد ظاہری و معنوی برکات اور فتوحات کا دروازہ
کھلا اور ایسا کھلا کہ بے پناہ مقبولیت، مرجعیت اور عجیب جاذبیت سے نوازے
گئے۔

"العطایا علی متن البلایا" جہاں بھی گئے ایک مقناطیسی قوت کی طرح
خلقِ خدا پروانہ وار جمع ہونے لگی۔ اور بقدر ظرف ہر ایک نے فائدہ اٹھایا۔ فیاض ازل
نے انہیں نہایت بلند اور پاکیزہ صفات سے نوازا تھا، تحمل، بردباری، شفقت علی الخلق
بلند حوصلہ، بے مثال سخاوت اور مہمان نوازی دین کے لئے درد و سوز اصلاح خلق
کی تڑپ اور تبلیغ دین میں حکمت و موعظت اور طریق احسن اپنانے کا ملکہ، لوگوں کی
نفسیات کا گہرا شعور، غرض ہر چیز میں نہایت اعتدال و احتیاط اور ہر کام میں بصیرت
اور تدبر کا ظہور ہوتا ——— نتیجۃً مرجع خاص و عام بنے تربیت اور اصلاح پانے والوں
کا سلسلہ عرب سے عجم تک پھیلا ہوا ہے مگر فیض کا زیادہ حصہ پاکستان کو پہنچا ہے۔

---

[1] مدینہ منورہ میں قیام کے دوران ہزارہا مخلوق خدا آپ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئی
اور حضرت خواجہ عبید اللہ احرار، خواجہ باقی باللہ و مجدد الف ثانی رحمہم اللہ کی طرح حلقہ نقشبندیہ کو
افریقہ و عرب و عجم میں متعارف کرایا۔ (مرتب)

پچھلے پندرہ سال میں کئی بار پاکستان تشریف لائے، جبکہ دیگر ممالک کے سفر پہ کبھی آمادہ نہ ہوتے، اپنے دورۂ سرحد کے موقعہ پہ دارالعلوم حقانیہ بھی کئی بار تشریف لائے دارالعلوم کی موجودہ شاندار مسجد کی اینٹ دیگر رفقاء کار کے ساتھ آپ نے بھی رکھی۔ محبت، تعلق اور خصوصی توجہات اور دعاؤں کا سلسلہ تو آخر دم تک، قائم رہا اس لحاظ سے دارالعلوم حقانیہ کے مہتمم و شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ نے بجا طور پہ اس سانحہ کو دارالعلوم کا ذاتی سانحہ قرار دیا ہے۔

ایک ایسے کامل الصفات اور جامع شریعت و طریقت بزرگ کی سانحۂ وفات سے علم و عمل تصوّف اور سلوک، وعظ و ارشاد کے ایوانوں میں جتنا بھی ماتم ہو تو حق ہے حضرت اقدس کی ذات دیوبندی سلسلۃ الذہب کی ایک بیش قیمت کڑی تھی، ابھی چند سال پہلے تو مدینۃ الرسول میں اس سلسلۃ الذہب سے وابستہ تین مہاجر بزرگ موجود تھے اور اطراف عالم میں حکمت و معرفت کی شکل میں دیوبند کا فیض تقسیم کر رہے تھے۔ حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی[1]، حضرت مولانا شبیر محمد سندھی اور حضرۃ مولانا عبدالغفور عباسی رحمہم اللہ، مگر اب وہ تینوں محفلیں اُجڑ گئی ہیں کہ جن کے وجود پہ برّصغیر کے دینی اور علمی حلقے جتنا بھی ناز کرتے تو کم تھا ؂

حریفان بادہا خوردند و رفتند
تہی خم خانہ ہا کردند و رفتند

حضرت اقدس مولانا عباسی مرحوم اخلاق حسنہ کے پیکر اتباع سنت کا مجسمہ انسانیت کا نمونہ تھے مگر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس کائنات میں ہمارے سب سے

---

[1] علوم الوری کا امین و ترجمان مؤلف و محشی فیض الباری۔ عظیم علمی کتاب ترجمان السنۃ کے مصنّف۔ آخری عمر میں مسکن مدینہ طیبہ رہا۔ اور مدفن حضرات صحابہ بالخصوص عثمان رضی اللہ عنہ کے جوار میں جنت البقیع۔ (مرتب)

بڑے محسن اور سب سے زیادہ محبوب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پڑوسی اور
غلامِ حاضر باش تھے، ان کی نیم شبانہ دعاؤں میں ہمارے لیئے ایک بڑا سہارا تھا۔ انہیں
پورے عالمِ اسلام اور بالخصوص پاکستان کی فکر ہر وقت دامن گیر رہتی، مواجہۃ الرسول علیہ
السلام میں ان کی گریہ زاری پوری امت اور پاکستانی مسلمانوں کے لیئے خاص طور پر
نعمتِ کبریٰ تھی، دنیا کا ہر خطہ ایسے بزرگوں سے خالی ہوتا جا رہا ہے، جنہیں زمین کا نمک
انسانیت کا جوہر اور علم و عمل کی آبرو کہنا چاہیئے۔ دوائے دل بیچنے والے تو مدت ہوئی
کہ بڑی تیزی سے اپنی دکان علم و حکمت بڑھانے لگے ہیں۔ حرمین الشریفین بھی اس عالمی
خسارہ کی لپیٹ میں ہیں کہ یہ تو عالمِ اسباب ہے، معنوی برکات ایسے مقامات سے
معدوم تو نہیں ہو سکتیں مگر مستور ضرور ہوتی جا رہی ہیں، افسوس کہ مدینہ طیبہ کی وہ عباسی
خانقاہ اجڑ گئی جہاں پہنچ کر روحانی پیاسوں اور تھکے ماندے مسافروں کو شفقتِ غفوری
اپنی آغوش میں ڈھانپ لیتی تھی۔ ہماری دعا ہے کہ جانے والے پر رحمتوں اور رہنے
والے پسماندگان اور منتسلین پر صبر و اجر کی بارش ہو اور مدینہ طیبہ کی منزلِ عباسی کی
رونق اسی طرح قائم و دائم رہے۔

الحق

جون ۱۹۷۴ء

مدنی شیخ رح کی مجلس میں [1]

سنہ ۱۳۸۳ھ میں مدینہ طیبہ کی پہلی حاضری اور طویل قیام کے دوران حق تعالیٰ نے حضرت مولانا عباسی مرحوم کی مجالس میں شمولیت اور بعض دفعہ ارشادات قلمبند کرنے کی توفیق عطا فرمائی پھر یہ ملفوظات صاحب ملفوظات کو سنائے اور ان میں اضافہ و ترمیم کرانے کا موقعہ بھی ملا۔ اب انہیں قارئین الحق کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جا رہی ہے۔ (سمیع الحق)

جامع و مرتب :- احقر سمیع الحق بزمانہ قیام مدینہ ۱۳۸۳ھ "مقام" :- مدینہ طیبہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

زمانۂ ملفوظات

۲۲ رمضان المبارک تا ۲۸ ذیقعد ۱۳۸۳ھ

فرمایا ! مولانا خالد رومی بہت بڑے عالم اور بزرگ ہیں کردستان کے باشندے تھے علوم معقول و منقول، فلسفہ، دینیات، علم اسطرلاب و مساحۃ و ہندسہ کوئی فن فنون اور علوم کا ان سے نہیں چھوٹا تھا اسی طرح علوم ریاضی میں جامع عالم تھے۔ نہایت استحضار تھا۔ رشحات ایک کتاب علم تصوف میں ہے اس کے حاشیہ پر مولانا کے حالات تھے اس میں یہ قصہ لکھا ہے کہ میں باوجود ان تمام علوم و فنون کے اپنے قلب کو خالی پاتا تھا نہ ذوق تھا نہ شوق اور نہ ذات حق سے لگاؤ۔ نہ جمعیت خاطر اور نہ قلب میں سکون پاتا تھا۔

---

[1] شیخ عبدالغفور عباسی مدنی کے تذکرہ کی مناسبت سے یہ مجلس شامل کتاب کیجا رہی ہے۔

اس دوران حرمین الشریفین حاضر ہوا۔ اصل مقصود حج و زیارت تھا، مگر ایک کامل و مکمل شیخ سے ملنے کا داعیہ بھی دل میں تھا کہ قلب سے جمود ختم ہو جائے۔ پہلی حاضری مدینہ منورہ ہوئی، مشائخ، فقراء صلحاء سے طمانیت قلب کی تلاش میں ملنے لگا یہ زمانہ دولت ترکیہ کا تھا۔ مشائخ اور صوفیاء پر بھی بندش نہ تھی، حرم نبوی ہی میں سب خدمتیں درس اور ارشاد و اصلاح کی ہوتی تھیں۔ مسجد میں علماء کا مجمع لگا تھا میں بھی حاضر ہوا۔ ایک بزرگ تقریر فرما رہے تھے کہ تین چیزیں جس بندہ کو خدا نے دیں وہ بڑا خوش نصیب ہوگا۔ ۱۔ علم شریعت جو اساس اور بنیاد ہے ورنہ غلط راستہ پر بھٹک جانے کا احتمال ہوتا ہے۔

۲۔ عقیدہ اہل سنت والجماعت رکھتا ہو نہ وہابی ہو کہ لامذہب نہ ہو نہ ہو بدعتی کہ شرک و رسوم اور بدعات میں گرفتار ہو جائے۔

۳۔ اس کا سلسلہ حضرات نقشبندیہ سے قائم ہو، نسبت نقشبندیہ اس کو حاصل ہو۔ مولانا خالد رومی نے فرمایا کہ میں نے سوچا کہ الحمدللہ خدا نے عالم شریعت بھی بنایا علم بھی صحیح دیا ہے اور عقیدہ بھی صحیح ہے لیکن تیسری چیز کی کمی ہے کہ قلب نسبت سے خالی ہے میں نے مجمع سے دعا کی درخواست کی کہ خداوند تعالیٰ نسبت بھی صحیح عطا کر دے سب نے مسجد نبوی میں میرے لیے دعا فرمائی۔ اس کے یہاں کے ایک یمانی فقیر سے میرا لگاؤ ہوا مگر اتنا نہیں کہ ان سے ارتباط قائم کر لیا صرف اس کی مجلس میں شرکت کرتا اور جس وقت میں نے مکہ معظمہ کے بارہ میں جانے کا ارادہ کیا تو ان کی خدمت میں حاضر ہوا کہ شیخ دعا میں یاد فرمایا کریں اور مکہ معظمہ کے بارہ میں کچھ نصیحت بھی فرما دیں، دعا فرمائی اور وصیت بھی کی کہ وہاں وقت ضائع نہ کرنا بلکہ سارے اوقات، طواف، نفل، تلاوت، ذکر اور قضا نمازوں کے اعادہ وغیرہ عبادات میں لگانا اور حرم مکہ میں کسی پر تنقید و جرح سے ہر حالت میں بچنا اپنے کام میں لگے رہنا (اس کے بعد ان سے رخصت لے کر مکہ معظمہ گیا) اور جس وقت میں نے طواف قدوم شروع کیا تو اسی اثناء میں ایک شخص کو دیکھا جو شاذروان[1] کعبہ کو تکیہ لگائے بیٹھا ہے، سرخ داڑھی رکھتا ہے

---

[1] ۔ خانہ کعبہ کے چاروں طرف پشتبانی کے طور پر جو پتھر ہے اسے شاذروان کہتے ہیں۔

مجھے خیال ہوا کہ ہم لوگ بلاد بعیدہ[1] نائیہ میں رہ کر خانہ کعبہ کے جہت کو پیٹھ اور پاؤں تک نہیں پھیلاتے اور اس گستاخ نے عین خانہ کعبہ کو پیٹھ کرکے تکیہ لگایا ہے اس خیال کا آنا تھا کہ اس شخص نے کہا کہ۔ انسیت نصیحۃ الشیخ الیمانی[2] میں سمجھا یہ تو کوئی صاحب کشف ہے، میری تنقید اور اعتراض کا کشف ہوا اس کو، میں نے جلدی سے جلدی سے اس کے پاس دوڑا اور عرض کیا کہ علمنی مما علمک بہ اللہ[3] اور عرض کیا کہ میں عرصہ سے کسی شیخ کامل کی تلاش میں ہوں، انھوں نے ہندوستان میں شاہ غلام علی دہلوی مجددی کی طرف اشارہ فرمایا کہ وہاں جایئے، میں سمجھا کہ نصیب حجاز مقدس میں نہیں ہے جس طرح جسمانی ارزاق مقرر ہیں اسی طرح روحانی غذا اور ارزاق بھی مقدرات خداوندی میں سے ہیں۔ یہ بھی غذائے روح ہے، المغرض ہندوستان روانہ ہو کر پہلے پانی پت میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی علیہ الرحمۃ سے ملاقات کی وہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے خلیفہ تھے اور شاہ غلام علی بھی عالم را عالم و ولی را ولی می شناسد، خالد رومی کی گفتگو قاضی صاحب نے سنی تو پہچان گئے کہ عالم اجل ہے، حضرت قاضی صاحب بھی بہت بڑے پایہ کے بزرگ اور عالم تھے، تفسیر مظہری ان کی تصنیف ہے، خیال آیا کہ حضرت خالد رومی کچھ فیض ان سے حاصل کرلیں جب توجہ دینے لگے تو اثنائے توجہ حضرت شاہ غلام علی دہلوی کا تمثال ان کو ظاہر ہوا، فرمایا جاؤ تمہاری قسمت شاہ دہلوی کے ہاں ہے، ادھر شاہ دہلوی کو ان کی آمد کا علم ہوا تو خدام جماعت سے ہدایت کی کہ جاؤ ایک عالم جلیل بقصد اصلاح باطن میرے پاس آرہا ہے، الہامات صحیحہ تھے، کشف وانوار تھے تو فرمایا کہ جس وقت وہ آجائیں تو اس کا اکرام کرکے یہاں لے آؤ ——— یہی زمانہ ہمارے شاہ احمد سعید مدنی اور ان کے بھائی اور شاہ عبدالغنی مجددی کا تھا یہ دونوں حضرات یہاں بقیع میں مدفون ہیں اور اسی زمانہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مکہ معظمہ میں تھے، دہلی میں جب غدر ہوا تو شاہ احمد سعیدؒ وہاں سے نکلے، جامع مسجد

---

[1] دور دراز شہر [2] تم یمنی شیخ کی نصیحت بھول گئے
[3] اللہ کے دیئے گئے علم سے مجھے بھی کچھ سکھا دے یعنی درس،،

دہلی میں جہاد کا علم اٹھایا پھر قلعہ ہمایوں میں "تین دن چھپے رہے، انگریزوں کا وارنٹ لگا رہا پھر ڈیرہ اسمٰعیل خاں وغیرہ قبائلی علاقوں سے چھپ چھپا کر نکلے اور مدینہ طیبہ روانہ ہوئے بہر حال خدام نے حضرت خالد رومی کو شاہ غلام علی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا، انہوں نے بلا انتظار اشارہ باطنی سے انہیں بیعت کر دیا نو مہینے وہاں رہے اور برابر سقاوہ وضو خانہ وغیرہ میں مشک بھر بھر کر ڈالتے رہتے کہ مہمان اس سے وضوء کریں اور حلقہ میں بھی "تادباً" و تواضعاً مع الشیخ صفِ نعال میں بیٹھتے، شیخ نے خلافت مطلقہ کی اجازت دی اور فرمایا: ہر چہ بود کردی ہمراہ خود بردے[1] ـــــ ویسے ہی ہوا مولانا خالد رومی کا لقب علوم ظاہری و باطنی دونوں میں تکمیل کی وجہ سے ذوالجناحین ہے یعنی دو پروں والے تھے، علوم تو ان لوگوں کے تھے کہ کمال علمی بھی اور پھر کمال نسبت بھی رکھتے تھے، رخصت ہوتے وقت اپنے شیخ سے کہا کہ حضرت جس علاقہ اور ملک میں میرا جانا ہے وہاں رفاعیہ اور شاذلیہ وغیرہ سلسلے ہیں، نقشبندیہ کو کوئی نہیں پہچانتا، فرمایا جاؤ وہ لوگ تمہارے ہاتھ چومیں گے اتنی ہی تم ہو گے، استقامت سے لگے رہو پھر کیا ہوا عجیب فیضان جاری ہوا اور شاہ دہلوی کے زمانہ میں ایسا فیضان کہ سبحان اللہ عجیب حالت تھی مقبولیت کی وجہ سے علماء اور مشائخ رسم و رواج نے مخالفت شروع کر دی یہاں تک کہ ان کی تکفیر پر رسالہ لکھا گیا، چھپ گیا تو بادشاہ وقت کو بھی پیش کیا گیا، بادشاہ نے پڑھ کر شیخ کو حاضر ہونے کا حکم دیا کہ ان کی صورت، سیرت، گفتار و کردار بھی تو دیکھ لوں اس وقت کے سلاطین زمانہ بھی تو دماغ رکھتے تھے، کلام، صورت، سیرت دیکھ کہنے لگا کہ یہ شخص بھی کافر ہے تو پھر اس ملک میں مسلمان ہے ہی نہیں پھر تو اتنا عروج ہوا، کہ اللہ اکبر بادشاہ خود عقیدت مند ہوا اور اجازت وعظ و ارشاد کی دے دی مخالفین بھی اپنے کام میں لگے رہے ایک شخص نے مریدوں کو پریشان کرنے کی خاطر ایک دفعہ ختم خواجگان کے دوران آ کر کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ

---

[1] یعنی جو کچھ تھا کر دی عالم اپنے ساتھ لے گیا۔

تمہاری آنکھیں نکالی گئی ہیں کان اور زبان کاٹے گئے ہیں اس کا خیال یہ تھا کہ معتقدان یہ سن کر بدظن ہو جائیں گے شیخ سمجھ گئے اور فرمایا کہ یہ تو بڑا مبارک خواب ہے اور کہا کہ آنکھیں محرمات سے نکالی گئی ہیں، زبان اور کان جھوٹ اور فواحش بولنے اور محرمات ومنکرات کا قصد کرنے سے روک دیئے گئے ہیں یہی تیرے خواب کی تعبیر ہے پھر ایک معقول انعام بھی اس شخص کو دے دیا وہ شخص نہایت شرمندہ ہوا معافی مانگی اور صحیح واقعہ بیان کیا کہ سازش اور پیسوں کے لالچ میں میں نے یہ کام کیا۔ الحمدللہ کہ خدا نے مجھے ہدایت دی اور ان کے مقررہ پیسوں سے زیادہ انعام سے بھی نوازا اب تو ان کا ان کے ممالک میں ایسا فیض ہے کہ خود نقشبندیہ کا نام بھی نہ رہا جب کسی سے پوچھو من انت تو جواب یں انا خالدی دیں خالد ہوں کہیں گے، یہ خواجہ دہلوی کا فیض ہے کہ عالم میں حضرت خالد رومی نے اسے منتشر کردیا تو علم ہو صحیح اور اس کے ساتھ ایسا فیض تب مخلوق کو فائدہ ہوتا ہے ۔

فرمایا! ہمارے حضرت فرماتے تھے کہ یہ کام علماء کا ہے مثلاً کل آپ نے صفاتِ سلبیہ اور شئونات کے بارہ میں پوچھا تھا اور میں نے بتلا دیا کہ سلبی صفات میں نفی کا معنی موجود ہے، قدم، حدوث کی نفی کرتا ہے، قائم بالذات نفی قیام بالغیر کی کرتا ہے، مخالفت مع الحوادث سے مشابہت مع الحوادث کی نفی ہوتی ہے اسی طرح وحدانیت بھی سلبی صفت ہے کہ ذات اور صفات میں ان کی تشبیہہ کی نفی اس سے ہوتی ہے ـــــ اسی طرح ذات وصفات کی درمیانی حالت کا نام شئون ہے، مثلاً قدرت صفت اور قدیر اسم ہے اللہ کا ـــــ رحمت صفت اور رحیم اسم ہے یعنی مشتقات اسماء ہیں اور مشتق منہ، صفات ہیں، اسی طرح تکوین صفت ہے اور مکون اسم ہے، کلام صفت اور متکلم اسم ہے ـــ اب ذات وصفات کے درمیان جو حالت ہے اسے شئون کہتے ہیں، یہ صفت اعتباری ہے، جیسے بین الموضوع والمحول نسبتِ رابطی ہوتا ہے مثلاً عالمیت، ذات حق اور علم کے درمیان کی چیز ہے؟ اب ان باتوں کو عوام کیا جانیں ان کو تو سرسری اذکار اور لطائف بتلا دیئے جاتے ہیں ؟

فرمایا: اس تصوف اور اصلاح باطن کے طرق پر ہزاروں کروڑوں متفق چلے آ رہے ہیں اور صرف عوام ہی نہیں بلکہ اہل حق اور علماء اجلہ۔ ایسے اشرف علم کی مخالفت غلط چیز ہے اسی طرح مذاہب اربعہ پر اجماع ہے کہ حق ان میں دائر ہے تو اس کی مخالفت غلط چیز ہے۔ ان علماء، فقہا اور صوفیا کے مقامات تک کوئی نہیں پہنچتا، لوگ آج کل غلط قسم کی صحبتوں سے برا اثر لے لیتے ہیں، موالک، شوافع، حنابلہ، احناف سب میں بے حد و حساب صوفیاء عارفین اور بزرگ گزرے ہیں۔

فرمایا: امام احمد نے امام شافعی پر اعتراض کیا کہ تم کیوں ایک شیبانی چرواہے کیطرف دوڑتے پھرتے ہو اس میں تو نے کیا دیکھا ہے انہوں نے فرمایا کہ چلو تم بھی ایک دن میرے ساتھ چلو گے، سوال کیا نی کم کم؟ (کتنے میں کتنا ہے؟) اس نے جواب دیا کہ شریعت میں یا طریقت میں، شریعت میں تو فی اربعین شاۃ شاۃ ہے (چالیس بھیڑوں میں ایک زکوٰۃ میں دینی ہے) اور طریقت میں تو سب کچھ اللہ کا ہے، ہمارا کچھ بھی نہیں ہے

فرمایا: اگر یہ چیز (اخلاص اور خشیت) حاصل ہو تو مقصد حاصل ہو گا ورنہ "راہے کہ تو می روی بترکستان است،" والا معاملہ ہو گا اگر اخلاص ہو اور ریا و خودی سے ہر عمل دور ہو تو مزا ہے اور یہ روح ہے تمام علوم کی لیکن اخلاص اور جمعیت قلب ارباب اخلاص و جمعیت کی مصاحبت سے پیدا ہوتی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے المرٔ علی دین خلیلہ فلینظر من یخالل۔ ——— دیندار سے دوستی کرو گے تو دین آئے گا، بد دین سے صحبت ہو گی تو بد دینی پیدا ہو گی جو لوگ غلط صحبت میں جائیں گے تو تمام حالات اور معاملات غلط ہو جائیں گے اچھی صحبت میں صفات حمیدہ پیدا ہوں گے اور صفات ضمیمہ کٹ جائیں گے اور یہ چیز حاصل ہوتی ہے دوام ذکر سے اگر شیخ مقلد ہو، معتقد صوفیا ہو، وہابیت وغیرہ سے دور پھر ضرور رنگ چڑھتا ہے خالی نہیں رہتا آج کل یا تو ذکر نہیں اگر ہے تو اتباع سنت نہیں، عقیدہ نہیں غلط رسموں سے نہیں بچتے، سلف صالحین کے طرق پر نہیں چلتے لوگ لہو الحدیث میں گرفتار ہیں، رات بھر گانے سنتے ہیں ڈھول سنتے ہیں حالانکہ قرآن کے سننے سے انوار پیدا ہوتے ہیں، توحید کا مادہ بڑھتا

ہے کیونکہ یہ ذات پاک کا کلام ہے، اس کے پاک اثرات کسی منافق کے کلام کے اثرات بھی غلط ہوتے ہیں ظلمت ہوتی ہے دل مردہ ہوتا ہے ۔

فرمایا: پہلی مرتبہ جب حج کرکے میں مدینہ طیبہ حاضر ہو کر جالی مبارک کے سامنے کھڑا ہؤا تو جالی مبارک سے اتنی خوشبو آ رہی تھی کہ میرے منہ سے بے اختیار نکلا کہ یہ کافر لوگ کیوں یہاں نہیں آتے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرکے ایمان لے آئیں اور وہ خوشبو ایسی تھی کہ مجھے رابغ تک محسوس ہوتی تھی ۔

اسی دوران ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ مواجہ شریف کے سامنے کھڑا ہوں حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قبر شریف سے فیض و انوار اٹھتے ہیں اور امواج کی طرح جالی مبارک سے نکل کر میرے قلب کی طرف آتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ الحمد للہ جو فیض بالواسطہ ملتا تھا اب بلاواسطہ مل رہا ہے اور مجھے حیرانی ہے کہ میں اس فیض کو کیسے برداشت کر سکوں گا جب خواب سے بیدار ہوا تو عجیب خوشی اور انشراح کی کیفیت تھی ۔

مجھے اس خواب کی حلاوت بھی کافی عرصہ تک محسوس ہوتی تھی رحمت کا وہ عظیم الشان دریا اب بھی مدینہ طیبہ میں بہتا ہے، میرا مشاہدہ ہے اور پھر ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک مقفل ہے اور اس کی چابی مجھے دی گئی ہے ۔ میں نے چابی لی دروازہ کھولا اندر دیکھا تو اوپر نیچے گلاب کے پھول دیکھے درمیان میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھ کر تبسم فرمایا اور بے حد خوش ہوئے، میں نے دل میں کہا کہ میرے متعلقین اور احباب و اعزہ کہاں ہیں کہ انہیں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کراتا تو بے حد بشاشت تھی ۔ میں اب بھی وہ کیفیت نہیں بھول سکتا ۔

اسی طرح میں نے اپنے ملک میں ایک دفعہ خواب دیکھا کہ گاؤں میں ہمارے اپنے گھر سے مسجد کی طرف حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ جا رہے، حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجھے فرمایا: کہ میں آپ کو بیعت کرانا چاہتا ہوں" میں نے کہا کہ حضور میں تو بزرگانِ نقشبندیہ سے بیعت ہوں جن کا سکونت مدینہ طیبہ میں باب جبریل کی طرف بقیع میں ہے فرمایا ہاں میں تمہیں خود اہلِ بیت کے سلسلہ میں بھی بیعت کرنا چاہتا ہوں قادری

سلسلہ میں، میں نے وضو کیا پھر مجھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بیعت فرمایا یہ انہی کا فیض ہے کہ جہاں بھی جاتا ہوں لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور میرے نزدیک خواب اولی ہے۔ تیقظۃ اور کشف سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہے من رأنی فی المنام فقد رائی الحق داد کما قال علیہ السلام)۔

مجھے اس زمانہ میں علم نہ تھا کہ باب جبریل کی طرف شاہ ابوسعید اور شاہ احمد سعید شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی، حضرت آدم بنوریؒ سیدنا عثمانؓ بن عفان کے پہلو مبارک میں دفن ہیں اب میں جب بھی جاتا ہوں وہاں فاتحہ پڑھتا ہوں[1]۔

بزرگانِ دیوبند کے اسانید میں ان حضرات کا نام نامی موجود ہے۔ حضرت شاہ احمد سعید مجددی علیہ الرحمۃ کا مسجد نبوی میں حلقہ ہوتا تھا لکھا ہے کہ فرماتے کہ میں دیکھتا ہوں کہ حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام بعض حضرات کو خود توجہ دیتے ہیں، بڑے متورع بزرگ تھے اور حاجی صاحب مرحوم کا زمانہ پایا تھا یہ کہنے کی باتیں نہیں تھیں مگر اس وقت زبان پر آگئیں ؎

گرچہ من ناپاک ہستم خود را بپاکاں بستہ ام

بحمداللہ میری زنجیر اور رشتہ اوپر سے مضبوط ہے۔ میں غلط باتوں کی تلقین نہیں مقصد احیاء سنن ہے، ترویج شریعت ہے اس لیے باہر جاتا ہوں اگر یہ چیز نہ ہوتی تو مدینہ طیبہ سے باہر کبھی بھی نہ نکلتا، میں خود جاتا نہیں وہ لوگ بلاتے ہیں، بحمداللہ ڈاکو اور چرسی قسم کے لوگ ان اسفار میں تائب ہوگئے ہیں یہ محض خدا کا فضل ہے، یہ میرا کام نہیں قدرت کا فضل ہے، مجھے شرف دے رہا ہے، حضور اقدس صلی اللہ

---

[1] ۔ احقر جامع ملفوظات کو بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت صاحب ملفوظات قدس سرہٗ کی رہنمائی اور نشاندہی سے ان حضرات کے مزارات پر فاتحہ خوانی کا شرف بخشا نسبت باطنی اور انوار و برکات کی وجہ سے حضرت مرحوم کو جنت البقیع میں اس مقام سے بے حد الفت تھی اور حسن اتفاق کہ حضرت قدس سرہٗ کو بھی اس مقام پر خوابگاہِ آخرت میسر آئی، فضیلت اور شرف کے لحاظ سے اکثر علماء احبہ نے بقیع میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مرقد مبارک کو اولیت دی ہے۔ (سمیع الحق)

علیہ وسلّم کی برکت ہے' اب کام دین کا ہو رہا ہے، بدع و منکرات کو مٹایا جا رہا ہے
میں تو یہی کہتا ہوں کہ سگریٹ چرس وغیرہ چھوڑنا ہوگا، بیوی کا پردہ کرنا ہوگا، جس سے
کہا اس نے سر رکھ لیا پھر مجھے رونا آنے لگتا ہے کہ یہ تیرا کام نہیں اللہ تعالیٰ کا ہے کہ
وہ تجھ سے کام لینا چاہتا ہے۔

فرمایا: کہ جنوبی افریقہ میں نیروبی کے لوگوں نے بہت کوشش کی کہ تم یہاں کم از کم
۱۵ دن کے لیے آجاؤ میں نے کہا کہ نہیں آسکتا، پاکستان بھی اس لیے جاتا ہوں کہ وہاں
رشتہ دار ہیں' اقارب ہیں پھر وہاں دنیاداری نہیں ہے اگر افریقہ جاؤں تو لوگ کہیں
گے کہ عبدالغفور دنیاداری کے لیے افریقہ گئے پھر میں جو کہوں گا وہ مانو گے بھی نہیں نہ
ڈاڑھی کٹوانا چھوڑو گے نہ اور برائیاں ترک کرو گے۔ تو ایسے آنے سے کیا فائدہ۔

فرمایا: پیری مریدی کا اصل مقصد تو شریعت پر لگانا اور حضورؐ کی صحیح محبت اور اتباع
سنت پیدا کرنا ہے اگر ایسا پیر مل جائے تو لائق ہے پیری کے بشرطیکہ اس کی زبان میں
اثر ہو اگر ایسا پیر چپ اور خاموش بھی بیٹھا رہے تب بھی فیض سے خالی نہیں ہونا من
لم ینفعہٗ سکوتنا لم ینفعہٗ کلامنا - یہ ہمارے بزرگوں کا مقولہ ہے یعنی جنہیں ہماری
خاموشی سے فائدہ نہ ہوا انہیں ہماری باتوں سے بھی فائدہ نہیں ہوگا لان القلب یأخذ من
القلب والطبع یاخذ من الطبع :۔ تاجر کے ساتھ بیٹھو گے تو تجارت کا شوق ہوگا تاجر
کے اثرات دل میں منعکس ہو جائیں گے شرابی کے ساتھ بیٹھو گے تو اس کے اثرات قلب پر
پڑیں گے، الصحبۃ موثرۃ صحبت بہرحال موثر ہے' الحمدللہ آج میری طبیعت ٹھیک ہے
آرام ہے تو یہ چند باتیں خدمت میں عرض کیں۔

فرمایا: دنیا فانی ہے' موت سر پر ہے' انسان کو محتاط رہنا چاہیئے نہ علم پر غرور
ہو نہ مال پر، نہ تقویٰ و شیخی پر نہ دنیا پر کہ یہ سب چیزیں کچھ بھی نہیں عمل ضروری نہیں
باتوں سے کام نہیں چلتا ؎

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی
که اندریں راہ فلاں بن فلاں چیزے نیست

علم وہ ہے جس سے عمل پیدا ہو، عمل وہ ہے جس میں اخلاص کی جان ہو' اخلاص وہ ہے

جس سے خوف وخشیت پیدا ہو اور اگر خوف پیدا ہو تو عجز و درماندگی پیدا ہوگی سوئے گا تو جلدی اٹھ کر روئے گا اور گڑگڑائے گا، بدن پر ہر وقت خوف طاری ہوگا۔

اناعندالمنکسرۃ قلوبھم۔

فرمایا: ایسا علم جس میں صالحین اور سب پر تنقید ہی تنقید ہو تباہی ہے، اپنے نفس پر بدظنی کرتے رہو۔

میرا بیروا ناں دمرشد شہاب دواندر زفرمودہ (۹) آپ خودی کے بت کو توڑ دو، یہاں لوگ حج کرنے آکر اوروں پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں ——— ہمیں کیا ——— اپنا کام کرتے رہو، یہاں شیاطین بھی اچھی طرح گمراہ کراتے ہیں، یہ تو امتحان اور عشق کا سفر ہے، ادب کا مقام ہے، ہم تو عبیدالامتنان ہیں نہ کہ عبیدالامتحان۔

فرمایا: سلوک آج کل کہاں ہے، کرنے والے کہاں ہیں، ہماری تو صرف تبلیغ ہے ہمارے ایک سید صاحب ہیں مکہ معظمہ میں میں نے ان سے ذکر کی حالت پوچھی، کہا بریانی زردے کھاتے ہیں، مجاہدہ کہاں ہوتا ہے، شاہ غلام علی دہلوی نے فرمایا کہ لفظ فقیر میں چار حروف ہیں ف میں فاقہ کی طرف اشارہ ہے تو فاقہ کشی کہاں ہے ق میں قناعت کی طرف تو قناعت ہم میں لوگوں کہاں ہے۔ ی میں یاد حق کی طرف اور ر میں ریاضت کی طرف اشارہ ہے تو وہ بھی نہیں اگر فاقہ کر لیا تو فضل رب حاصل ہوگا تو وہی ف فضل بن جائے گا اگر قناعت کی تو قرب حق حاصل ہوگا یاد حق میں لگا رہا تو اس کو بھی یاد حق حاصل ہوگی اور ر سے رحمت کا مستحق ہوگا ورنہ ف فضیحت ق قباحت ی یاس اور ر رسوائی کا موجب بن جائے گی۔

فرمایا: ہم نے تبلیغ کو ایک ذریعہ بنا دیا ہے، اصلاح کا ورنہ سلوک کہاں، سلوک والے لوگوں کو ٹالتے تھے کہ استخارہ کرو جاؤ غور و فکر کر کے بیعت کی رائے قائم کرو مگر ہم پھنساتے ہیں اور خود بلاتے ہیں تاکہ کسی طرح ادھر آجائے اور جس کو اس راستہ سے اصلاح ہوتی ہے بندگان حق کے ذریعہ سے زبانی تعلیم سے اتنا اثر نہیں

ہوتا جتنا صحیح اور حال سے تاثر ہوتا ہے، صحیح طبیعت والے کے قلب سے صحیح اثرات کا انعکاس ہوگا، بری طبیعت سے برے اثرات کا انعکاس ہوگا، اس لیے ذکر اور صحبت صحیح اس زمانہ میں حفظِ ایمان کے لیے ضروری چیز اور بہترین سامان ہے

فرمایا: یہ بیعت ابتدائے اسلام سے خاص و عام (علماء، عوام) میں جاری رہی، ہر زمانہ ہر قرن میں اہل اللہ کے ہاتھ پر علماء اور عوام نے بیعت کی ہے یہ بیعت بیعت ہے۔ ایسے شیخ کو تلاش کرے جو عالم شریعت ہو باعمل ہو، آمر بالمعروف ناہی عن المنکر ہو، اچھی باتوں کا بتلانے والا ہو اور اس کا سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ چکا ہو تمام ظاہری، باطنی چھوٹے بڑے گناہوں سے توبہ کرائے اور بیعت کرنے والا آئندہ زندگی کے لیے اس بات کا وعدہ کرے کہ جہاں تک ہو سکے زندگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی پیروی کروں گا اور خلاف شرع کوئی کام نہ کروں گا مقصد اس بیعت سے قرب و حق رضائے حق ہے تاکہ آئندہ زندگی سنت اور شریعت والی زندگی ہو تاکہ خاتمہ ایمان پر ہو باایمان اس دنیا سے چلا جائے اگر صغیرہ گناہ پر مداومت کی جائے وہ بھی کبیرہ بن جاتا ہے انگریزی بال رکھنا، ڈاڑھی منڈانا سب گناہ ہیں۔

ایک شخص کو بیعت کرتے وقت فرمایا: پاکستانی زمین بڑی عجیب ہے، بڑی سرسبز ہے، قبولیت کی صلاحیت رکھتی ہے لوگوں میں انابت اور توبہ کا جذبہ موجود ہے۔

فرمایا: ایک مجلس میں ایک صاحب مودودی جماعت کے امیر تھے، میرے سامنے اس کی اور جماعت کی بڑی تعریفیں کرنے لگے میں نے ڈانٹ دیا کہ اتنی تیز باتیں مت کرو، سیاست تو ہمارا دین ہے، دین پر چلنا ہی سیاست ہے، افراد کی اصلاح کردو تو سیاست خود بخود ٹھیک ہو جائے گی مودودی کا کام مجھے بتلاؤ اور میں ایسے بیشمار ایک ایک فرد کی مثالیں پیش کرتا ہوں کہ ان کے ایک جگہ جانے سے سینکڑوں کی اصلاح ہو جاتی ہے، ڈاڑھی چھوڑنے لگتے ہیں، گناہوں سے تائب ہو جاتے ہیں تم مجھے بتلاؤ کہ مودودی صاحب نے کسی ایک کی بھی اصلاح کی کہ مجھے محمدی ڈاڑھی

چاہیئے، مودودی کی ڈاڑھی نہیں، مودودی کسی امام کا مقلد نہیں کسی ایک بزرگ کا معتقد نہیں اس نے صحابہؓ تک کو تنقید سے نہیں چھوڑا تو میں نے کہا کہ ایسے شخص کی اتنی تعریف مت کرو۔

بعد از نماز مغرب ایک دفعہ جب کہ مسجد نبوی سے مکان جاتے ہوئے حضرت کے ساتھ تنہا جا رہا تھا تو فرمایا کہ ابتداء میں میں جب یہاں آیا تو کئی حج یہاں سے عرفات تک پیدل کئے پانی کی مشک اور سامان ضرورت اٹھائے ہوئے جب ہمارے رفقاء پیدل جاتے اور ذکر و اذکار میں محو ہوتے تو عجیب لطف ہوتا اس قسم کے پر از مشقت حج میں پہلی دفعہ جو کیفیت محسوس ہوئی وہ پھر نہ ہوئی میں نے عرفات کے میدان میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو خواب میں دیکھا کہ انہوں نے دو پلیٹوں میں دو تلی ہوئی مچھلیاں میرے سامنے رکھیں اور فرمایا کہ ھٰذا حج مبرور وھٰذا عمرۃٌ متقبلہ۔ (یہ ایک مقبول حج اور دوسرا مقبول عمرہ ہے)۔

فرمایا: بعد از عصر مجلس میں قاری نے تلاوت فرمائی تو فرمایا: کہ قرآن مجید کی یہ حلاوت کسی اور چیز میں بھی ہے، یہ قرآن کریم کی نعمت ہے۔ الحمد للہ الذی اعزنا بالاسلام وشرفنا بہ۔ میں جب پہلی بار مدینہ حاضری میں حرم شریف میں حاضر ہوتا تو ایک عجیب خوشبو مزار مبارک کے اندر سے آتی تھی اور مجھے محسوس ہوتی تھی، جب رخصت ہو کر واپس جانے لگا تو رابغ تک محسوس ہوتی رہی، وہ ایک خاص قسم کی خوشبو تھی، جالی مبارک اور کلام پاک کی خوشبو اور حضور اقدس کے مزار کی خوشبو تو میری زبان سے بے اختیار نکلتا کہ یہ کفار یہاں آکر کیوں یہ خوشبو نہیں پاتے کہ مسلمان ہو جائیں کوشش چاہیئے کہ اسلام کی نعمت حاصل ہو، صحابہ کے اخلاق اور حضور کی صفات نصیب ہوں۔

حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کے مزار سے بعد از وفات خوشبو آنے لگی تھی اور اخبارات میں بھی نکلا، اس کا تذکرہ ہوا تو فرمایا: بلا شک یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ حضور صلی اللہ کا ارشاد

کہ میری امت کی مثال بارش جیسی ہے۔ لا یدری فی اولہ خیر ام فی آخرہ۔ اول
میں بھی خیر ہے آخر میں بھی خیر ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امت میں علماء صلحاء
اور مشائخ کا یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا بایزید بسطامیؒ ایک دن نصاریٰ
کے گرجے میں لباس نصاریٰ پہن کر تشریف لے گئے ان کی عبادت کا ایک خاص دن
ہوتا ہے۔ جب پادری خطبہ دینے کھڑا ہوا تو اس کی زبان بند ہوگئی تو کہا کہ کسی اجنبی
شخص کی وجہ سے میرے قلب پر اثر ہوا، کہ زبان چلتی نہیں، لوگوں نے تلاش شروع کروائی
مگر بایزید کو پہچان نہ سکے۔ جب پادری دوبارہ منبر پر کھڑا ہوا تو دوبارہ اس کی زبان بند
ہوگئی تو تلاش شروع کروائی اور کہا کہ ظاہری لباس کو مت دیکھو بلکہ اجنبی چہرہ اور
صورت کو پہچاننے کی کوشش کرو، صورت نئی تھی اور حضرت بایزید کو پہچان گئے۔
پادری کو بتلایا تو وہ آیا، ہاتھ چومے اور فوراً کلمۂ شہادت پڑھ لیا اور کلمہ کیا پڑھا کہ مجلس
میں جتنے لوگ تھے سب نے کلمہ پڑھا مولانا روم نے اس مقام پر لکھا ہے کہ شان الوہیت
دیکھئے کہ ایک شخص کو لباس نصرانیت پہنا کر سینکڑوں ہزاروں سے لباس نصرانیت
اتروا دیتا ہے تو اللہ والوں کی بعض ظاہری چیزیں اس قسم کی ہوتی ہیں اور اس سے بھی
اتنا خیر ظاہر ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ بزرگوں پر تنقید سے بچائے۔

خواجہ عزیزاں رامیتنیؒ سے کسی نے پوچھا تصوف کیا ہے ؟ فرمایا اتصال و
انفصال، جوڑنا اور توڑنا یعنی اللہ سے جوڑنا اور مخلوق سے توڑنا ہے ——— سوال
کرنے والا کپڑا بنتا تھا، جوڑنا توڑنا اس کا کام تھا، تو اس کے پیشے کے مطابق اسے
جواب دیا، ایک دفعہ آپ خوارزم تشریف لے گئے تو شہر میں داخلہ کے وقت فرمایا
کہ بغیر اذن ملکی اور خاص فرمان کے داخل نہیں ہوسکتا، بادشاہ کو اطلاع دی کہ
خواجہ عزیزاں شہر میں اذن ملکی اور آپ کی سند سے داخل ہونا چاہتے ہیں بادشاہ
نے ہنسی مذاق کیا اور کہا کہ ہر نساج آئے گا اور اسے شاہی مہر دی جائے گی اور
ہنسی مذاق میں اجازت دی اور مہر لگوادی شہر میں داخل ہوئے تو وہاں کے مزدوروں
کے پاس پہنچ کر کہا کہ آج عزیزاں کے ساتھ کام کرو مزدوری بہت ملے گی، کام آسان

سے ساتھ لے گئے عصر تک انہیں بٹھایا، نماز سکھائی، مراقبہ کروایا اور اچھی خاصی مزدوری بھی دی، ہمارے مشائخؒ نے ایسی قربانیاں ہدایت کے لیے دیں دوسرے دن مزدوروں کا اور بھی جمگھٹا ہو گیا یہاں تک کہ بازار میں مزدور نہ ملتا تھا، شکایت بادشاہ تک پہنچی کہ ایسا شخص آیا ہے اور اس نے یہ سلسلہ شروع کر رکھا ہے سارے مزدور اس کے پاس جمع ہو گئے ہیں اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو سارا نظام گڑبڑ ہو جائے گا، کام کے لیے کوئی مزدور نہ ملے گا بادشاہ نے خواجہ عزیزان کو بلایا اور کہا کہ ارے یہ تو بڑا عقلمند ہے ہم تے تو دیوانہ سمجھ کر مذاق کیا تھا۔ الغرض بادشاہ اور مصاحب بھی بیعت ہوئے ہمارے شاہ خالد رومی نے مکہ میں ایک خلیفہ کو اپنی طرف سے رقم بھیجی کہ میں تم کو دینار بھوں گا مگر کسی حاجی سے کچھ نہ لینا کہ ہمارے مشائخؒ پر کوئی ہاتھ نہ اٹھائے اور ان پر حرف نہ آئے، یہ تھے ہمارے اسلاف اور اکابر۔

اولٰئک آبائی فجئنی بمثلھم اذا جمعتنا یا جریر المجامع

جہاں بھی ہمارے بزرگوں نے قدم رکھا وہاں ایک عالم روشن کر دیا ہمارا مقصد بھی خدا کرے کہ صرف رضائے حق، قرب حق و رضائے حق ہو جائے باقی سب چھلکے ہیں۔

ایک سوال کے جواب میں فرمایا: کہ مسجد نبوی کی فضیلت کہ ایک نماز کے عوض ایک ہزار کا ثواب ہے مردوں کے لیے ہے عورتوں کے لیے نہیں ان کے لیے گھر ہی میں نماز پڑھنا افضل ہے خصوصاً اس زمانہ میں جبکہ عورتیں بناؤ سنگھار کر کے اور عطر لگا کر جاتی ہیں تو اور بھی برا ہے، ہاں چونکہ باہر سے دور دراز سے عورتیں سفر کر کے آتی ہیں تو انہیں بھی چاہیئے کہ سادہ اور باپردہ لباس میں جائیں اگر پورے پردے میں جائیں شریعت کی حدود کے اندر رہتی ہیں تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سنت کا اجر اور بدلہ انہیں دے دے۔

فرمایا: عورتوں کا مساجد میں جانا بھی آجکل فیشن بن گیا ہے، مسجد نبوی میں فیشن کر کے جاتی ہیں اور وہاں جا کر باتیں کرتی ہیں اور گپ لگاتی ہیں بلکہ اکثر لوگ آجکل "حج کردن تماشا جہاں بودن"، کا مصداق بن گئے ہیں۔ روح حج کی طرف آج

کل بالکل توجہ نہیں، لوگوں نے اسے سیر و سیاحت بنا لیا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو آداب حج، برکات حج اور صحیح حج نصیب فرمائے۔

ایک مریض کو مخاطب ہو کر فرمایا، اس سفر میں مرض کا آنا تکالیف کا آنا سب کفارہ ہے، ترقی درجات ہے اور یہ تکلیف بھی ضیافت نبوی ہے۔

فرمایا: تصوف کی روح اتباع سنت اور درستگی اخلاق و عبادات ہے میرا ایک رفیق تھا، میں نے اسے ایک دفعہ اسے ڈانٹا اور ناراض ہوا تو اس نے مجھے لکھا کہ تم اچھے اچھے کھانے کھاتے ہو میں نے کہا کہ میرے بزرگ، تصوف خشک کھانے اور تر کھانے کا نام نہیں ہے بلکہ حسن المعاملة مع الخلق والخالق " کا نام ہے کہ مخلوق کو بھی دھوکہ نہ دے اور خالق کو بھی دھوکہ نہ دے آج کل اس چیز کا لحاظ کم ہے لوگ کشف و کرامت، خوارق عادات وجد اور حالات، میں پڑے ہوئے ہیں، ہمارے حضرات خواجہ بہاء الدین نقشبند فرماتے ہیں کہ "کشف را بر کفش زند" یہ سب قشور (چھلکے) ہیں۔ ان کو پھینک دینا چاہیئے۔ مقصد صرف قرب حق رضائے حق رہے اور وہ محصور ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عادات و اطوار میں ہر صورت میں جہاں بھی امکان ہو، معاملات ہوں، عبادات ہوں، اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا ہر چیز میں۔

فرمایا: نظر بر قدم "کے بارہ میں میرے شیخ فرماتے تھے کہ نظر بر قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ سالک کو ہر وقت حضورؐ کے قدم پر نظر رکھنی چاہیئے، عادات، اطوار عبادات، اور معاملات میں۔

فرمایا: ایک شاذلی بزرگ نے فرمایا کہ مدینہ طیبہ کے کسی ایک پتھر کو عقیدت اور محبت سے دیکھنا قطب اور غوث کے دیکھنے سے بہتر ہے۔ حضورؐ کے قدمین شریفین نے ان گلیوں کو مس کیا ہے پھر حضورؐ کی نظر کیمیا اثر سے تو مدینہ کے آس پاس کی کوئی جگہ خالی نہیں رہی، عقیدت اور ادب و احترام کی ضرورت ہے پھر یہاں کوئی شخص خالی نہ جائے گا، سید مصطفےٰ علیہ السلام کا دروازہ تو قیامت تک کھلا ہے جس کا جی چاہے وہ آئے اور لے جائے۔ ع

ایں درگہ ما درگہ نا امیدی نیست

دین اور دنیا دونوں یہاں ملتے ہیں مگر محبت اور عقیدت شرط ہے

فرمایا: ایک دفعہ میں مدینہ طیبہ پیدل آرہا تھا، میرے بھائی مولوی عبدالقیوم صاحب جن کا انتقال ہوچکا ہے اور ایک دوسرے بزرگ مولانا مستجاب خاں چترال والے ساتھ تھے جو صحیح العقیدہ، شب خیز، کم سخن، تہجد گزار ہے، عاشق ہے، حضور کا نام سنتا ہے تو گریہ طاری ہوتا ہے۔ ہم تینوں کا سفر پیدل تھا، جب بیرالشیخ، پہنچے، خادم میں تھا، دونوں کا، مولوی صاحب عمر میں مجھ سے کچھ بڑے تھے یا قریب اور بھائی چھوٹا تھا، مستورہ سے بیرالشیخ تک کی منزل بہت سخت تھی، مولوی صاحب نے کہا تھکاوٹ اور سفر کی خشکی بہت چڑھ گئی ہے، آج ہمارے لیے پلاؤ پکاؤ، پکایا کھا کر سوگئے تو خواب میں دیکھا کہ مسجد نبوی میں حاضر ہوں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما ہیں اور سو رہے ہیں مصافحہ کا خیال آیا مگر آرام کے خیال سے تعرض کرنا مناسب نہ سمجھا اسی درمیان اپنے آپ کو خواب میں دارالشیخ میں دیکھا کہ والدہ بھی ساتھ ہے اور دیکھا کہ حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام وہاں تشریف لائے ہیں شیخین (ابوبکرؓ و عمرؓ) بھی ساتھ ہیں میں نے والدہ سے کہا کہ میری خواہش ہے کہ حضورؐ کو دعوت دوں فرمایا کہ ہزاروں لوگ ہیں، کس کی دعوت قبول فرماویں گے۔؟ میں نے کہا میری دعوت اخلاص کی ہے قبول کریں گے اسی خیال میں تھا کہ جاگ اٹھا وہاں سے ابیار حسانی کی منزل سات آٹھ گھنٹے کی ہے، ہم ذرا دیر سے ظہر کے بعد نکلے چلتے چلتے صبح کا وقت ہوا دیر سے نکلے تھے ابھی منزل آئی نہیں تھی مگر اس وقت اندازہ یہ ہوا کہ منزل تک ۱۵ منٹ کا راستہ ہوگا، بھائی کو میں نے پانی کی مشک اور چھتری دی اور خود استنجا کرتے ٹھہرا، فارغ ہوا، تو غلطی سے دائیں طرف چلنے لگا اور منزل کا راستہ غلط ہوگیا۔ چلتے چلتے دوپہر ہوئی، نہ پانی، نہ چھتری نہ ساتھی، جنگلی راستہ تھا جس میں کسی انسان کی آمد و رفت نہیں تھی اب سمجھا کہ حالت خراب ہے، سخت گرمی کا موسم زندگی سے نا امید ہوا، پیاس بے انتہا تھی خشک لُو اور رات بھر کا چلا ہوا کہ اتنے میں ایک درخت نظر آیا۔

اور خدا شاہد ہے کہ میں اس خیال سے ادھر چلنے لگا کہ وہاں جان دے دوں، کیکر کا درخت تھا جس میں پتے بھی نہ تھے تو زندگی کی ظاہری امید کوئی نہ تھی وہاں پہنچا تو خدا کی شان کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑی اور ٹھنڈی مشک لٹکی ہوئی ہے اور ایک بدو نے پلاؤ کی ایک دیگ چڑھائی ہے اور بار بار کہتا ہے کہ اہلاً وسہلاً مرحباً بضیف رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم (نبی کریمؐ کے مہمان کو خوش آمدید) فوراً پانی نکال کر پلایا اور پلاؤ کی پلیٹ بھر کر میرے سامنے رکھ دی میں سمجھا کہ رحمت کا فرشتہ ہے جسے خدا نے یہاں بھیج دیا ہے پھر اس نے چائے بنا کر پلائی اور کہا کہ دوسری منزل کو ایک گھنٹے کا راستہ ہے پہلی منزل تم نے ختم کر لی ہے اور تمہارے رفیق آدھی رات کو پہنچیں گے اور تم ابھی سے پہنچ گئے ہو اگر یہاں آرام کرنا چاہو تو تمہاری مرضی ورنہ ابھی روانہ ہو کر وہاں سو جاؤ میں احتیاطاً اسی وقت اکیلا روانہ ہوا، شفیعہ منزل پر پہنچا اور وہاں لیٹ گیا صبح اشراق کے وقت ان کا قافلہ آیا - بھائی بھی تھے اور مولانا چترالی بھی، انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا کہ لوگوں نے تمہاری تلاش سے منع کر دیا تھا کہ زندگی ہوئی تو مل جائے گا ورنہ تلاش میں تم بھی ختم ہو جاؤ گے الغرض میں نے بچشم دید واقعہ دیکھا کہ میرے لیے خدا نے جنگل کو منگل بنا دیا میرے پاس کچھ پیسے چار پانچ قرش تھے ساتھیوں کو دینے لگا کہ ان کے ساتھ تھا انہوں نے کہا نہیں تم تو حضور اقدسؐ کے مہمان تھے الغرض یہ سفر آخرت کا سفر ہے تکالیف پیش آتی ہیں جن پر خوشیاں کرے، صبر کرے - اب تو موٹر ہے برف ہے، پانی ہے تربوز تک مل جاتا ہے اور عرفات میں ہر چیز مہیا ہو جاتی ہے اس زمانے میں لوگ منیٰ سے عرفات تک دو تین ریال کا پانی پی لیتے تھے، مولوی لطف اللہ صاحب (حضرت صاحب ملفوظات کے بھتیجے جو سامنے موجود تھے) کے والد صاحب نے ایک دفعہ صرف منیٰ سے عرفات تک ۵ ریال کا پانی خرید کر پیا، ٹھنڈا بھی نہ تھا چھوٹے چھوٹے شربے (مٹی کی چھوٹی سی صراحی) تھے اس وقت لوگ اس سفر میں قدم قدم پر نفل پڑھتے تھے تمام راستہ میں اوراد، اذکار اور تلاوت قرآن کرتے تھے اور ہر چیز کو ذوق شوق سے دیکھتے تھے اب تو لوگوں نے سفر حج کو تجارت بنا دیا - بازاروں میں

ہیں، مقصد ہی بھول گئے اب نہ دعا ہے نہ ذکر و اذکار، نہ تلاوت کچھ وہاں سے لانا اور کچھ یہاں سے نکالنا تو صحیح حج بہت بڑی محنت ہے اور اس زمانہ میں تو یہی حج کی شکل میں جہاد رہ گیا ہے، اب کفار سے جہاد کہاں ؟ اب تو کفار، مشرک، بدعتی سب سے ملتے ہیں ان کی نقلیں صورت سیرت چال ڈھال میں اتارتے ہیں، حرمین میں انگریزی بال، ننگا سر اور نکٹائی، معلوم نہیں کہ یہ کونسا مقام ہے ؟ انبیاء کرام حرم مکی میں داخل ہو کر ادباً مع الحرم اپنے جوتے اتار لیتے تھے ہم تو روضہ شریف تک غلاظتوں سے بھرے ہوئے جوتے لے جاتے ہیں —— اور اصل چیز ادب ہے اللہ تعالےٰ توفیق دے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت، لباس، صورت، سیرت، اخلاق و عادات میں نصیب کرے —— پھر تو مزا ہے نہیں تو کچھ بھی نہیں

الحق
جمادی الثانی ۱۳۸۹ھ

◎

شاہ محمد یعقوب مجدّدی سرہندی

پچھلے ماہ بھارت میں مجدّدی سلسلۂ رشد و ہدایت کا ایک درخشندہ ستارہ (شاہ محمد یعقوب مجدّدی سرہندیؒ)[1] غروب ہو گیا۔ حضرت شاہ صاحب مرحوم موجودہ دور میں خانوادۂ مجدّدیہ کی خصوصیات دعوت و ارشاد کے امین تھے۔ ان کے ارشادات و ملفوظات میں اکابر سلف کی تاثیر، گہرائی اور حکمت و موعظت کا عمیق حکیمانہ رنگ تھا۔ پچھلے دور میں وہ بھوپال میں ہندوستان کے اہلِ علم و دین کا مرجع بن چکے تھے، اور اکابر علم و فضل ان کی مجلس اصلاح اور صحبت سے مستفید ہوتے۔ حق تعالیٰ ان کے فیوضات کو جاری و ساری رکھے اور انہیں مقامات قرب سے نوازے۔

الحق

جولائی ۱۹۷۰ء

---

[1] مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجدّدی کی ولادت ۲۱ شوال ۱۳۰۳ھ کو حضرت پیر ابو احمد کے ہاں ہوئی۔ ۱۳ ربیع الاول ۱۳۹۰ھ مطابق ۲۰ مئی ۱۹۷۰ء کو آپ کا سانحۂ ارتحال پیش آیا۔ تفصیل کے لیے صحبتے با اہلِ دل از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ملاحظہ ہو۔ (مرتب)

مولانا خیر محمد صاحب جالندھریؒ[1]

پاکستان کی سرزمین پچھلے دنوں کئی ایک اکابر علم و فضل سے محروم ہو گئی۔ ۲۲ر اکتوبر کو حضرت العلامہ مولانا خیر محمد صاحب جالندھری مرحوم بانیٔ مدرسہ خیر المدارس ملتان خلیفۂ ارشد حضرت حکیم الامۃ مولانا تھانوی قدس سرہٗ کا سانحۂ وفات پیش آیا۔ مرحوم کی ساری زندگی دین اور علومِ دین کی خدمت میں گذری۔ سلامتِ طبع، میانہ روی، معتدل مزاج، نظم و ضبط وغیرہ صفات میں آپ اپنے پیر و مرشد حضرت تھانویؒ کا نمونہ تھے۔ افتراق و انتشار کے اس گھمبیر ماحول میں بھی آپ حتی الوسع فکری تعصب اور گروہی تخرب سے اپنا دامن بچاتے ہوئے علماءِ حق کے باہمی اتحاد و اتفاق کے لیے کوشاں رہے۔ وہ اُن گنے چنے افراد میں سے تھے جن کی طرف ایسے حالات میں نگاہیں اُٹھتی رہیں تقسیم سے پہلے جالندھر اور بعد میں ملتان میں بیٹھ کر انہوں نے "خیر المدارس" کی شکل میں علومِ نبویہ کی عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ ان کی وفات سے علمی و دینی حلقوں میں جو خلاء پیدا ہو گیا ہے وہ شاید مُدتوں پُر نہ ہو سکے۔

الحق ـــــ نومبر ۱۹۷۰ء

---

[1] سن پیدائش: ۱۸۹۵ء مطابق ۱۳۱۳ھ بمقام عمروال بلہ تحصیل نکودر ضلع جالندھر ـــــ مسلک دیوبند سے منسلکہ مدارس کا وفاق "وفاق المدارس العربیہ" آپ ہی نے قائم کیا تھا ـــــ تاریخ وفات ۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۰ء مطابق ۲۰ر شعبان المعظم ۱۳۹۰ھ ـــــ

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: "بزمِ اشرف کے چراغ" (مرتب)

خطیبِ اعظم مولانا محمد علی جالندھری رحمہ اللہ

فدائے ناموسِ رسالت و مجاہدِ تحفظِ ختمِ نبوت

مولانا محمد علی جالندھری[1] اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جہادِ حریت کا نڈر سپاہی اور عقیدۂ ختمِ نبوت کا جانباز شیدائی اور فدائی بھی ہم سے جدا ہو گیا —— مجلس احرارِ اسلام کی سٹیج ہو یا مجلس تحفظ ختمِ نبوت کی مسندِ امارت، جنگِ آزادی ہو یا تعمیرِ وطن کا کوئی دوسرا موقع، یہ سراپا اخلاص و دردِ مجاہد ہر میدان میں شعلۂ جوّالہ بن کر حق کی حفاظت کے لیے چمکتا رہا۔ آخری زندگی تو عقیدۂ ختمِ نبوت کی حفاظت اور دفاع ہی کے لیے وقف ہو کر رہ گئی تھی، اور یہاں تک کہ جان، جانِ آفرین کو سپرد کرتے وقت آخری الفاظ جو زبان مبارک سے سُنے گئے وہ "اے اللہ "ختمِ نبوت" تھے —— آہ! جانے والے اکابر ہمارے لیے اخلاص، جوشِ عمل،

---

[1] آپ ۱۸۹۵ء کو قصبہ رائے پور آرائیاں ضلع جالندھر میں حاجی محمد ابراہیم کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کا اکثر حصہ آپ نے حضرت مولانا خیر محمد صاحب سے پڑھا سند فراغ امام العصر حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری سے حاصل کی کچھ عرصہ تدریس میں گذار کر مولانا خیر محمد صاحب جالندھری کے ساتھ خیر المدارس کی بنیاد ڈالی۔ مجلس احرارِ اسلام کے سٹیج سے انگریزوں کے خلاف آزادی وطن کی پاداش میں تین سال کے لیے قید کر دیئے گئے۔ ۱۹۴۳ء میں آپ نے جالندھر سے ہجرت کی۔ دیگر افرادِ خاندان تحصیل صادق آباد میں آباد ہوئے، اور آپ نے ملتان کو اپنا مستقر بنا لیا۔ مجلس تحفظِ ختم نبوت کے آپ پہلے ناظمِ اعلیٰ تھے جبکہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری صدر تھے۔ ۱۹۵۳ء میں تحریکِ ختمِ نبوت کے سلسلہ میں دوبارہ پابندِ سلاسل کر دیئے گئے۔ ۱۹۷۰ء میں ختمِ نبوت کا مستقل مشن نائجیریا میں قائم کیا۔ حضرۃ الشیخ عبدالقادر رائے پوری کے دستِ حق پرست پر بیعت تھے —— بالآخر ۲۱ اپریل ۱۹۷۱ء کو دل کا دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔ ع آخر اس بیمارئ دل نے اپنا کام تمام کیا۔ رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ (مرتب)

دینی حمیت، مقصد سے شغف، ولولہ اور سوز اور للّٰہیت کے کیسے کیسے نمونے چھوڑ کر چلے گئے ہیں ـــــ حالیہ انتخابات میں جب ایک سیاسی پارٹی نے ہوس اقتدار میں چند قادیانیوں کو بھی اپنی پارٹی ٹکٹ پر نامزد کیا تو مولانا بے چین اور مضطرب ہوکر میدان میں کود پڑے اور رمضان کا سارا مہینہ ایک ایک حلقہ میں جاکر مسلمانوں کو خطرہ سے آگاہ کرنے میں بسر کیا۔ پھر جب تسلی ہوئی کہ اللہ نے ایسے تمام نمائندوں کو خائب و خاسر بنا کر ناکام کیا اور کوئی قادیانی مجلس قانون ساز میں نہیں پہنچ سکا تو یہ مژدہ پوری قوم کو سنا کر اطمینان کا سانس لیا۔ ابھی مولانا کی شدید ضرورت ضرورت تھی اور کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا اتنے جلد اور ایسے نازک موقع پر وہ ہم سے جدا ہوں گے، مگر مرضیٔ مولیٰ کے سامنے کس کی چلتی ہے۔ مولانا ہم سے جدا ہو گئے مگر اپنے پیچھے علم و عمل، جہاد اور جہد کا ایک نورانی دفتر چھوڑ کر گئے۔

ختم نبوت کی صدا انہوں نے یورپ اور افریقہ کے ایوانوں تک پہنچا دی۔ اب یہ کام پیچھے رہنے والے تمام معتقدین، احباب اور بالخصوص ان کی محبوب جماعت تحفظ ختم نبوت کا ہے کہ ان کا محبوب مشن دفاع و اشاعت ختم نبوت کو اور بڑھا چڑھا کر مولائے ختم المرسلین علیہ السلام کی خوشنودی اور اپنے قائد مولانا محمد علی جالندھری کی روح کی ٹھنڈک کا سامان کریں۔

واللہ یوفقنا و ایّاھم ورحم اللہ الفقیدَ فقیدَ الاسلام والمسلمین۔

◎

مولانا عبدالشکور بھبودی ــــ مولانا سیّد طلحہ رحمہم اللہ

جانے والے قدسی صفات بزرگوں میں حضرت مولانا عبدالشکور صاحب بہبودی ضلع کیمبلپور بھی ہیں اخلاص، سادگی اور بے تکلفی اور زہد و تقویٰ کا چلتا پھرتا نمونہ جیّد عالم اور خوش بیان مقرر، زندگی ساری درس و تدریس اور وعظ و تبلیغ میں گذری تقسیم سے پہلے مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور اور بعد میں پاکستان کے کئی مدارس میں پڑھاتے رہے۔ پچھلے کئی دنوں سے بیمار تھے اور راولپنڈی میں زیر علاج رہے۔ ۲۵ ستمبر کو نماز جمعہ کے بعد واصل بحق ہوئے۔ جسدِ مبارک کو آبائی گاؤں بہبودی لایا گیا۔ دوسرے دن صبح ۱۰ بجے آغوشِ رحمت کے سپرد کیے گئے۔ نماز جنازہ حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ نے پڑھائی اور سینکڑوں علماء و صلحاء اس میں شریک ہوئے۔

عالم آخرت کے ان مسافروں میں ایک اور بزرگ حضرت مولانا سیّد طلحہ[1] تھے جن کا انتقال اسی تاریخ کو کراچی میں ہوا۔ جدید و قدیم علوم کے مایۂ ناز عالم اور عربی علوم و ادب میں اپنی نظیر آپ تھے۔ ایسی جامع شخصیتیں اس دور میں ملنی مشکل ہیں۔ حق تعالیٰ سب کو اپنی رحمت، مغفرت اور بہترین مقاماتِ قرب سے مالامال کرے اور ملتِ مسلمہ کو ان سب کا بہترین بدل عطا فرماوے۔ آمین

الحق ــــ رمضان ۱۳۹۰ھ

---

[1] تفصیلی حالات کیلئے ملاحظہ ہو "پرانے چراغ" از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (مرتب)

مولانا مشاہد علیؒ کی وفات

پاک و ہند کے مایۂ ناز عالم دین حضرت مولانا مشاہد علی صاحب جلال آبادی ۱۰ فروری کو حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مولانا مرحوم نے دارالعلوم دیوبند اور سہارنپور میں تعلیم حاصل کی۔ پھر اپنے وطن کنائی گھاٹ میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور وہیں دین کی خدمت کر رہے تھے۔ بہت بڑے محدث اور بزرگ تھے، معتمد علیہ لیڈر تھے، علوم دینیہ میں گویا یکتائے زمان تھے۔ آپ کی رحلت ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خلاء کو پُر کر دے۔

آپ کی رحلت کی خبر ملتے ہی دفتر صوبائی جمعیۃ علماء اسلام مشرقی پاکستان میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا، جس میں مرحوم کے اہل و عیال سے تعزیت اور مرحوم کی مغفرت کے لیے دُعا کی گئی۔

الحق
مارچ ۱۹۷۱ء
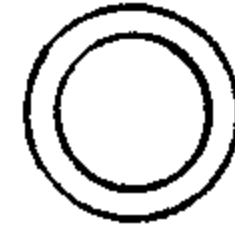
مولانا سیّد محمود احمد مہاجر مدنی رحمہ اللہ

مدینہ منورہ سے حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کے برادر اصغر حضرت مولانا سید محمود[1] صاحب کے سانحہ ارتحال کی اطلاع علمی و دینی حلقوں کے لیے رنجدہ ہے۔ شیخ مدنیؒ کے والد بزرگوار نے جس قافلہ شوق کے ساتھ دیار حبیب میں بسیرا کیا تھا حضرت سید محمود احمدؒ اس کے آخری نشان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دین کے ساتھ دنیا کے مناصب اور مفاخر سے بھی نوازا تھا، اعلیٰ صفات کے مالک تھے۔ حق تعالیٰ اپنے مثالی خاندان کے زمرۂ صالحین میں شمار کرادے اور درجاتِ عالیہ نصیب ہوں۔ ادارہ الحق اور دارالعلوم حقانیہ حضرت مرحوم کے تمام خاندان بالخصوص صاحبزادہ مولانا محمد اسعد مدنی اور مولانا محمد ارشد مدنی دیوبند کے ساتھ اس غم میں شریک ہے۔

الحق ـــــ جولائی ۱۹۷۱ء

---

[1] آپ کے بارے میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں ـــــ "محمود احمد سلمہ اللہ تعالیٰ ۱۳۰۶ھ شوال میں اللہ داد پور میں پیدا ہوئے۔ ہجرت کے وقت آٹھ برس کی عمر تھی معمولی اردو وغیرہ پڑھتے تھے۔ مدینہ منورہ میں ان کو بھی ترکی مدرسہ میں داخل کر دیا گیا۔ جملہ درجات میں کامیابی کے بعد عثمان پاشا مرحوم نے ان لڑکوں کو جو درجہ علیا میں پاس کر چکے تھے، استنبول نہیں بھیجا بلکہ مختلف اداروں میں بطور امیدوار داخل کر دیا۔ چنانچہ عزیزم محمود احمد سلمہ کو محکمہ قضا میں داخل کر دیا ـــــ چونکہ ایام ملازمت میں حکومتِ وقت کو ان کی استعداد و قابلیت بہت اطمینان بخش ثابت ہوئی تھی اس لیے حکومتِ مدینہ منورہ متعدد اہم محکموں میں ان کا وجود ضروری سمجھتی رہتی ہے ـــــ ایک لڑکا حبیب اللہ اور چند لڑکیاں ہیں۔ حبیب اللہ ہی اس وقت مدرسہ شرعیہ کا مہتمم اور نگران ہے ـــــ"

(نقشِ حیات، جلد اوّل، صفحہ ۳۰ ـــــ مرتب)

عارف باللہ شاہ عبدالقادر رائپوری رحمہ اللہ

برصغیر[1] پاک و ہند کی ممتاز دینی اور روحانی شخصیت عارف باللہ جامع شریعت و طریقت حضرت شاہ عبدالقادر[2] رائپوری قدس سرہٗ کے وصال کو نو دس سال گذر چکے ہیں مگر یہ بحث اب بھی زور شور سے از سرِ نو اٹھائی جا رہی ہے کہ حضرتؒ کی تدفین شریعتِ اسلامیہ کے مطابق ہوئی یا نہیں ؟ فتووٴں کا بازار گرم ہے، طرفین دادِ تحقیق دے رہے ہیں، ضمیمے اور کتابچے نکل رہے ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

کسی قوم کی بدنصیبی اور انتہائی انحطاط کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ عین اُس وقت جب کہ علمی اور عملی فتنے طوفان کی طرح چھا چکے ہوں ضعف و ادبار پوری امت کو گھیرے ہوئے ہو، اس امت کے خواص و اعیان اور اکابر علم و فکر پوری

---

[1] گو کہ یہ شذرہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات وغیرہ پر مشتمل نہیں لیکن دینیات سے متعلق ہونے کے باعث شاملِ کتاب کیا جا رہا ہے۔ یہ نقشِ آغاز مولانائے محترم نے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے کافی عرصہ بعد ان کی تدفین کے بارے میں پیدا شدہ صورتِ حال کے پس منظر میں لکھا۔ اس سے کسی فریق کی تائید مقصود ہے نہ کسی پر تنقید، بلکہ حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر اس قسم کی لایعنی بحثوں سے گریز اور جادۂ اعتدال پر چلنے کی تلقین کی گئی ہے۔ (مرتب)

[2] آپ کی ولادت ۱۲۹۵ھ موضع ڈھڈیاں ضلع سرگودھا میں مولانا حافظ احمد کے ہاں ہوئی، اپنے تایا مولانا کلیم اللہ سے حفظِ قرآنِ پاک کیا اور انہی سے فارسی کے چند رسائل پڑھے، اس کے بعد تکمیلِ علوم اور دورہ حدیث کے لیے ہندوستان تشریف لے گئے، وہاں پر رامپور، پانی پت، سہارنپور اور دہلی کے مقامات پر قیام کر کے درسِ نظامی سے فراغت حاصل کی اور حدیث کی کتابیں مدرسہ عبدالرب دہلی

(بقیہ حاشیہ ص ۸۸ پر)

قوتوں کے ساتھ ایسے لایعنی مباحث اور دوراز کار قیل و قال اور بحث و جدال میں مصروف ہو جائیں جن پر نہ دین کا کوئی مدار ہو نہ کوئی دُنیاوی نفع۔

کلیسا پر جب خدا کی تلوار پوری طرح مسلّط ہو چکی تھی تو کلیسائیت کے علمبردار آپس میں اس مسئلہ پر برسرِ پیکار تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے (بزعم ان کے) سُولی پر چڑھنے سے پہلے کون سی غذا کھائی تھی ـــــ ہزاروں افراد اس اختلاف میں تہ تیغ ہوئے ـــــ

یہی حالت مسلمانوں کی اُس وقت تھی جب فتنۂ تاتار پورے عالمِ اسلام کو للکار رہا تھا اور ہلاکو کی فوجیں دار الخلافت بغداد کے دروازوں پر دستک دے رہی تھیں اُدھر بغداد کے گلی کوچوں میں مناظروں کا بازار گرم تھا، غیر ضروری مسائل پر علم و فکر کی ساری توانائی صرف ہو رہی تھی، دشمن کی بجائے فروعی مسائل نشانۂ تحقیق بنے ہوئے تھے۔

موجودہ پُر آشوب دور نگاہوں میں رکھیے، پھر اس میں دین اور اہلِ دین کے خلاف اہلِ فتن و الحاد کی متحدہ فتنہ سامانیاں دیکھیے، فکرِ آخرت سے آزادی، مغربیت اور اباحیت میں انہماک، علمی اور دینی فتنوں کی یلغار، مادہ پرستی کا ہنگامہ، نئے نئے علمی اور فکری مسائل کا چیلنج اور اس کے مقابلہ میں دین اور اہلِ دین کی غربت اور تشتت و انتشار کا سوچئے، پھر عصرِ حاضر کے تقاضوں کے سامنے اہلِ دین کی مسئولیت اور ذمہ داریوں کی نزاکت پر بھی ایک نگاہ ڈالیے اور مذکورۃ الصدر لاطائل مسئلہ پر اتنا شور و ہنگامہ ـــــ؟ بجا طور پر حیرت، تعجب اور افسوس و حسرت کی ملی جُلی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ زمانہ قیامت کی چال چل رہا ہے، حالات ہمیں جھنجھوڑ رہے ہیں۔ دین اور اصولِ دین کے خلاف خفیہ کمین گاہوں میں کونسا اسلحہ

(بقیہ حاشیہ ص۸۷ سے)

میں مولانا عبد العلی سے پڑھیں۔ دورانِ قیامِ دہلی آپ نے علامہ انور شاہ کشمیری (رحمۃ اللہ علیہ) کے درس میں حاضر ہو کر ترمذی شریف کے چند اسباق کی سماعت کی۔ ۱۴ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ کو لاہور میں آپ کا انتقال ہوا اور پنجشنبہ و جمعہ کی درمیانی شب ڈھڈیاں شریف کی جامع مسجد کے پہلو میں سحری کے وقت دفن کر دیئے گئے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:۔

سوانح شاہ عبد القادر رائے پوری۔ از مولانا ابوالحسن علی ندوی ـــ (مرتب)

ہے جو جمع نہیں کیا جارہا ــــــ؟ ملک کے دینی اور سیاسی مستقبل کے فیصلے ہو رہے ہیں، ایسے حالات میں ہماری توجہ اور اہتمام کا مستحق الاھم فالاھم کی بنا پر کون سے مسائل ہونے چاہئیں تھے۔؟ اور ہماری مصروفیات کا محور کیا ہونا چاہیئے؟ ہمیں اپنی انفرادی اور اجتماعی قوت فکری صلاحیت اور علمی استعداد کن امور میں لگانی ہے؟ یہ تمام باتیں علماء امت، اعیانِ ملت اور اصحابِ دعوت وعزیمت کے لیے دعوتِ فکر دے رہی ہیں۔

فطری طور پر یہ ناخوشگوار تاثر اور تلخ احساس ہر درد مند مسلمان کا ہو سکتا ہے جو ایک ایسے مسئلہ پر علماء ومشاہیرِ ملت کو باہمی بحث وجدال میں مصروف دیکھتے ہیں جس پر نہ تو دین کے کسی بنیادی مسئلہ کا مدار ہے نہ اس سے مسلمانوں کا کوئی اجتماعی مفاد وابستہ ہے اور نہ ہی وہ ہماری کسی ترقی وخوشحالی کا ذریعہ بن سکتا ہے، اور نہ اسے موجودہ حالات اور زمانہ سے کوئی مناسبت یا مطابقت ہے بلکہ الٹا ہماری علمی کم نگاہی، دینی بے بصیرتی اور اجتماعی بدقسمتی کی دلیل بنائی جاسکتی ہے۔ پھر یہ بدقسمتی نہیں تو کیا ہے کہ اس نے پورے برصغیر کے ایک برگزیدہ فعال علمی ودینی طبقہ اور اکابر علماء کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ پھر دونوں فریق میں اصولی طور سے وجہ نزاع بھی کوئی بات نہیں، جو لوگ حضرتؒ کے مزار کو موجودہ شکل میں قائم رکھنا چاہتے ہیں انہیں بھی اعتراف ہے کہ تدفین مسنون اور متوارث صورت میں نہیں ہوئی مگر بوجوہ واعذار ہوئی اس لیے متحقق ہو چکی ہے۔ جن حضرات کو قبر پر اعتراض ہے وہ بھی نبش (قبر کھولنے) اور اسے دوسری جگہ منتقل کرنے کو جائز نہیں کہہ سکتے۔ پھر اس مسئلہ کو ایک دوسرے کی نیات اور عزائم پر بدگمانی اور باہمی اختلاف وافتراق کا ذریعہ بنانا سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔

الحق؛ ایسے مباحث اور نازک موضوع پر بحث کا نہ تو روادار ہے نہ راقم الحروف کی علمی بساط اور بے بضاعتی اس کی اجازت دیتی ہے، مگر طرفین کے اکابر اور ایک بہت بڑی تعداد کے اصرار پر بادلِ نخواستہ اس موضوع پر قلم اٹھایا گیا ہے، ورنہ صحیح بات یہ ہے کہ ایسے نادرۂ روزگار اور سرمایۂ افتخار بزرگؒ کی مرقد مبارک کو اتنے عرصہ بعد زیرِ بحث بنا رکھنے پر بھی جبینِ غیرت پسینہ پسینہ ہو رہی ہے۔ مجھے حضرت کے اجلہ خلفاؒ

اور متوسلین کی اس جرأت پر حیرت ہے کہ وہ ایک ایسے بزرگ کی قبر اور برزخی زندگی کو اس حد تک بحث وجدال کا ذریعہ بنا رہے ہیں جن کی مجموعی زندگی پر حیاء اور اخفاء کی شان غالب تھی۔ کیا ہم اپنے خاندان کے کسی بزرگ کی قبر کھودنے اور دوبارہ نکالنے نہ نکالنے کے موضوع کو بے حرمتی اور احساسِ عظمت سے عاری ہونے کا سبب سمجھ کر اس پر ناگواری ظاہر کریں گے یا نہیں ؟

حضرتؒ جن کی زندگی کا ہر لمحہ اللہ اور ہر لحظہ خلق خدا کی ہدایت میں صرف ہوا ــــ ۱۶ اگست ۱۹۶۲ء کو لاہور میں واصل بحق ہوئے جب کہ آپ اپنے وطنِ اقامت رائپور (بھارت) اور وطنِ اصلی (ڈھڈیاں ضلع سرگودھا) سے دُور تھے۔ تدفین کے بارہ میں تین تجاویز تھیں (۱) یا تو شریعت کی رُوح اور مزاج کے مطابق وہیں لاہور ہی میں دفن ہوں۔ (۲) دوسری رائے حضرتؒ کی خواہش (مگر اس کے ساتھ بارہا یہ وصیت بھی تھی کہ جہاں وصال ہو وہاں دفن کیا جائے) کے مطابق رائے پور لے جا کر اپنے شیخؒ کے قدموں میں دفنانے کی تھی۔ (۳) تیسری رائے حضرتؒ کے شرعی ورثاء و اولیاء کی تھی کہ آبائی گاؤں ڈھڈیاں میں تدفین عمل میں آئے ـــــ پہلی رائے پر عمل نہ ہو سکنے کا وبال بعد میں پوری جماعت کی فکری پریشانی اور انتشار کی شکل میں ظاہر ہوا، اور فیصلہ تیسری رائے پر ہو گیا ـــــ ڈھڈیاں کی زمین نمناک تھی مسجد کے قریب خطہ جسے مٹی سے پاٹ کر سطح مسجد کے برابر کرانا طے ہو چکا تھا، اس میں بجائے زمین کھودنے کے شق کی شکل میں دیواریں چن لی گئیں اور تابوت مبارک رکھ کر چاروں طرف سے زمین کو مٹی سے سطح مسجد کے برابر پاٹ دیا گیا اور تابوت مع شق بالائی سطح سے دو تین فٹ نیچے ہو گیا اور اوپر قبر کا کوہان نما نشان بنایا گیا۔ اس طرح قبر جو وجہ الارض پر تھی بناء سمیت بطن الارض ہو گئی۔

اس کے بعد پریس اور علمی و دینی حلقوں میں یہ بحث چھڑ گئی کہ تدفین مسنون طریقہ (قبر کھود کر دفن کرنے) سے نہیں ہوئی اس لیے دوبارہ نبش (قبر کھولنا) اور دفن ہونا چاہیئے۔ مسئلہ نے شدت اختیار کی تو بعض حضرات کے استفسار پر برصغیر کے ان تمام اجلۂ علم اور

اصحابِ تحقیق وتقویٰ حضرات نے متفقہ فتویٰ دیا کہ موجودہ شکل گو متوارث اور مسنون طریقۂ دفن کے خلاف ہوا مگر اب تدفین متحقق ہوچکی ہے۔ اس لیے قبر کھول کر میت کی دوبارہ تدفین یا کسی دوسری جگہ (دوسرا فریق اب بھی چاہتا ہے کہ ایک دفعہ کھول کر اسے رائے پور ہی لے جایا جائے ورنہ اسی جگہ دوسرے مقام پر تدفین کی کوئی تجویز بھی ان کی طرف سے سامنے آئی ہوتی) منتقل کرنا حرام ہے۔ اس فتویٰ پر برصغیر کے ان اکثر مشاہیر محدثین، فقہاء اور علماء کے دستخط ہیں جن کا علمی تبحر اور للّٰہیت ضرب المثل ہے۔ اور انہیں دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ گویا وقت کا یہ متنازعہ مسئلہ اجماع کے طور پر طے کر لیا گیا ہے اور اب اس اجماع کا "خرق" بلاوجہ ایک جراٴت ہے ـــــ یہ فتویٰ فقہاء کی ان واضح تصریحات پر مبنی تھا کہ تدفین میں بڑی سے بڑی مخالفِ سنت چیز بھی آجائے مثلاً میت قبلہ رخ نہ رکھی گئی ہو یا بائیں کروٹ پر ہو یا اس کا سر پاؤں کی جگہ ہو یا غسل اور نمازِ جنازہ جو میّت کا ایک حق واجب اور امّت پر فرض کفایہ ہے، اگر کسی وجہ سے غسل یا نمازِ جنازہ بھی رہ جائے تب بھی نبش یعنی کھولنا جائز نہیں۔ اندر کی حالت عالم الغیب والسرائر کے سامنے ہے۔ بلا کسی شدید مجبوری کے اسے کھولنا اور ٹٹولنا شرفِ انسانیت کی رعایت کے خلاف ہے۔

الغرض یہ مسئلہ ایسا نظری اور پیچیدہ نہ تھا جو جادۂ حق و اعتدال پر ہر حالت میں قائم رہنے والی ایک جماعت "علماء دیوبند" کے لیے اس حد تک وجہ نزاع بن جاتا۔ ایک ایسی جماعت کے سامنے اپنے مسلکِ حق کا مزاج عمومی اور برزخ و عالمِ برزخ کے بارہ میں سلف کا محتاط رویہ اور تعلیمات ہوں جس کے ہاں اصل زور رسوم و آثار پر نہیں معنوی کمالات اور روحانی مقامات پر دیا جاتا ہو، قبر پرستی اور مظاہر پرستی سے نفور میں ضرب المثل ہو۔ بچھڑ جانے والے مرحوم اکابر کی عظمت وحرمت اور آداب کی رعایت میں بھی اس جماعت کا رویّہ مثالی رہا ہو، ایک ایسی جماعت کے ہاں ایسے دور از کار موضوع پر شورو ہنگامہ، فتویٰ اور جواب فتویٰ، رسائل اور ضمیموں کی بھرمار اس طبقہ کے عمومی مزاج اور پوری تاریخ سے بے جوڑ سی بات ہے، جبکہ اس مسئلہ کو بار بار اٹھانے سے فکری و علمی مفاسد کے علاوہ مقامی طور پر کسی بڑے فتنہ و فساد کا بھی اندیشہ ہے۔ والفتنة اشدّ من القتل۔

اس لیے اپنی کم مائیگی اور تہی دامنی کے پورے احساس اور دونوں طرف کے اکابر کی عظمت وادب کا پورا استحضار رکھتے ہوئے ان اکابر کے مجموعی اصابتِ فکر، سلامت روی، طلبِ حق اور خشیۃ واخلاص اور طریقِ حکمت وموعظت جیسی اعلیٰ صفات کی امید پر اتنا عرض کرنے کی جسارت کی جارہی ہے کہ للّٰہ اس مسئلہ کو تقدیرِ الٰہی سمجھ کر یہیں ختم کردیا جائے۔ حضرتؒ کی تدفین جہاں مقدر تھی ہوچکی، اب وہ ملاءِ اعلیٰ اور اعلیٰ علیین میں آسودۂ استراحت ہیں (ان شاء اللہ) اب اصلاح ذات البین اور رفع نزاع کی نیت سے، اپنے جذبات عقیدت کو قابو میں رکھ کر حضرتؒ کے مزار کو موجودہ حالت میں رہنے دیا جائے اور اس موضوع کو مزید علمی جولانیٔ طبع کا میدان نہ بنایا جائے، ورنہ احتمال ہے کہ آگے چل کر یہ چیز دین سے بیزار طبیعتوں کے لیے استخفاف اور استہزاء کا ذریعہ بن جائے ولا فعلہا اللہ دینی حمیت اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے متوارث اور مسنون طریقوں کی حفاظت وتحفظ کے لیے اس سے بہتر اور ہزارہا اہم تقاضے اور مصارف موجود ہیں۔ ہمیں اپنی پوری طاقت وقوت اُمت کے اُن مسائل پر لگانی چاہیئے جن پر نہ صرف پوری امت بلکہ دین کی بقاء اور ترقی کا انحصار ہے۔ اس طرح خدا کی رحمت اور تائید ہمارے ساتھ ہوگی۔ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم۔ ان گذارشات سے ہرگز بھی کسی گروہ کی طرفداری یا کسی کی دلآزاری مقصود نہیں ایک نیازمندانہ گذارش ہے اور اکابر کی توجہ کی مستحق۔

الحق جمادی الاولی ۱۳۹۱ھ

اگست ۱۹۷۱ء

مولانا مجیب اللہ لسوندیؒ

استاذ العلماء حضرت مولانا مجیب اللہ لسوندی خطیب جنوبی وزیرستان ۱۲/ جون ۱۹۷۱ء قبل از نمازِ عصر مقام زیارت بدر تحیۃ الوضوء پڑھتے ہوئے انتقال فرماگئے۔
مرحوم پشتو، فارسی کے مشہور شاعر و ادیب تھے۔ تحریکِ آزادی اور غازی امان اللہ خان مرحوم کے بارہ میں انقلابی نظمیں لکھیں۔ ان کی وفات سے وزیرستان کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے۔ قارئینِ الحق سے رفع درجات کی دعا ہے۔

الحق
اکتوبر ۱۹۷۱ء

◎

صاحبحق صاحب چکیسرؒ

۲۱ رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ کو ضلع سوات اور کوہستانی علاقہ کے مشہور جیّد عالم و فاضل بزرگ شخصیّت استاذ الاساتذہ مولانا محمد نذیر صاحب المعروف بہ صاحبحق صاحب چکیسر واصل بحق ہوئے ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

مولانا مرحوم پر ۱۹ رمضان کو بعد از نماز ظہر تلاوت قرآن مجید کے دوران اچانک فالج کا اثر ہوا جو بڑھتے بڑھتے شام تک بے ہوشی پر منتج ہوا ۔ مرحوم کو ہوش میں لانے کی تمام تدابیر اختیار کی گئیں مگر کارگر ثابت نہ ہوئیں ۔ چونتیس گھنٹے کی بے ہوشی کے بعد اکیسویں روزے کی صبح صادق یعنی نور کے تڑکے سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل آسمان علم وفضل کا یہ چمکتا ہوا ستارہ غروب ہوگیا ۔

حضرت مولانا مرحوم کی عمر غالباً ایک سو برس کے قریب تھی ۔ ساری زندگی علوم و فنون کی خدمت اور درس و تدریس میں صرف کی ہر جگہ مرجع علماء و طلباء رہے ، آپ نہ صرف سرحد بلکہ افغانستان وغیرہ کے بہت سے مشاہیر علماء کے استاد تھے ۔ دار العلوم حقانیہ کے بانی و شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق مدظلہ نے بھی زمانۂ قیام طالب العلمی دیوبند سے قبل چند ماہ تک ، ملاحسن نامی کتاب میں کچھ اسباق آپ سے پڑھے جب کہ آپ اس وقت موضع گوجر گڑھی میں مقیم تھے ۔

مرحوم زہد و ریاضت تقویٰ اور سادگی کا چلتا پھرتا نمونہ تھے ۔ سلسلہ طریقت میں نقشبندیہ کے مشہور بزرگ مولانا عبدالمالک صدیقی مدظلہ کے خلیفہ تھے ، آپ نے اپنے آبائی وطن چکیسر (سوات) کے علاوہ مختلف مقامات پر تدریس کی ۔ اسی طرح دار العلوم اسلامیہ سیدو شریف سوات میں ۱۸ سال مدرسہ نعمانیہ اتمانزئی چارسدہ میں

ایک ایک سال دارالعلوم اسلامیہ شیر گڑھ میں ایک سال مدرسہ اسلامیہ عالیہ پیر بابا[1] بونیر میں چند مہینے تدریس کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہے۔ عمر کے آخری دو سال گھر میں گذارے، اس دوران اپنے گاؤں میں ایک مدرسہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی جو اس وقت ان کے بڑے صاحبزادہ مولانا عنایت اللہ صاحب کے زیر اہتمام چل رہا ہے۔ حضرت مرحوم کی نماز جنازہ ۲۱ رمضان کو تین بجے حضرت کے فرزند مولانا عنایت اللہ نے پڑھائی جس میں مسلمانوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی اور یوں یہ عظیم علمی شخصیت جو گمنامی اور قناعت پسند طبیعت کی مالک تھی، پون صدی تک علم اور دین کی اشاعت کے بعد دنیا سے روپوش ہوگئی۔ آپ نے اپنے پیچھے دو صاحبزادگان مولانا عنایت اللہ صاحب و مولانا کفایت اللہ صاحب چھوڑے۔ ادارۂ الحق اور دارالعلوم اس علمی سانحہ میں تمام اہل علم اور پسماندگان سے تعزیت کرتے ہوئے مولانا مرحوم کے رفع درجات کا متمنی ہے۔

الحق
دسمبر ۱۹۷۱ء

---

[1] مرحوم کی تصانیف میں حاشیہ قاضی محمد مبارک عمدۃ الحواشی اور شرح مسلم العلوم مسمّٰی بکشف الظلم شائع شدہ ہیں۔ علاوہ ازیں بیضاوی و مسلم الثبوت اور دیگر کتب پر آپ کی تقاریر غیر مطبوعہ شکل میں شاگردوں کے پاس محفوظ ہیں۔ علوم معقول میں مکمل دسترس حاصل کرنے کے لئے طلباء اکثر وہاں چکیسر جاتے ہیں۔ اور راستہ دشوار گذار سنگلاخ اور سلسلہ کوہ ہونے کے باوجود شائقین کا جم غفیر موجود ہوتا ہے۔ (مرتب)

مولانا فخر الدین مراد آبادیؒ
شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند

ایک اخبار سے آل انڈیا ریڈیو کے حوالہ سے معلوم ہوا ہے کہ رونق آرائے مسند دار الحدیث دیوبند شیخ المحدثین بقیۃ السلف مولانا سید فخر الدین احمد مراد آبادی پچھلے ماہ واصل بحق ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دار العلوم کی وہ آخری شمع بھی بجھ گئی جس کے انوار دار الحدیث سے نکل کر اکناف عالم کو منور کر رہے تھے۔ بظاہر اب صدارت دار العلوم کی وہ مسند علم و فضل خالی ہو گئی جو ہمیشہ سے اپنے دور کے ہمہ صفات موصوف شخصیتوں کے لئے مختص رہی مولانا مرحوم کی ولادت ۱۳۰۷ھ میں بمقام اجمیر ہوئی۔ ابتدائی تعلیم خاندانی بزرگوں سے پائی۔ پھر گلاؤٹھی اور دہلی سے ہوتے ہوئے شوال ۱۳۲۶ھ میں مرکز علوم دیوبند میں داخل ہوئے، حضرت شیخ الہندؒ سے دورۂ حدیث پڑھا پھر ان ہی اکابر کے حکم پر ۱۳۲۹ھ میں مدرسہ شاہی مراد آباد میں تدریس شروع کی، تعمیل ارشاد ہی کی خاطر بڑی سے بڑی تنخواہ کو ٹھکرایا مگر اس مدرسہ کو نہ چھوڑا۔ اس دور میں تدریس کے علاوہ باطل مذاہب کے تعاقب اور مناظرہ میں بھی میدان ان کے ہاتھ رہتا۔

۱۳ھ میں شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ نینی جیل گئے تو انہیں جانشین بنا کر دار العلوم بلایا اور بخاری کا درس دیتے رہے۔ ۱۹۴۵ء کے الیکشن میں بھی حضرت شیخ الاسلام مرحوم کی قائمقامی کا شرف پایا۔ پھر ان کے وصال کے بعد ۱۳۷۷ھ سے لے کر وفات تک دار العلوم کے شیخ الحدیث اور صدر رہے، ۱۳۷۷ھ سے صرف ۱۳۸۲ھ تک آپ سے ۱۱۶۱ طلبہ نے بخاری شریف پڑھی، زہد و ورع، اخلاص و للّٰہیت فقاہت

تبحرّ اور اتباع سنت جیسی صفات عالیہ کی بنا پر اہل علم کے مرجع رہے۔

۱۹۶۱ء میں ہفتہ عشرہ کے لئے ناچیز کا دیوبند جانا ہوا، تو دو ایک روز درس بخاری کی شرکت کی سعادت بھی پائی، حضرت شیخ مدنیؒ کی مدنی منزل میں جہاں حضرتؒ مستقل مقیم تھے، حضرت کا قرب ملا۔ اور اس اثناء میں میری خواہش پر تبرکاً سند حدیث سے بھی سرفرازی بخشی اور مولانا اسعد مدنی مدظلہٗ وغیرہ کی موجودگی میں ناچیز اور رفیق سفر مولانا عبداللہ کاکاخیل کو تبرکاً بخاری شریف شروع کرائی۔ سیاسی زندگی میں حضرت شیخ الاسلامؒ کے ہم مسلک وہم مشرب رہے اور اس راہ میں قید وبند کی صعوبتیں اٹھائیں حضرت شیخ الاسلام کے بعد جمعیۃ العلماء ہند کے صدر رہے۔ ظاہر بھی باطن جیسا تابناک اور تابدار تھا۔ نور مجسّم دکھائی دیتے، افسوس کہ آپ کی جدائی[۱] سے گلشن علم و دین دارالعلوم دیوبند کے خزاں میں اور بھی اضافہ ہو گیا؎

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

الحق
مئی ۱۹۷۲ء

◎

---

[۱] حضرتؒ کی تصانیف میں القول الفصیح فیما یتعلق بنقد ابواب الصحیح۔ کتاب التراجم ۳۔ اربعین۔ ۴۔ ایضاح البخاری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ آپکا وصال ۵ اپریل ۱۹۷۲ء کو ہوا۔ (مرتب)

مولانا حبیب اللہ لاہوریؒ ــــ مولانا عبدالرحیم تھانویؒ

مکہ معظمہ میں شیخِ وقت مجاہدِ جلیل عارف باللہ مولانا احمد علی لاہوری مرحوم کے فرزندِ اکبر مولانا حبیب اللہ[1] مہاجر حرمین کا انتقال ہوا۔ مولانا مرحوم اپنے اولوالعزم والدؒ کی طرح زہد و ورع، فقر و استغناء، توکل اور ریاضت کے عجیب مقامات پر فائز تھے۔ درویشی اور متوکلانہ زندگی کے عجیب نمونے اس دورِ پرفتن میں قائم کیے۔ تقریباً ۲۰ سال مشقتوں سے بھری زندگی جوارِ حرمین میں گذاری اور اسی حال میں واصل بحق ہوئے۔ حضرت لاہوریؒ کے خاندان کا یہ گلِ سرسبد اپنے والدِ بزرگوار کی طرح طلبگارانِ راہِ حق کے لیے مشعلِ ہدایت رہے گا ــــ

ــــ اسی ماہ لاہور ہی کے ایک نوجوان صالح حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب کا بھی انتقال ہوا۔ یہ اپنے وقت کے جنید شیخ طریقت و شریعت مولانا مفتی محمد حسن امرتسری مرحوم بانی جامعہ اشرفیہ کے خلف صالح تھے۔ اخلاص محبت اور شرافت کے پیکر ــــ اس مرگِ جواں سالی پر کون سی آنکھ ہے جو اشکبار نہ ہو۔ دارالعلوم حقانیہ، ادارۂ الحق ہر دو مرحومین کے رفعِ درجات کا متمنی ہے اور غمزدہ خاندان کے افراد سے برابر کا شریکِ غم ہے۔

الحق ــــ اگست ۱۹۶۲ء

---

[1] سن پیدائش: ۱۹۱۶ء دہلی۔ سن فراغت: ۱۹۳۷ء دارالعلوم دیوبند ــــ ۱۹۴۶ء میں سب سے پہلے حضرت لاہوریؒ نے آپ کو خلعتِ خلافت سے نوازا، ۲۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو حجازِ مقدس ہجرت فرمائی ــــ تاریخ وفات: ۹ جمادی الثانی ۱۳۹۲ھ مطابق ۲۰ جولائی ۱۹۷۲ء مکہ مکرمہ میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے قدموں میں آسودۂ خواب ہیں۔ (مرتب)

صدر المشائخ فضل عثمان مجددی رحمۃ اللہ علیہ

۱۹/اپریل ۱۹۷۳ء بروز جمعرات مغرب کے قریب لاہور کے میو ہسپتال میں افغانستان کے سلسلۂ رشد و ہدایت کے ایک مرشدِ کامل اور خانوادۂ مجددی[1] فاروقی کے ایک گلِ سرسبد ملتِ اسلامیہ کو داغِ مفارقت دے گئے یعنی حضرت نور المشائخ شیخ فضل عمر مجددی ملا شور بازار قدس سرہٗ کے سب سے بڑے صاحبزادے مولانا صدر المشائخ فضل عثمان مجددی کا تقریباً اسی برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ حضرت مرحوم نے اپنے اولوالعزم والد بزرگوار کی طرح دعوت و تبلیغِ اسلام اور جہاد و عزیمت میں ساری زندگی گذار دی کچھ عرصہ قبل جب افغانستان کی دینی فضا بدلتی محسوس ہوئی تو آپ ترکِ وطن فرما کر پاکستان کی سالمیت، عالمِ اسلام کے اتحاد اور لادینی فتنوں کے مقابلہ میں مصروف ہو گئے۔ اعلاءِ کلمۃ اللہ، جہاد و عزیمت اس خاندانِ مجددیہ فاروقیہ کا موروثی شعار ہے۔ آپ کے چھوٹے بھائی حضرت ضیاء المشائخ محمد ابراہیم جان[1] مدظلہ افغانستان میں اپنے والد بزرگوار کے مسند نشین رشد و ہدایت ہیں اور ان کی خانقاہ مرجع انام ہے۔ حضرت مرحوم انارکلی لاہور کی ایک مجلسِ وعظ میں شرکت فرما کر رات ایک بجے گھر پہنچے تو مرض نے شدت اختیار کی، دو دن بعد تین مرتبہ اللہ اکبر اور کلمۂ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے جان جانِ آفرین کے سپرد کی۔ لاش پورے اعزاز کے ساتھ افغانستان لے جائی گئی۔ ۲۱/اپریل کو قلعہ جواد کابل

---

[1] افغانستان میں روسی سامراج کی آمد سے یہ خانوادہ بھی ان کے دست برد سے محفوظ نہ رہا اور اس باعفت خاندان پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ (گذشتہ سال ایک ملاقات کے دوران پروفیسر مولانا صبغۃ اللہ مجددی صاحب نے بندہ کو بتایا کہ اس انقلاب میں ہمارے خاندان کے ۹۲ افراد شہید ہو چکے ہیں) حتیٰ کہ ان کا ذاتی کتب خانہ جس میں ہزارہا نادر و نایاب کتابیں تھیں، کو سرخ سامراج نے نذرِ آتش کر ڈالا۔ (مرتب)

میں ان کے بھائی حضرت ضیاء المشائخ نے جنازہ پڑھایا جس میں تقریباً ایک لاکھ افراد نے شرکت کی۔ علماء، وزراء، اعیانِ مملکت، ہر طبقہ کے لوگ موجود تھے۔ جنازہ کے بعد پاکستان کے سفیر مقیم کابل اور شاہِ افغانستان کے نمائندوں نے مزار پر پاکستان اور افغانستان کے پرچم نصب کیے اور گویا حضرت مرحوم کے وصال کے بعد بھی دو برادر ملکوں کے اس اتحاد کا مظاہرہ ہوا جس کے لیے مرحوم عمر بھر کوشاں رہے۔ ان کے ایک صاحبزادہ مولانا فضل الرحمٰن مجددی کو ان کی خلعت نیابت کی سرفرازی ملی جو پاکستان میں مقیم ہیں —— حضرت مرحوم کو دیگر اکابر مشائخ کی طرح دارالعلوم حقانیہ سے خاص تعلق خاطر رہا اور بارہا اچانک دارالعلوم حقانیہ تشریف لاتے اور اپنی شفقتوں سے سب کو نوازتے۔ اپنے والد بزرگوار کی سنت کو قائم رکھتے ہوئے ۲۸ مئی کو حضرت مرحوم کے جانشین مولانا فضل الرحمٰن مجددی تشریف لائے اور طلبہ سے گرانمایہ خطاب[1] فرمایا۔ ان کی گرم جوشی اور عالم اسلام کے لیے دردوسوز کے جذبات اور اندازِ بیان سے ظاہر ہوا کہ موصوف اپنے والد بزرگوار کی مسندِ رشد و اصلاح کیلئے انشاءاللہ نہایت اہل اور موزوں جانشین ثابت ہونگے اور اپنے قابلِ فخر بزرگوں کی روایات قائم رکھ سکیں گے۔ دارالعلوم میں حضرت مرحوم کیلئے ایصالِ ثواب کیا گیا۔ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے مولانا محمد ابراہیم جان مدظلہ (افغانستان) کے نام اپنے تعزیتی ٹیلیگرام میں پورے دارالعلوم کی طرف سے اظہارِ تعزیت کیا اور حضرت مرحوم کے رفع درجات کی دعائیں ہوئیں۔ حق تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ مقاماتِ قرب و رضا سے نوازے اور امام دعوت و عزیمت محی الاسلام حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے اس خاندان میں فاروقی دعوت و عزیمت کی نسبتیں جاری وساری رہیں کہ اس وقت عالم اسلام زبانِ حال سے تڑپ تڑپ کر روحِ فاروقیؓ کو پکار رہی ہے اور برصغیر پاک و ہند نہایت شدت سے ایک اور مجدد الف ثانی کا محتاج ہے۔

الحق —— جون ۱۹۷۳ء

---

[1] اس وقت آپ بالکل نوجوان تھے پشتو میں (فارسی آمیزش کے ساتھ) آپ نے تقریر فرمائی۔ معتدل بدن، پُروقار چہرہ، سفید خوبصورت عمامہ سر پر متانت میں اضافہ کر رہا تھا۔ اپنے والد کی وفات پر یہ شعر دوران خطاب فرمایا ؎

مرگِ صاحب دل جہانے را دلیلِ کلفت است　　　شمع چوں خاموش گردد و چراغ محفل می شود

(مرتب)

مولینا محمد قمر عُرف جورہ استاد

۱۶ ربیع الثانی جمعرات کی شب ضلع سوات کے ایک اور رُوحانی مُرشد اور بلند پایہ بزرگ نے حیاتِ جاودانی اختیار کی۔ گو ان کی زندگی گوشۂ خمولت وگمنامی میں گذری مگر علمی اور روحانی لحاظ سے ایک بلند اور مثالی مقام کے مالک تھے۔ یہ بزرگ ضلع سوات کے علاقۂ شامیزئی کے قصبہ جورہ کے رہنے والے تھے۔ اسمِ گرامی حضرت مولانا محمد قمر صاحب عرف جورہ اُستاد صاحب تھا۔ آپ اپنے وقت کے مشہور مصلح اور مجاہد صاحبِ کرامات بزرگ حضرت سنڈاکی بابا[۱] مرحوم کے خلیفہ مجاز اور زندگی بھر ان کے دستِ راست رہے۔ ریاست کے قیام سے قبل اپنے مُرشد کے ساتھ بدعات ورسوم کی اِصلاح اور خوانینِ وقت کے مظالم یا پھر انگریز کے سامراجی عزائم کے خلاف جہاد میں شریک رہے۔ حضرت سنڈاکی بابا نے ان میں علمی ذہانت کے آثار محسوس کیے تو انہیں تحصیلِ علم کے لیے ہندوستان بھیجا، وہاں رامپور وغیرہ میں ایسی اعلیٰ علمی دسترس حاصل کی کہ علماء وقت علمی ادق مسائل میں ان کی طرف رجوع کرنے لگے۔ ریاست سوات کے قیام میں ان حضرات کا خاص حصّہ رہا۔ طبیعت پر اپنے مُرشد کی طرح احیاء سُنّت اور بدعات کے انسداد کا غلبہ تھا۔ عمر بھر ملک وملّت کی اصلاح پر لگے رہے۔ ہندوستان سے واپسی پر آبائی وطن جورہ کے ایک مشہور قاطعِ بدعات بزرگ اور محدّث مولانا مفتاح الدین صاحب مصنف "اصلاح الرسوم" کے ساتھ رہائش اختیار کی، انہوں نے اپنی صاحبزادی سے عقدِ نکاح

---

[۱] شیخ المشائخ قطب الارشاد حضرت مولانا ولی احمد صاحب المعروف سنڈاکی باباؒ آپ نہایت ہی متبع سُنّت اور مصلحِ وقت شیخ نجم الدین عرف اڈے باباؒ صاحب کے خلیفہ مجاز اور اصلاحِ عوام و دفعِ مظالم کے لیے مشہور تھے۔ ضلع دیر میں کوہال شریف میں آپ کا مزار ہے۔ (مُرتّب)

کرایا، اللہ تعالیٰ نے بڑھاپے میں اولاد دی۔ صاحبِ کرامات اور مستجاب الدعوات بزرگ تھے، بے تکلفی، فقیرانہ مزاج، سادہ وضع جیسی صفات کے مالک تھے۔ بدعات سے اتنے ہراساں رہتے کہ ہر وقت دل و دماغ پر یہی خطرہ مسلط رہتا کہ کہیں سنت کی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔

کافی عرصہ قبل جب چلنے پھرنے کی سکت تھی تو متعدد دفعہ دارالعلوم حقانیہ میں بھی قدم رنجہ فرمایا اور کئی کئی دن طلبہ و اہلِ علم کو اپنی صحبت سے مشرف فرماتے۔ حق تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ اور فی مقعد صدقٍ عند ملیکٍ مقتدر[1] کا مصداق بنادے۔

الحق
جون ۱۹۷۳ء

---

[1] (ترجمہ) بیٹھے سچی جگہ میں اس بادشاہ کے نزدیک جس کا سب پر قبضہ ہے۔ (القرآن)

مولانا سیّد گل بادشاہؒ

علمی اور دینی حلقوں میں مولانا لال حسین اخترؒ اور مولانا خورشید احمد شاہؒ کی وفات کے سانحے ابھی تازہ ہی تھے کہ ۱۰ رجولائی ۱۹۷۳ء کو بطلِ جلیل، مجاہدِ غیور مولانا سید گل بادشاہ صاحبؒ[1] امیر جمعیۃ العلماء اسلام سرحد کا سانحۂ ارتحال بھی پیش آیا۔ یہ سانحے علم و عمل اور رشد و ہدایت کے میدانوں میں ناقابلِ تلافی نقصان کا باعث ہیں۔ مولانا سید گل بادشاہ مرحوم نے ساری زندگی جہادِ آزادی، باطل کے تعاقب اور اعلاء کلمۃ اللہ میں گذار دی۔ صوبہ سرحد میں وہ جمعیۃ

لہ امیر شریعت سید گل بادشاہ صاحبؒ کے بارے میں احرار راہنما خان غازی کابلی کا مکتوب بنام مدیر الحق ملاحظہ ہو جس میں حضرت امیر شریعتؒ کے متعلق تاریخی مواد موجود ہے۔ (مرتب)

——— "حضرت مولانا سید گل بادشاہ "طورو کے گیلانی سادات" کے عنوان سے محترم عبدالحلیم اثر کے مضمون نے دل و دماغ کے ان جھروکوں کے چراغوں کو جگمگایا جن پر زمانہ نے اب تک "فراموشی کے فانوس" تانے تھے۔ غازی" کو "امیر شریعتوں" کا علم تو تھا یعنی پھلواری شریف بہار کے امیر شریعتؒ اور دوسرے احرار کے امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، جن کے دستِ حق پرست پر مولانا سید انور شاہ مظفر آبادی نے بھی بیعت کی تھی لیکن محترم عبدالعلیم اثر افغانی کے مضمون سے یہ معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی کہ تیسرے امیرِ شریعت صوبہ سرحد کے مولانا سید گل بادشاہؒ بھی تھے اور یہ کہ اُن کا آبائی نام سید لطیف الرحیم تھا۔ اور جب انہیں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے اپنی فرزندی میں لیا اور آسام سے دیو بند ساتھ لائے تو ان کا نام "سید گل بادشاہ" رکھا، اور اس طرح آبائی نام سید لطیف الرحیم پس منظر میں چلا گیا اور "سید گل بادشاہ" کے نام سے آفاقی شہرت حاصل کی ——— مولانا حسرت موہانی کا بھی آبائی نام "فضل الحسن" ہے مگر بقول حسرتؒ

عشق نے جب سے کہا حسرت مجھے ——— کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

سید لطیف الرحیم، سید فضل الحسن اور حبیب الرحمٰن کو جاننے والے بہت کم ہیں مگر دنیائے شعر و ادب و سیاست

(باقی حاشیہ صفحہ ۔۔۔ پر)

کے اوّلین اور اساسی دعاۃ میں سے تھے۔ آخر دم تک علماء کی سربلندی اور جمعیتہ کے مقاصد کی تکمیل ان کا اوڑھنا بچھونا رہا۔ ایسی بے لوث خدمت کی مثالیں کم ہی ملیں گی، جمعیتہ کے پاکیزہ عزائم کی خاطر عمر بھر کوئی دوسرا وظیفہ حیات اختیار نہ کیا، نہ خطابت اور امامت کے مشاغل میں اُلجھے نہ درس وتدریس اور کسی مدرسہ کی ادارت اور نظامت کے جھمیلوں میں پھنسے، حالاں کہ وہ ان سب خدمات کے اہل تھے، مگر عسرت اور تنگدستی کی زندگی برداشت کرتے ہوئے جمعیتہ کی خاطر پوری یکسوئی سے حسبۃً للہ زندگی ایک ہی مقصد میں لگادی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۳) میں سب اُنہیں حسرت موہانی، سیدگل بادشاہ اور خان غازی کابلی کے ناموں سے ہی جانتے پہچانتے ہیں۔

حضرت مولانا سید لطیف الرحیم عرف سیدگل بادشاہ ایک اچھے صحافی بھی تھے اور قیام پاکستان سے قبل پشاور سے انہوں نے "صداقت" کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا تھا اور قیام پاکستان کے بعد خان عبدالقیوم خان کے عہد میں "دار ورسن" کا امتحان بھی دیا تھا یعنی بقول "وظیفہ خوار رہا دربار ظفر چچا غالب" وہاں بھی رہے ہیں ؎

قد و گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
وہاں ہم ہیں جہاں دار ورسن کی آزمائش ہے

تقسیم وطن سے چند ماہ قبل غازی کی آخری ملاقات مسجد نیلا گنبد لاہور میں امیر شریعت سیدگل بادشاہ سے ہوئی تھی۔ اس ملاقات کا شانِ نزول یہ تھا کہ "سیدگل بادشاہ" امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سے ملنے آئے تھے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ "سید بخاریؒ" لاہور سے باہر دورے کر رہے ہیں، تو انہوں نے غازی کو ملاقات کے لیے مسجد نیلا گنبد لاہور میں یاد فرمایا۔ اس وقت حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کے ہم وطن یعنی "بفہ" کے مولانا محمد اکبر خان مرحوم بھی تھے۔ دورانِ ملاقات انہوں نے غازی کو اپنے جاری کرنے والے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۵ پر)

وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ العزیز کے معتمدین میں سے تھے۔ جنگِ آزادی کے یہ نڈر مجاہد ہر لادینی فتنہ کے سامنے سینہ سپر رہے۔ قید و بند کے مرحلوں سے بھی گذرے۔ آج نہ صرف سرحد بلکہ پورے پاکستان کی جمعیۃ اپنے امیر العلماء کی جُدائی پر ماتم کناں ہے۔

الحق

جولائی ۱۹۷۳ء

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۴) والے اخبار "صداقت" کی ادارت کی دعوت دی تھی، لیکن غازی اس زمانے میں لاہور کے خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق بنے ہوئے تھے، جنہوں نے نواب دکن کی دعوت پر فرمایا تھا کہ ع

کون جائے ذوق یہ دِلّی کی گلیاں چھوڑ کر

اور یہ کہہ کر غازی نے مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے فرزندِ معنوی سید گل بادشاہ کو مایوس کرنے کا گناہ کیا کہ غازی لاہور کی گلیاں اور احرار کو چھوڑ کر کہیں جانے کو تیار نہیں"۔۔۔۔۔

الحق، اگست ۱۹۸۳ء ۔ (مرتب)

مولانا لال حسین اخترؒ

مولانا لال حسین اخترؒ نے زندگی آقائے ختم المرسلینؐ کی ناموسِ ختمِ نبوت کی حفاظت پر نثار کر دی۔ اس سے بڑھ کر سعادت کیا ہو سکتی ہے۔ تاج و تختِ ختمِ نبوت کی حفاظت کے لیے نازک سے نازک آزمائشوں میں کود پڑے اور ختمِ نبوّت کا ڈنکا سمندر پار ممالک یورپ تک میں بھی بجا آئے۔ باطل کے تعاقب میں آخری مورچوں تک جانے سے بھی دریغ نہ کیا۔ آج وہ بارگاہِ رحمۃ للعالمینؐ میں سرفراز اور سرخرو ہو کر اپنی خدماتِ جلیلہ کا صلہ پائیں گے۔ ان کی مثالی زندگی پر پوری ملّتِ مسلمہ ان کے زیرِ بار رہے گی۔ اور خدا کے ہاں جو اجر و ثواب ہے اس کا تو کوئی حد و حساب نہیں۔

الحق :۔ جولائی ۱۹۷۳ء

پیر سیّد خورشید احمد شاہ صاحبؒ

مولانا سید پیر خورشید احمد شاہ قدس سرہٗ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے خلفاء اجل میں سے تھے جن کی تعداد پاکستان میں دو چار ہی تک محدود ہے۔ اپنے آقا و مرشدؒ کے مشن کی تکمیل کرتے ہوئے ساری زندگی رُشد و ہدایت اور اصلاح و ارشاد میں صرف کی۔ حق تعالیٰ جانے والوں کو بہترین مقاماتِ قرب سے نوازتے ہوئے امتِ مرحومہ کو ان کا بہترین بدل عطا فرما دے اور ان کی برکات و فیوضات جاری و ساری رہیں۔ دار العلوم حقانیہ اور ادارۃ الحق ان سانحوں میں پوری اُمت کا شریکِ غم ہے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ و رضی اللہ عنہم و ارضاہم

الحق :۔ جولائی ۱۹۷۳ء

حضرۃ مولانا عبدالمالک صدیقی نقشبندی رح

۱۱ر شعبان ۱۳۹۳ھ مطابق ۹ر ستمبر ۱۹۷۳ء شب اتوار دس بجکر دس منٹ پر احمد پور شرقیہ بہاولپور میں ایک ایسے خدارسیدہ بزرگ کا وصال ہوا جکی ساری زندگی اسلام کی بے لوث خدمت خلق اللہ کی رشد و ہدایت اور ارشاد و سلوک میں بسر ہوئی تھی۔ افسوس کہ ظلمت مادہ پرستی اور طوفانِ خدا فراموشی کی ان تاریکیوں میں دوائے دل بیچنے والے بڑی تیزی سے سفرِ آخرت اختیار کرتے جارہے ہیں اور دنیا خالی ہوتی جارہی ہے۔ عارفِ ربّانی ملاذ الفقراء محب العلماء والمساکین مولانا محمد عبدالمالک صدیقی نقشبندی مجددی کی رحلت بھی ان تاریکیوں میں اضافہ کا سبب بنے گی حضرت مرحوم اپنے وقت کے شیخِ طریقت خواجہ فضل علی قریشی مسکین پوری متوفی ۱۳۵۴ھ کے اجل خلفاء میں سے تھے جن کا روحانی سلسلہ سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ تک پہنچتا ہے۔ ولادت ۱۴ر ذی الحجہ ۱۳۱۹ھ بوقت تہجد بستی ڈھکوان احمد پور شرقیہ بہاولپور میں ہوئی، وصال کے وقت عمر ۷۴ برس تھی وفات کے بعد چہرۂ انور

ل شیخِ طریقت مولانا محمد عبدالمالک صاحب صدیقی رحمۃ اللہ کی مہتم بالشان خصوصیت یہ ہے کہ آپ کے حلقۂ ارادت میں اکثر علماء و صلحاء شامل ہیں۔ دارالعلوم حقانیہ کے اکثر اساتذہ آپ سے بیعت اور آپ کے خلفاء مجازین ہیں۔ جب کبھی دارالعلوم حقانیہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازتے، تو ارادتمندوں اور عقیدت کیشوں کا بے پناہ ہجوم خانقاہِ اشرفی کا سا منظر پیش کرنے لگتا۔ تجلیات صدیقی کے نام سے آپ کی سوانح حیات موجود ہے۔ (مرتب)

اور جسم پر منبتیوں کی علامات نمایاں تھیں۔ جنازہ احمد پور پڑھانے کے بعد دوسرے دن خانیوال لایا گیا جہاں دوبارہ رات کے دس بجے جنازہ پڑھایا گیا اور رات کے دو بجکر پندرہ منٹ پر یعنی اس وقت آغوشِ لحد کے سپرد کر دئے گئے جبکہ اس وقت زندگی میں آپ مولائے حقیقی سے محوِ مناجات رہتے اور اپنے نالہ ہائے سحرگاہی کی شکل میں رفیقِ اعلیٰ سے ہمکلام ہوتے۔

مولانا مرحوم کی ذات دیگر اکابر کی طرح شریعت و طریقت کی جامع تھی، کمالِ اتباعِ سنت جو سلسلۂ نقشبندیہ کا وصفِ خاص ہے، ہر ہر قدم پر ملحوظ رہا۔ سنت کی مخالفت یا کسی منکر کو دیکھتے تو ضبط نہ کر سکتے۔ نہ کسی مداہنت یا مصلحت بینی کے روادار ہوتے، بلکہ بلاخوف لومۃ لائم ٹوکتے، آپ کے ارد گرد دنیا پرستوں اور اہلِ جاہ و ثروت کا نہیں بلکہ زیادہ تر علماء طلباء فقراء مساکین اور منکسرۃ القلوب لوگوں کا ہجوم رہتا گویا وہ طبقۂ علماء کے مرشد تھے اور خود ان لوگوں میں ایسے خوش رہتے جیسے ماہیٔ بے آب پانی میں تسکین پاتی ہے۔ تمام اکابر دیوبند کے مداح اور گرویدہ تھے، مگر شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کے تو گویا عشاق میں سے تھے، ہمیشہ ان کے مناقب میں رطب اللسان رہتے، صحابہؓ دشمنی تصوف اور سلف صالحین سے بدظنی پیدا کرنے والے لوگوں پر شدید تنقید کرتے، اور اس وجہ سے ہمیشہ جماعت اسلامی مخالفت کا نشانہ بنتی، کبھی تبلیغی جماعت بھی بعض لوگوں کے تشددات کی وجہ سے لپیٹ میں آجاتی جو بہت سے معتقدین کیلئے بھی سامانِ آزمائش بن جاتی، تمنائے اصلاح خلق اور جذبۂ ارشاد و ہدایت انہیں اس ضعف اور کبرسنی میں بھی طویل اسفار پر مجبور کرتا رہا۔ دارالعلوم حقانیہ میں آمد و رفت کا سلسلہ ۲۰، ۲۲ سال سے دارالعلوم حقانیہ کے اولین صدر مدرس استاذ مکرم مولانا عبدالغفورؒ صاحب سواتی قدس سرہٗ (سابق مدرس مدرسہ دینیہ دہلی) کے تعلق سے

---

[۱] مولانا الحافظ عبدالغفور مقام و مسکن غزشینڑ تحصیل خوازہ خیلہ ضلع سوات۔ مورخہ ۱۲ شوال ۱۳۶۹ھ دارالعلوم حقانیہ میں عہدۂ صدارت تدریس پر آپ کا تقرر ہوا۔ مسلم شریف اور بیضاوی شریف کے علاوہ فنون کی عام کتب پڑھایا کرتے تھے۔ حضرۃ مولانا عبدالمالک صدیقی کے خلفاء مجازین میں سے تھے۔ ۱۸ شوال ۱۳۷۶ھ کو تعلیمی سال کے آغاز پر دارالعلوم کیلئے رختِ سفر باندھا

شروع ہوا جو ان کے متوسلین میں سے تھے پھر تو ہر بار دارالعلوم کے بیشمار طلبہ اور اجلّۂ اساتذہ تک بیعت ہوتے رہے اپنے آخری سفر میں بھی دارالعلوم تشریف لائے دوسرے دن تک قیام کیا اس سفر میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آغوش مبارک میں لے کر فرما رہے ہیں : "عبدالمالک اب بوڑھے ہو چکے ہو گھر میں بیٹھو اور سفر ترک کر دو" اور ابھی مہینہ ڈیڑھ ہی گزرا تھا کہ راہِ ارشاد و ہدایت کا یہ تھکا ماندہ مسافر مولائے حقیقی کی آغوشِ رحمت میں جا کر آسودۂ راحت ہو گیا۔ حق تعالیٰ مرحوم کے فیض کو جاری و ساری رکھے ، اور درجات میں تاقیامت اضافہ ہوتا رہے۔

الحق

اکتوبر ، نومبر ۱۹۷۴ء

راستہ میں موضع چار باغ رات گزارنے کا ارادہ کیا ، رات کو حسبِ معمول سحری کیلئے اٹھے۔ پھر فجر کی سنتیں ادا کرنے کے بعد جماعت کے انتظار میں تھے کہ عارضۂ قلب سے جان بحق ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ عربی لغت کی تحقیق میں قرآنی آیات سے فی البدیہ استدلال فرماتے۔ اور ادق مسئلہ کو تمثیلات سے خوب خوب ذہن نشین کرواتے ۔ اور ایسی بیشمار صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ہمارے مولانا سمیع الحق صاحب کے تو محبوب اساتذہ میں سے تھے ۔ اس لحاظ سے مرحوم کا ان پر حق ہے کہ مفصل مقالہ ان پر لکھیں۔ (مرتب)

داعی بن داعی بن داعی

مولانا محمد ہارونؒ ابن مولانا محمد یوسف دہلوی

حق تعالیٰ کی شانِ بے نیازی پہ قربان جائیے شانِ صمدیت بھی عجیب ہے۔ جماعت تبلیغی کے روحِ رواں امیر التبلیغ مولانا محمد یوسف دہلویؒ کس عالمِ بے سروسامانی میں جماعت اور تحریکِ تبلیغ و دعوت کو چھوڑ کر جدا ہو گئے تھے مگر کام خدا کا تھا خدا نے جاری و ساری رکھا۔ وہ اپنے اولوالعزم والد مولانا محمد الیاس مرحوم کے غالباً اکلوتے فرزند تھے، بظاہر ان کے دم قدم سے کام پھیلتا گیا مگر خدا نے بہت جلد یہ ظاہری پردہ سرکا کر بتلا دیا کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے یہ سب اسی ذاتِ وحدہٗ کے کرم کا صدقہ ہوتا ہے۔ اب یکایک مولانا محمد یوسف مرحوم کے صاحبزادہ مولانا محمد ہارونؒ[1] صاحب دہلوی بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ غالباً ایک ہی فرزند تھے اور عین عالمِ شباب میں بظاہر یہ تبلیغی جماعت کیلئے ایک بڑا سانحہ ہے۔ بالخصوص مخدوم العلماء بقیۃ السلف شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوری حال مہاجر مدینہ طیبہ کیلئے، مگر یہاں بھی خداوند کریم کی وہی شانِ بے نیازی اور اس کے اندر مخفی ہزارہا حکمتیں ان سب کیلئے سامانِ صبر و تسکین بن سکیں گی۔ اور انشاء اللہ مولانا محمد الیاس مرحوم کا فیض روحانی ذریت کے ذریعہ چار دانگ عالم میں جاری رہے گا۔

(الحق: ۱۷ رمضان ۱۳۹۳ھ یوم البدر)

---

[1] مولانا ابو الحسن علی ندوی سوانح شیخ الحدیث حضرۃ مولانا محمد زکریا میں رقمطراز ہیں:

"۲۹ شعبان ۱۳۹۳ھ کو اچانک عزیز نواسہ مولوی محمد ہارون کے انتقال کا واقعہ پیش آیا۔ جوان کے بھی چشم و چراغ تھے اور حضرۃ مولانا محمد الیاس صاحب اور حضرۃ مولانا محمد یوسف صاحب کی بھی واحد یادگار" انتقال کے وقت ان کی عمر ۳۵ سال تھی۔ تفصیلات کے لئے تذکرہ مولوی محمد ہارون کاندھلوی ملاحظہ ہو۔ (مرتب)

علامہ مولانا عبدالحق نافع گل رحمہ اللہ

سابق استاذ دارالعلوم دیوبند

اس ماہ علمی دنیا کو علامۂ یگانہ مولینا عبدالحق نافع گل سابق استاذ دارالعلوم دیوبند کی وفات کا صدمہ پیش آیا، اس موقع پر حضرت مولانا مرحوم کا مختصر سوانحی خاکہ پیش کیا جارہا ہے

حضرت مولانا ۹ محرم الحرام ۱۳۱۳ھ کو زیارت کاکا صاحب تحصیل نوشہرہ میں پیدا ہوئے۔ مرحوم کا خاندان "کاکاخیل" اپنے علاقے کا ایک مشہور خاندان ہے جسے لوگ تقدس کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مولانا مرحوم کا نام والد نے عبدالحق اور والدہ نے نافع گل رکھا تھا۔ زیادہ شہرت دوسرے نام سے پائی۔ انہوں نے بڑے ہوکر دونوں ناموں کو ملاکر عبدالحق نافع گل بنادیا۔

مرحوم کے والد ان دنوں زیادہ تر اپنی جائیداد پر "درگئی" (ملاکنڈ ایجنسی) میں مقیم رہتے تھے۔ چنانچہ والد مرحوم کا بچپن بھی زیادہ تر درگئی میں گذرا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد اور درگئی کے ایک عالم مولانا محمود سے حاصل کی۔ ان کے والد فارسی زبان میں خوب مہارت رکھتے تھے۔ نیز علم طب اور مذہبی علوم سے بھی شناسا تھے۔ ان کی تعلیمی مہارت کا نتیجہ تھا کہ بچپن ہی میں مولانا مرحوم کو فارسی زبان کے نثر لکھنے میں کمال اور شعر گوئی کا بھی سلیقہ آگیا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے تکمیل علم کے لیے دیوبند کا رُخ کیا، ان کے

بڑے بھائی اسیرِ مالٹا مولانا عزیر گل مدظلہ (تلمیذِ خاص حضرت شیخ الہند رح) پہلے ہی سے دیوبند میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی آغوشِ تربیت میں پہنچ چکے تھے۔

بڑے بھائی کے ساتھ شیخ کو جو بے پناہ محبت اور شفقت تھی اس کی بنا پر چھوٹے بھائی کو بھی انہوں نے ابتداء سے لے کر ازحد شفقتوں سے نوازا۔ مولانا مرحوم کی صفات و ملکات شیخ رح کو بہت ہی پسند تھے۔ ان کی غیرت، شجاعت اور حیاء کے ملکات کو انہوں نے اپنی فراستِ ایمانی سے نگاہِ اولین میں معلوم کر لیا تھا۔ مولانا مرحوم کی جفاکشی اور سپاہیانہ انداز جو دونوں بھائیوں کو اپنے والد کی مخصوص تربیت کے نتیجہ میں ملا تھا حضرت شیخ الہند رح کے لیے کشش کی چیز تھی۔ وہ پیار سے مولانا مرحوم کو "سیف الملوک" کے نام سے پکارتے تھے۔

حضرت شیخ الہند رح کو اپنے رفقاء کے ساتھ جب حجاز کا سفر اور اس کے بعد اسارتِ مالٹا کی ابتلاء پیش آئی تو یہ عرصہ مولانا مرحوم کے لیے بھی سخت آزمائش کا ثابت ہوا۔ یہ سیاسی رقابتوں کا زمانہ تھا حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی سیاست سے دارالعلوم کے بعض ذمہ داران کو اتفاق نہیں تھا لیکن ان کی شخصیت کے احترام میں خاموش رہنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شیخ رح کے رفقا بھی کچھ لوگوں کی نگاہوں میں مخدوش ہوتے تھے۔ لیکن شیخ رح کے لحاظ کی بناء پر ان کا وجود برداشت کیا جاتا تھا۔ حضرت شیخ الہند رح نے اپنے اس سفر پر روانگی سے قبل مولانا مرحوم کو تنہائی میں بلا کر کچھ نصیحتیں کیں اور فرمایا کہ میرے بعد ہو سکتا ہے کہ آپ کو کچھ لوگوں کی طرف سے ابتلاء پیش آ جائے، ایسے موقع پر مقابلے کا بالکل نہیں سوچنا بلکہ خاموشی کے ساتھ کسی دوسرے مدرسہ میں داخلہ لے کر اپنی تعلیم جاری رکھنا۔

مولانا مرحوم کو اپنا کوئی قصور معلوم نہیں تھا جس کی بناء پر اُن کو اس قسم کے حالات سے واسطہ پڑ سکتا تھا، اس لیے اُن کو شیخ رح کی بات پر کچھ تعجب بھی ہوا لیکن اس مردِ مومن رح کی فراست بالکل صحیح تھی۔ جونہی آپ ان کی آغوش سے کچھ عرصہ کے لیے جدا ہوئے

توحالات ان کے حق میں بالکل تبدیل ہوگئے اور بالآخر انہیں ان سیاسی رقابتوں کا شکار ہوکر دارالعلوم کو خیرباد کہنا پڑا۔

اس کے بعد انہوں نے ہندوستان کے مختلف مدارس میں داخلہ لینے کی کوشش کی لیکن حضرت شیخ الہندؒ کی سیاست سے اختلاف رکھنے والے تمام مدارس کی طرف سے ان کو یہ جواب ملتا تھا کہ حضرت مولانا عزیر گل جو حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت کے لیے سفر پر ساتھ ہی روانہ ہوگئے تھے، کے بھائی ہونے کی وجہ سے آپ کے وجود سے ہم خطرہ محسوس کرتے ہیں۔

بعض مدارس نے لاعلمی میں داخلہ اگر دیا بھی تو علم ہونے کے بعد پھر نکال دیا۔ مولانا مرحوم جن مدارس کا نام لیتے تھے از یں سہارنپور، بھوپال اور رینڈو کے مدارس بھی تھے۔ بالآخر انہیں گلاوٹی اور مراد آباد کے مدارس میں تعلیم جاری رکھنے کا موقع ملا۔ مراد آباد میں علوم عقلیہ کی تحصیل انہوں نے اس وقت کے ایک مشہور ماہر فن عالم مولانا عبدالسلام قندھاریؒ سے کی، نیز ان علوم کی تحصیل کے لیے انہوں نے علاقہ چکیسر کا سفر بھی کیا، اور وہاں کے نامور اساتذہ سے علوم حاصل کیے۔ طالب علمی کے اس عرصہ میں انہوں نے تحریکِ ہجرت میں شامل ہوکر کچھ عرصہ کے لیے اپنے مخلص دوست حکیم سید الابرار مردانی کے ساتھ کابل ہجرت کر گئے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی واپسی پر دوبارہ مولانا مرحوم کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ آسان ہوگیا۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد داخلہ لے کر بقیہ علوم کی تکمیل انہوں نے دیوبند میں کی۔ دورۂ حدیث انہوں نے شیخ الہندؒ کے وصال کے بعد حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے پڑھا۔ علامہ کشمیریؒ کے علاوہ دیوبند میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور چھوٹی کتابوں میں مولانا ابراہیم بلیاویؒ اور مولانا اعزاز علیؒ سے بھی انہوں نے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔

فراغت کے بعد ہندوستان کے مختلف مدارس میں تدریس کی پھر دارالعلوم دیوبند کی طرف سے مدرسی کے لیے دعوت آئی جو انہوں نے بڑے بھائی کے حکم سے قبول کی

اور تقسیم ملک تک تقریباً پندرہ سال درجہ علیا کے مدرس رہے۔

مرحوم کی والہانہ عقیدت کا تعلق شیخ الہندؒ کے بعد جانشینِ برحق شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے تھا اور سیاسی مسلک میں بھی انہی کے ہمنوا رہے۔ حضرت مدنیؒ کو بھی ان سے محبت تھی۔ مولانا مرحوم سفر و حضر میں حضرت مدنیؒ کے رفیق رہتے تھے۔

سیاسی ہنگاموں کے دنوں میں مخالفین کی طرف سے گوناگوں اذیتیں برداشت کیں مگر اپنے مقتداء اور محبوب شیخؒ کا ساتھ نہ چھوڑا۔

جب اس سیاسی مخالفت کا بازار گرم تھا تو اس وقت کے ایک مشہور عالم دین (حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب) نے اپنے سیاسی موقف کو شرعی اور علمی ادلہ سے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی جس کے جواب میں "دفع الہدیٰ" کے نام سے مولانا مرحوم نے ایک رسالہ تصنیف کیا جس میں اُن کے ادّلہ کے توڑ اور اپنے موقف کا علمی براہین کے ساتھ اثبات تھا۔ یہ رسالہ علمی حلقوں میں سراہا گیا۔ مرحوم نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے زیرِ ہدایت اے، پی فقیر مرحوم کی تحریکِ آزادی میں بھی کام کیا، اور مال کی فراہمی میں دوڑ دھوپ اور اپنا اثر و رسوخ خوب استعمال کیا تھا۔

تقسیمِ ملک کے بعد مرحوم نے اپنے گھر پر قیام کا فیصلہ کر لیا۔ دیوبند کا ماحول اور حضرت مدنی علیہ الرحمۃ کی رفاقت چھوٹنے کے بعد کسی اور جگہ کام کرنے کے لیے طبیعت آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ ملک میں جدید قائم شدہ مختلف مدارس کی طرف سے بہ اصرار دعوتیں آئیں لیکن انہوں نے قبول کرنے سے معذرت کی۔ لیکن باوجود اس کے ۱۹۵۰ء میں وہ حضرت مدنی علیہ الرحمۃ کے ارشاد پر کراچی کے مولانا صادق مرحوم کے مدرسہ مظہر العلوم میں جو حضرت مدنی علیہ الرحمۃ کے رفقاء میں سے تھے، صدر مدرس (کے طور) پر ایک سال کے لیے تشریف لے گئے اور وہاں دورۂ حدیث کا افتتاح کیا۔

۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۴ء میں وہ مدرسہ اسلامیہ چارسدہ میں شیخ الحدیث رہے۔ یہ

مدرسی انہوں نے اپنے شاگرد میاں محمد شفیق صاحب جو اس مدرسہ کے مہتمم تھے کے شدید اصرار سے مجبور ہو کر قبول کی تھی۔ انہوں نے اپنے دار العلوم کی کامیابی کے لیے مولانا مرحوم کو مجبور کیا تھا۔ مرحوم نے دو سال تک یہ خدمت تبرعاً انجام دی۔ نہ صرف یہ کہ مدرسہ سے تنخواہ نہیں لی بلکہ اپنے تمام اخراجات بھی خود برداشت کرتے رہے۔

۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۷ء میں وہ مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن کراچی کے شیخ الحدیث رہے یہ مدرسی انہوں نے اپنے عزیز اور مخلص دیرینہ دوست حضرت مولانا محمد یوسف بنوری مدظلہ (علیہ الرحمۃ) کی خواہش سے مجبور ہو کر قبول کی تھی، لیکن دو سال کے بعد انہوں نے اپنی عمر کے پیش نظر مزید اسفار سے معذوری ظاہر کر دی۔

چنانچہ اس کے بعد انہوں نے مستقل طور پر اپنے آبائی قصبہ زیارت کاکا صاحب میں قیام اختیار کیا۔ بہ وقت زیادہ تر مطالعہ میں گذرتا تھا، اور تلامذہ کے ساتھ جو ملاقات کے لیے آتے رہتے تھے، علمی گفتگو ہوتی تھی۔

مرحوم نے مولانا مودودی کے مسلک پر تبصرہ کے طور پر ایک کتاب "ایضاح فتاویٰ" کے نام سے تالیف کی ہے، یہ کتاب علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی ہے۔

مرحوم گذشتہ تین سال سے علیل تھے۔ مختصر وقفے کے ساتھ تین سال تک مسلسل بخار آتا رہا، نیز قلب اور جگر کی بیماری بھی تھی۔ دو بار ہسپتال میں زیر علاج رہے، لیکن بیماریوں کی پوری تشخیص سے ڈاکٹر عاجز رہ گئے۔ علالت کے ایام میں انہوں نے اپنی سہولت کے پیش نظر میانگانو کلے (سخاکوٹ) کے قیام کو ترجیح دی۔ اولاد یہاں پر پہلے سے مقیم تھی اس لیے خدمت اور علاج کی سہولت یہاں زیادہ تھی۔ چنانچہ ۳۔ ذوالحجہ ۱۳۹۳ھ مطابق ۸ جنوری ۱۹۷۴ء کو اسی گاؤں میں انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا دوسرے روز نماز جنازہ پڑھائی گئی اور گاؤں کے عام قبرستان میں تدفین ہوئی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

اطلاع کا اہتمام مرحوم کے ذوق کو ملحوظ رکھ کر نہیں کیا گیا تھا لیکن پھر بھی علاقے کے علماء وصالحین اور رؤساء، عام مسلمان بڑی تعداد میں جنازہ میں شریک ہوئے۔ تدفین کے فرائض نہایت سادگی اور شرعی طریقہ کے مطابق انجام دیئے گئے۔ ہر قسم کی رسومات کو ترک کر کے ایصالِ ثواب کے لیے مناسب طریقے اختیار کیے گئے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ اکوڑہ خٹک نے اس موقع پر مختصر تقریر میں رسومات کے ترک کی اہمیت پر روشنی ڈالی، اور حضرت مرحوم کے علمی مقام کو پورے علمی طبقہ کی طرف سے خراجِ تحسین پیش کیا۔

الحق
فروری ۱۹۷۴ء

مولانا شمس الدین شہیدؒ

کتنا المناک اور افسوسناک ہے بلوچستان کے مردِ مومن اور جری و حق گو عالمِ دین مولانا شمس الدین کی شہادت کا واقعہ۔ اور یہ افسوس و ماتم بھی ان محرکات اور حالات کا ہے جو سیاسی بھی ہیں اور مذہبی بھی، ورنہ مولانا کی زندگی کا یہ انجام ماتم و حسرت کا نہیں بلکہ مردانِ حق اور قافلۂ دعوت و عزیمت کے لیے صد ہزار افتخار کا مقام ہے کہ وہ اپنے اسلاف کی سُنّت پر عمل پیرا رہے ــــ انہوں نے شاہ ولی اللہ سے لے کر شیخ الہند رحمہم اللہ تک قافلہ سالارانِ حریت اور علمبردارانِ عزیمت کی سُنتوں کو تازہ کیا۔ جس سلسلۃ الذہب سے وہ وابستہ ہو گئے۔ ان کی سیرت میں سوائے جہد و جہاد اور صبر و استقامت، ابتلاء و محن اور دعوت و عزیمت کے اور کسی بات کی گنجائش ہی نہیں ــــ مولانا شمس الدین بھی اپنے پیشروؤں کی طرح عاش سعیداً اومات شہیداً کے مصداق بن گئے۔ اور اپنے دور، اپنے عہد کے لیے قربانی کے روشن چراغ جلا کر چلے گئے۔ ابھی وہ جوان تھے، ان کی زندگی کتنی مختصر تھی، مگر دعوت و عزیمت کے صدہا ابواب کو انہوں نے اس مختصر سی زندگی میں روشن اور تابدار کیا۔ وہ ہر باطل کے خلاف سینہ سپر ہو جاتے تھے۔

مرزائیوں نے ہمیشہ بلوچستان کو قادیانی سازشوں کا مرکز اور برصغیر کا فلسطین بنانے کی کوششیں کیں، اور جب پچھلے دنوں وہاں خانہ جنگی برپا کرنے کے طے شدہ پروگرام کے تحت ہزاروں محرف تراجم قرآن کے نسخے تقسیم کیے، تو مولانا مرحوم غیور مسلمانوں

لہ بلوچستان اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر۔ کوئٹہ سے چالیس میل دُور قلعہ سیف اللہ کے قریب سفاک قاتل کی گولی کا نشانہ بنے۔ (مُرتب)

کے ساتھ اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔ پھر انہیں طمع و لالچ اور ڈرانے دھمکانے کے صد ہا طریقوں سے آزمایا گیا۔ انہیں وزارتِ اعلیٰ کی پیش کش کی گئی مگر وہ حق و استقامت پر مبنی مؤقف سے سرِ مُو نہ ہٹے۔ بالآخر بابشیا فوج نے ۷ ارجولائی سے انہیں میوند اور دیگر پہاڑی علاقوں میں نظر بند کیا اور نظر بندی ایسا کہ مفتی محمود صاحب اور دیگر حضرات کے احتجاج کے باوجود ان کی زندگی اور موت تک کا کچھ پتہ نہ چلتا۔ اس وقت کے گورنر نے ان کے والد کو بلایا کہ کسی طرح ان کے عظیم فرزند کو "سمجھانے" کا کام ہو سکے مگر غیور فرزند کے اولوالعزم والد نے ملنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ :-

> "یہ تو ایک شمس الدین ہے، میں آبروئے تاج و تختِ ختمِ نبوت قائم رکھنے کے لیے ایسے دس شمس الدین بھی قربان کر سکتا ہوں "

بالآخر وہ رہا ہو کر آ گئے، مگر جذبۂ اظہارِ حق اور مقامِ عزیمت میں اور بھی شدت پیدا ہو گئی تھی۔

انہوں نے رازہائے درون کی نقاب کشائی شروع کی، بلوچستان میں ایرانی افواج کی موجودگی کا دعویٰ کیا اور شواہد پیش کرنے چاہے —— **الغرض** اس مردِ قلندر پر دباؤ اور لالچ کا کون سا حربہ تھا جو نہ آزمایا گیا، جس کے آگے بڑے بڑے پیرانِ پارسا اور دعویدارانِ زہد و ورع بھی ٹھہر نہ سکے۔ مگر ایک نوجوان عالم نے علماءِ حق کی لاج قائم رکھی، وہ ایک مردِ غیور تھے۔ بلوچستان کے دینی مستقبل اور امیدوں کا سہارا، مگر افسوس کہ ظالم ہاتھوں نے یہ چراغ بجھا دیا —— ان کی تعلیم و تربیت میں دارالعلوم حقانیہ کا بھی خاصہ حصہ تھا۔ ان کا طالبعلمی کا ایک حصہ یہاں گذارا، اس لیے دارالعلوم اپنے اس قابلِ فخر فرزند پر فخر کے ساتھ ساتھ خاص طور سے صدمہ میں بھی شریک ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ وزیرِ اعظم پاکستان[1] نے ۲۳ مارچ کے انٹرویو میں اسے ذاتی دشمنی کا نتیجہ قرار دینا چاہا۔ مگر یہ فیصلہ اگر نام نہاد "تحقیقات" سے نہیں تو تاریخ کے بے رحم

---

[1] اُس وقت پاکستان کے وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو تھے۔

ہاتھوں سے ہو جائے گا۔ یوم تبلی السرائر فما لہ من قوۃ ولا ناصر۔

اگر خدا کی یہ زمین معصوم اور بے گناہ انسانوں کے خون سے لالہ زار بنتی رہی، علماء حق کی عزت و آبرو اس طرح برسر عام رسوا کی جاتی رہی تو اس ملک کا خدا ہی حافظ ہے ــــ اور خدا کے ہاں ظلم و تشدد سے بڑھ کر کوئی بدترین جرم نہیں ــــ حق تعالیٰ مولانا شہید کو مقربین اور شہداء صالحین کے مراتب عطا فرماوے۔ اور ان کے بوڑھے والدین، غمزدہ خاندان کو صبر جمیل اور پاکستان کے تمام اہل حق علماء دعوت و عزیمت کو ان کا بدل نصیب ہو[1]۔ (آمین)

الحق

اپریل ۱۹۷۴ء

◎

---

[1] جنازہ کے بعد آپ کی قبر پر پھولوں کی بارش ہوئی، جس کا مشاہدہ وہاں پر موجود ہزاروں افراد نے کیا۔ تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو "رجل رشید"۔ (مرتب)

مولانا محمد نبیہؒ

۱۲-۱۳ ربیع الاول ۱۳۹۴ھ کی درمیانی شب حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ کے ایک ممتاز خلیفہ مولانا محمد نبیہؒ نے دارِ فانی کو الوداع کہا۔ حد درجہ متواضع معمولات کے پابند قرآن کریم سے بے حد شغف رکھنے والے بزرگ ان کے فرزند مولانا محمد وجیہ صاحب مدرسہ ٹنڈو اللہ یار میں استاد حدیث ہیں۔ حق تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ مقامات سے سرفرازی بخشے۔

الحق

جون ۱۹۷۴ء

مولانا مسعود آزادؒ

۲ جمادی الاول ۱۳۹۴ھ کو لاہور سے مولانا مسعود آزاد کی رحلت کی اطلاع ملی۔ موصوف شاہ عبدالقادر رائے پوری کے خاص مقربین و خدام میں سے تھے خود بھی صاحب وعظ و ارشاد تھے۔ مرشد کے اتباع میں تا مرگ یہی شغل رہا۔

الحق

جون ۱۹۷۴ء

مولانا حکیم عبدالحق صاحب رحمہ اللہ

حضرت مولانا حکیم عبدالحق رح فاضل دیوبند سابق امیر جمعیۃ العلماء ڈیرہ اسمٰعیل خان ساکنہ توران علاقہ ٹانک کا تقریباً ۵۵ سال کی عمر میں ۲۸ جون ۱۹۷۴ء بروز جمعہ انتقال ہوگیا مرحوم نہایت ذہین و فطین عالم تھے۔ ساری زندگی علمی، عملی، سیاسی اور دینی خدمت میں گذاری۔ قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھائیں۔ مولانا مفتی محمود صاحب (مرحوم) کے مرشد حافظ عبدالعزیز قدس سرہٗ خانقاہ یٰسین زئی پنیالہ سے ارادت کا تعلق تھا۔ کتبِ تصوف و تفسیر سے خاص شغف تھا۔ مسائل میں لوگ آپ کی طرف رجوع کرتے۔ ایامِ مرض وفات میں "معارف اولیاء الرحمٰن" کے نام سے ایک مجموعہ مرتب فرمایا اور ایک عجیب وصیت نامہ بھی۔ جمعیۃ العلماء اسلام کے نہایت سرگرم کارکن تھے اور نہایت حاذق طبیب بھی۔ حق تعالیٰ مرحوم کو بہترین مقاماتِ قرب سے نوازے۔ قارئین سے دعاؤں کی درخواست ہے۔

الحق

جولائی ۱۹۷۴ء

مولانا حبیب الرحمٰن

حاجی عبد القدوس ○ مہاجر مکی شیخ محمدؒ

ضلع کیمبل پور (اٹک) کے علاقہ چھچھ کے فعال سرگرم اور جوشِ دین سے سرشار عالم مولانا حبیب الرحمٰن موضع ویسہ ۷۴-۹-۱۹ ساڑھے بارہ بجے طویل علالت کے بعد وفات پاگئے۔ فاضل دیوبند تھے، اور جمیعۃ العلماء اسلام کے دیرینہ سرگرم کارکنوں میں اپنے علاقہ کے ناظم جمیعۃ بھی رہے ۱۹۵۳ء کی تحریک ختمِ نبوت میں نو ماہ تک اسارت سنتِ یوسفی کی سعادت بھی پائی۔

مولانا حاجی عبد القدوس ولد حاجی ملا احمد اخوند سکنہ میزئی ڈاکخانہ قلعہ عبد اللہ جان پشین ضلع کوئٹہ ایک خانقاہ کے سجادہ نشین، حق گو، نڈر عالم اور دیر بزرگ جمیعۃ العلماء اسلام کے نہایت سرگرم ممبر کی وفات ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء بروز جمعرات بوقتِ صبح نماز اور تلاوتِ قرآن کے بعد ہوئی۔ علاقہ کے علماء کرام پر بہت اثر تھا۔

جذبۂ حق کا یہ عالم کہ مولانا شمس الدین شہیدؒ کی وفات کے موقع پر ڈھائی سو میل سنگلاخ پہاڑوں میں ٹانچی پر بیٹھ کر سفر کر کے تعزیت کی اور فرمایا کہ گاڑی سے باندھ کر کھینچ بھی لو تب بھی شہید کی تعزیت کے لیے جاؤں گا۔

مولانا خیر محمد مہاجر مکیؒ: پاکستان کے مہاجر حرمین حضرت مولانا خیر محمد صاحب مکیؒ کا انتقال ۴ رجمادی الاولیٰ ۱۳۹۴ھ کو ہوا۔ نماز جنازہ مسجد حرام میں ادا ہوئی اور تدفین جنت المعلیٰ میں ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالےٰ عنہا اور سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے جوار میں۔

ذکر وفکر عبادات کے علاوہ حرم مکی میں درس کا سلسلہ مرحوم کا مشغلہ شب وروز رہا۔
حضرت مرحوم کے صاحبزادہ شیخ محمد مکی نے وفات کی اطلاع دی۔
(دعا ہے کہ) حق تعالے مرحوم کو قرب ورضا سے فائز فرمائے اور پسماندگان میں
ان کا فیض جاری رہے۔

الحق
دسمبر ۱۹۷۴ء

◎

شیخ التفسیر والحدیث علامہ محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے کہ علامۂ یگانہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی[1] ملتِ اسلامیہ کو داغِ مفارقت دے گئے۔ جو اپنے تبحرِ علمی، وسعتِ مطالعہ، سادگی، قناعت، زہد و تقویٰ کے لحاظ سے اسلافِ دیوبند کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ چلتا پھرتا علم اور زندہ کتب خانہ، علم اور کتابوں میں معمور و مخمور، بات سے بات نکلتی[2] اور عام فہم باتوں کا سرا بھی علم کے پیچیدہ عقدوں اور کلام و فلسفہ کے غوامض سے جا ملتا اور پھر چٹکیوں میں ہر مسئلہ سلجھا بھی دیا جاتا۔ علم اور مطالعہ کی دنیا میں ان پر جذب و وارفتگی کی ایسی کیفیت طاری رہتی جس کی مثالیں ہمارے عروجِ علمی کے روشن ماضی میں مل سکتی ہیں اور جو جہل و سطحیت کے اس طوفانی دور میں عنقا ہوتی جا رہی ہیں۔

الحق

محرم ۱۳۹۵ھ

---

[1] تفصیلی حالات کے لیے "تذکرہ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ از محمد میاں صدیقی" ملاحظہ ہو۔ (مرتب)

[2] حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے نام بھیجے گئے ایک کارڈ کے پتہ میں لفظ دارالعلوم حقانیہ آیا تو حقانیہ کے لفظ پر حاشیہ بھی لکھ دیا کہ مضاف اور مضاف الیہ دونوں کی صفت ہو سکتی ہے۔ (س)

علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

علامہ کاندھلوی رح کی جدائی کے ماتم سے ابھی علمی اور دینی ایوان فارغ نہیں ہوئے تھے کہ علم و سیاست میں مولانا کاندہلوی کے مکتب فکر ہی کے ایک اور ممتاز بزرگ اور راہنما حضرت علامہ ظفر احمد عثمانی قدس سرہ العزیز کا بھی وصال ہو گیا۔ سیاسی نظریات اور طرزِ عمل میں اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن جو علم، دین اور عمل ہمارے اسلاف کا طرۂ امتیاز ہے اس سے کسی متعصب مخالف کا بھی انکار کرنا علم کی ناقدر شناسی ہے۔ علامہ عثمانی مرحوم بھی مطالعہ، تصنیف، درس و تدریس، وعظ و تبلیغ، جذبۂ علم و عمل میں اپنے اسلاف کی روایات کے امین تھے، اور نہایت ہی واجب الاحترام شخصیت برّصغیر میں علم حدیث اور فقہ حنفی کی خدمت کرنے والے اکابر میں ان کا نام سرِفہرست رہے گا۔

رہ گئیں ملکی خدمات اور قیام پاکستان کے لیے ان کی جدّوجہد! تو جس جرنیل نے عمر بھر پاکستان کی خاطر پرائے تو کیا اپنوں سے بھی جھگڑا مول رکھا اور جس جرنیل نے فتح کے بعد ملک کے آدھے حصّے یعنی مشرقی پاکستان پر پاکستان کا جھنڈا لہرایا اُس کی خدمات اور کارناموں کو تاریخ کیوں فراموش کرے گی؟ اور تاریخ تو اس بارہ میں بڑی وسیع الظرف ہے وہ نہ صرف عمل اور سعی بلکہ اس کے نتائج، محرّکات اور ہر قسم کے عوامل کو بھی اپنے سینہ میں محفوظ رکھ کر اگلی نسلوں تک یہ سب کچھ منتقل کر دیتی ہے۔
مگر افسوس تو پاکستان کے سیاہ و سفید کے مالکوں پر ہے کہ اپنے ایسے جرنیلوں کی وفات پر بھی نہ تو کوئی جھنڈا سرنگوں ہوتا ہے، نہ راگ و رنگ میں کچھ وقفہ آتا ہے، نہ قومی سطح پر کوئی خراجِ تحسین اور ستائش ہوتی ہے ——— پاکستان کے لیے سب کچھ تج دینے والے بزرگوں پر پاکستان بننے کے فوراً بعد سے کر اب تک

کیا بیتی تو یہ ایک مستقل المناک باب ہے۔
بہر حال ہم علامہ عثمانی[1] قدس اللہ سرہ العزیز کی علمی اور دینی عظمتوں کو سلام کرتے ہوئے اس حادثۂ علم میں علمی دنیا کے شریک اور مرحوم کے درجاتِ عالیہ کے متمنی ہیں۔

سمیع الحق یوم العرفۃ

---

[1] **مختصر سوانحی خاکہ:**۔ آپ ۱۳ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ کو دیوبند کے محلہ دیوان میں شیخ لطیف احمد عثمانی کے گھر پیدا ہوئے۔ والدہ صاحبہ حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی حقیقی بہن تھیں۔ ابتدائی تعلیم دیوبند میں حاصل کی۔ اس کے بعد حضرت تھانوی رح سے تھانہ بھون میں پڑھتے رہے۔ تین سال تک جامع العلوم کانپور میں، اس کے بعد ۱۳۲۷ھ میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لیا اور ۱۳۲۹ھ میں مولانا خلیل احمد صاحب رح سے دورۂ حدیث پڑھ کر سندِ فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد اسی مدرسہ میں تقریباً آٹھ سال تک پڑھاتے رہے۔ ۱۳۳۸ھ میں دوسری بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ ۱۳۴۴ھ میں قرآنِ پاک حفظ کیا۔ ۱۳۴۸ھ میں تیسرا حج کیا، اور ۱۳۴۹ھ میں مدرسہ راندیریہ رنگون میں ناظم مقرر کیے گئے۔ ۱۳۵۸ھ میں ڈھاکہ یونیورسٹی تشریف لے گئے اور ساتھ ہی "اشرف العلوم" کی بنیاد رکھی۔ ۱۳۶۲ھ میں حضرت تھانوی رح کے سانحۂ ارتحال پر آپ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ سلہٹ ریفرنڈم اور تحریکِ پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا۔ خواجہ ناظم الدین وزیرِ اعلیٰ مشرقی پاکستان نے آپ کے ہاتھوں مشرقی پاکستان کی پرچم کشائی کرائی۔ ۱۹۴۹ء میں حکومت پاکستان کی طرف سے ایک خیرسگالی وفد میں سعودی عرب تشریف لے گئے۔ علماء کے جس بورڈ نے ۲۲ دستوری نکات پر اتفاق کیا تھا اُن میں ایک آپ بھی تھے۔ ۱۹۵۴ء میں دارالعلوم اسلامیہ ٹنڈوالہ یار (سندھ) میں بطور شیخ الحدیث تشریف لے گئے اور آخری وقت تک تدریسِ حدیث میں مصروف رہے۔ آپ حضرت حکیم الامت رح، مولانا خلیل احمد رح اور مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی رح کے خلیفہ مجاز تھے۔ تصنیفات میں سے فتاویٰ امداد الاحکام (۲ جلد) اعلاء السنن (۲۰ جلد) تحذیر المسلمین عن موالات المشرکین، مقدمہ انہاء السکن اور برأۃ عثمان خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ۸ دسمبر ۱۹۷۴ء کو آپ کا سانحۂ ارتحال پیش آیا اور ٹنڈوالہ یار میں دفن کیے گئے۔ (مرتب)

شیخ الحدیثؒ مولانا عبدالرحمن صاحبؒ ـــ مولانا عتیق اللہ صاحبؒ

۵ مارچ ۱۹۷۵ء کو لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور میں حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالرحمن صاحب فاضلِ دیوبند کا وصال ہوا۔ تدفین ۳ بجے بعد ظہر ان کے آبائی گاؤں مینئی تحصیل صوابی میں ہوئی حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہٗ نے جنازہ پڑھایا۔ دارالعلوم حقانیہ سے طلباء کے جمِ غفیر نے شرکت کی۔ عمر درس و تدریس میں گذری۔ تقسیم سے قبل مدرسہ امدادالاسلام میرٹھ اس کے بعد دارالعلوم چارسدہ اور پھر آخر تک مدرسہ تعلیم القرآن راولپنڈی میں شیخ الحدیث رہے[1]۔ (رحمۃ اللہ علیہ)

علاقہ بونیر ضلع سوات کے موضع ایلئی کے ایک صاحبِ رشد و ہدایت بزرگ عالم و عارف باللہ مولانا عتیق اللہ صاحبؒ کا بھی اسی ماہ وصال ہوا۔ شیخِ وقت مولانا عبدالغفور مدنی رحمہ اللہ کے خلفاء میں سے تھے۔ لائل پور[2] کی جناح کالونی میں قیام رہا۔ وفات گھر پر ہوئی۔ پسماندگان میں عالم و فاضل صاحبزادے موجود ہیں۔ دارالعلوم حقانیہ کے نہایت مخلص معاون اور خیر خواہ رہے۔ (رحمہم اللہ)

الحق ـــ مارچ ۱۹۷۵ء

---
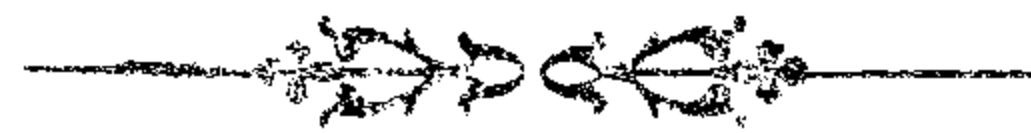
[1] تصنیفات میں "جواہر الاصول فی مصطلح احادیث الرسولؐ" اور "الکوثر الجاری" آپ کی باقیات صالحات میں سے ہیں۔ [2] فیصل آباد۔ (مرتب)

مولانا محمد زکریا بنوری رحمہ اللہ

پچھلے ماہ کراچی میں حضرت علامہ مولانا سید محمد زکریا بنوری پشاوری قدس سرہٗ کا انتقال ہوا۔ وہ حضرت علامہ مولانا محمد یوسف بنوری مدظلہٗ کے والد بزرگوار تھے عظیم بیٹے کے عظیم والد[1]، علم و عمل میں منفرد، اکابر علماء کا نمونہ، حسنِ خلق، ظرافتِ مزاج، شفقت و محبت کا پیکر، علمی تبحر، عقلیات، طب اور تصوف جیسے علوم میں اعلیٰ بصیرت رکھنے والے اور ذی رائے بزرگ کا سانحۂ وفات نہ صرف علامہ بنوری مدظلہٗ بلکہ پوری علمی دنیا کے لیے صدمہ ہے۔ اور پوری علمی دنیا ان کے ساتھ اس غم میں برابر کی شریک ہے۔ حق تعالیٰ حضرت مرحوم کو بہترین مقاماتِ قرب و رضا عطا فرماوے، اور حضرت بنوری مدظلہٗ اور ان کے خاندان کو صبرِ جمیل نصیب ہو۔

(الحق ـــــ جولائی ۱۹۷۵ء)

---

[1] محدثِ عصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ اپنے عظیم والد کے سانحۂ ارتحال پر ارقام فرماتے ہیں:۔

"والدِ محترم کی وفات حسرت آیات صرف ایک والد کی مرثیہ خوانی نہیں بلکہ علم و عرفان کا مرثیہ ہے۔ ایک صاحبِ کرامات و خوارق عارف باللہ کا ماتم ہے، ایک محقق روزگار کا نوحہ ہے، ایک فیلسوف عصر کا ماتم ہے۔ ایک اولوالعزم وجود کی جدائی پر اظہارِ حزن ہے۔ مجاہدات و ریاضات میں مصروف رہنے والی عظیم شخصیت کا درد و الم ہے۔ ایک صاحبِ کمال معتبر کا نوحہ ہے۔ ایک باخدا صاحبِ مکارم اخلاق، جود و سخا، ہمت و شجاعت کا نالہ و شیون ہے۔ ایک گوشہ نشین صوفی، صاحبِ صدق و صفا کی جدائی و فراق کا درد و غم ہے۔ ایک عاشقِ رسول کا درد و اضطراب ہے۔ شریعتِ اسلامیہ کے یگانۂ روزگار فاضل کے لیے نالہ و فریاد ہے۔ طریقت و حقیقت کے واقفِ رموز کا حزن و غم ہے" ـــــ وفات کے وقت ان کی عمر سو سال تھی۔ اس طرح ان کی بہن اور والدہ صاحبہ کی پیشگوئی صحیح ثابت ہوئی ـــــ ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۵ھ / ۵ جون ۱۹۷۵ء کو ان کے ارتحال کا سانحہ پیش آیا۔ (مرتب)

مولانا ابوالوفاء افغانیؒ

ہندوستان کے حیدرآباد دکن میں پچھلے ماہ حضرت مولانا ابوالوفاء[1] افغانی قدس سرہٗ کا انتقال ہوا۔ مرحوم اپنے علم، تقویٰ، زہد کے ذاتی کمالات کے علاوہ فقہ حنفی کے عظیم محسنین میں سے تھے انہوں نے ساری زندگی قدمائے ائمہ احناف کے علمی ذخیروں کے احیاء اور فقہ حنفی کے اولین مآخذ کی اشاعت اور احیاء میں صرف کی اور گمنامی کی زندگی کو ترجیح دی، موصوف کی جدائی عالم اسلام کے لیے بالعموم اور حنفی دنیا کے لیے بالخصوص ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ حق تعالیٰ مرحوم کو اپنی بارگاہ میں بہترین مقام قرب عطاء فرمائے[2]

الحق ــــــ ستمبر ۱۹۷۵ء

---

[1] امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے تلامذہ امام محمد بن الحسنؒ وغیرہ متقدمین کی اصل کتب کی اشاعت کے لیے آپ نے حیدرآباد دکن میں "احیاء المعارف النعمانیہ" کے نام سے عظیم الشان ادارہ قائم کیا، امام محمدؒ کی کتاب الآثار کی شرح لکھی۔ افغانستان قندھار کے باشندے تھے، رجب ۱۳۹۵ھ میں حیدرآباد دکن میں انتقال فرمایا۔

[2] مولانا (سمیع الحق) کے نام ایک مراسلے میں لکھتے ہیں:۔

جلال کوچہ ۲۶۵ حیدرآباد دکن ۲

دوشنبہ ۱۲ محرم ۱۳۸۹ھ

مولانا المحترم دام کرمہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ! امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔ آپ کا مؤقر مجلہ الحق رجب و شعبان کے اعداد اور اسکے بعد بھی تا ذی الحجہ متواتر موصول ہوتے رہے آپکی اس عنایت پر میں تہہ دل سے شاکر ہوں ماشاء اللہ بہت ہی علمی و معیاری مجلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق فرمائے کہ اسے دائم رکھیں اور قوم کو اس سے منفعت پہنچے ــ والسلام / ابوالوفاء ـــــ (مرتب)

صومالیہ میں علماء کی شہادت

درندگی اور بربریت کا شرمناک مظاہرہ

افریقی حکومت صومالیہ کے دارالخلافہ کے ایک کھلے میدان میں دس مسلمان علماء اور راہنماؤں کو زندہ جلادینے کی خبروں سے عالم اسلام میں تشویش اور احتجاج کی لہر دوڑ گئی ہے صومالیہ افریقہ کا ایک ایسا ملک ہے جس کی ساری آبادی غیور مسلمانوں پر مشتمل ہے مگر موجودہ اشتراکی حکومت نے برسر اقتدار آتے ہی صومالیہ کا رشتہ اسلام اور عربی زبان سے کاٹ کر کمیونسٹ ممالک سے جوڑنے کی کوششیں شروع کیں، مساجد میں بھی عربی اور دینی تعلیم پر پابندی لگادی گئی۔ دینی کے نجی دینی ادارے بھی بند کر دیئے گئے۔ اس پر مسلمان اُٹھ کھڑے ہوئے مگر احتجاج کرنے والوں کو مشقِ ستم بنایا۔ اور اب تازہ اقدام یہ کیا کہ عورتوں اور مردوں کے نام نہاد غیر اسلامی مساوات کے نام سے نکاح وطلاق کے قطعی عائلی مسائل میں دخل اندازی کی، یہاں تک کہ وراثت کے مخصوص احکام میں بھی تبدیلی کر کے اس میں مرد اور عورت کو برابر قرار دیا —— یہ قرآنی نصوص میں صریح مداخلت تھی، اور جس کی کچھ مثالیں ہمارے ہاں رُسوائے عالم عائلی قوانین کی شکل میں پہلے سے موجود ہیں —— صومالیہ کے علماء حق اور غیور مسلمانوں نے اس لادینی اور اشتراکی جسارت پر صدائے احتجاج بلند کی، حکومت نے اندھا دھند گرفتاریاں شروع کیں، یہاں تک کہ دس مجاہدین کو ایک کھلے میدان میں زندہ جلادیا گیا صومالی حکومت کی اس بہیمیت، درندگی، وحشیانہ اور بزدلانہ حرکت پر اسلامی دنیا میں احتجاج ہو رہا ہے، یہاں تک کہ اقوام متحدہ نے بھی اس پر نفرت ظاہر کی ہے —— بدقسمتی یہ ہے کہ عالم اسلام کی اکثریت کو ہر جگہ ایسے مادر پدر آزاد نام نہاد مسلمان حکمرانوں کا سامنا ہے جو کرسی اور مفاد کی خاطر نام تو اسلام کا رکھنا چاہتے ہیں مگر ثقافتی، تعلیمی اور فکری لحاظ سے یورپ یا اشتراکی دنیا کے

غلام ہوتے ہیں۔ تجدد اور ماڈرن ازم ان کی بیماری ہے[۱] وہ ہر چیز کو مغرب کی دُنیا پرست یا کیمونزم کی مادہ پرست نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ان لوگوں کی غلامانہ ذہنیت کی وجہ سے ان کی اپنی مسلم شخصیت، انفرادی تشخص مٹ چکا ہوتا ہے۔ یہ طبقہ حمیتِ دینی اور اخلاق انسانی اور غیرت ملی سے عاری ہو چکا ہوتا ہے۔ مگر المیہ یہی ہے کہ دُنیا کے تقریباً ایک ارب مسلمانوں کی اتنی بڑی طاقت پر ہر جگہ حکمرانی اور اقتدار اس چھوٹی سی اقلیت کو حاصل ہوتی ہے جو ذہن و فکر کے لحاظ سے قطعی غیر مسلم اور غیروں کا آلہ کار ہوتی ہے۔ انقلاب یورپ کے بعد مسلمانوں پر یورپ مغربیت اور کمیونزم کا جو سب سے بڑا ظلم ہے، وہ یہی کہ ایک مختصر سا برسر اقتدار طبقہ جو نام کا مسلمان ہوتا ہے مسلمانوں کے سیاہ و سفید کا مالک بن کر صرف دنیا کے نہیں مسلمانوں کے دین و شریعت کا بھی فیصلہ کرنے لگتا ہے۔ یہ متجدد دین، ماڈرن، لبرلسٹ، انارکسٹ اور کمیونسٹ ذہن کے نام نہاد مسلمان عالم اسلام کے لیے سب سے بڑی لعنت ہیں اور جب تک دُنیا بھر کے مسلمان اس صورتحال سے نجات نہیں پائیں گے، صومالیہ جیسے شرمناک واقعات ہوتے رہیں گے، دین میں مداخلت بھی ہوگی اور قطعی مسلّماتِ دین میں تحریف بھی، اور مسلمانوں کی سرزمین پر مسلمان حکمرانوں کے ہاتھوں دینی، ثقافتی اور اخلاقی قدریں پائمال ہوتی رہیں گی۔

الحق
سنہ ۱۹۷۵ء

◎

---

[۱] بقول علامہ اقبال مرحوم ؎
تُو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے
(مرتب)

مولانا سیّد محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ

پچھلے ماہ علم و عمل کی اسلامی دنیا عموماً اور مسلک دیوبند کے عالم رشد و ہدایت کو خصوصاً سخت صدموں سے دوچار ہونا پڑا۔ ہندوستان کے ممتاز عالم مولانا محمد میاں صاحبؒ انتقال فرما گئے۔ پاکستان کے ممتاز ادیب آغا شورش کاشمیریؒ واصل بحق ہوئے، اور دیگر کئی علمی و دینی شخصیتوں نے عالم آب و گل کو الوداع کہا۔

مولانا محمد میاں[1] دہلوی مرحوم نے زندگی بھر حق کا ساتھ دیا۔ جہاں وہ مجاہدین جادۂ حق کے ایک شہسوار تھے وہاں انہوں نے مغل سلطنت کے طاغوت اکبر، اکبر کے عہدِ لادینی سے لے کر تقسیمِ ہند تک علماء حق کی داستانِ جہاد و عزیمت کو مرتب اور مدون کیا۔ دجل و تلبیس کی تاریکیوں اور ایمان فروشی کے بازاروں سے علم و یقین اور جہاد و عمل کے ہیروں کو نکال نکال کر علماء حق کے شاندار ماضی کو اجاگر کیا۔ وہ جمعیتہ العلماء ہند کے ترجمان اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے معتمد خاص تھے۔ اس کے ساتھ علومِ قرآن و سنت کی تدریس سے بھی اپنی زندگی آراستہ رکھی۔ آخری زندگی میں انہوں نے حضرت شیخ الہندؒ کی

---

[1] دیوبند کے مشہور خاندان سادات رضویہ سے آپ کا تعلق ہے ۱۹۰۲ء/۱۳۲۱ھ میں ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے دارالعلوم دیوبند سے ۱۳۴۴ھ میں فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد اولاً صوبہ بہار اس کے بعد مدرسہ شاہی مرادآباد میں بحیثیت مفتی و مدرس کام کیا۔ جمعیتہ العلماء ہند کے مخلص اور کارگذار لیڈروں میں تھے انہیں برطانوی دور میں کئی مرتبہ قید و بند سے گذرنا پڑا جمعیتہ العلماء ہند کی تاریخ میں آپ کی سیاسی اور تصنیفی خدمات ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ ان کی تحریریں بڑی مستند سمجھی جاتی ہیں۔ اور یورپ و امریکہ کے مصنفین بھی انکے حوالے دیتے ہیں۔ زندگی کے آخری دور میں مدرسہ امینیہ دہلی کے شیخ الحدیث اور ادارہ مباحث فقہیہ کے معتمد رہے۔ ۱۳۷۰ھ سے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ ۱۶ شوال ۱۳۹۵ھ/۲۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو آپ نے رحلت فرمائی۔ (مرتب)

عالمگیر اور محیر العقول تحریک ریشمی رومال پر دستاویزی حقائق شائع کیے۔ اسلام کے اقتصادی معاشرتی اور سماجی مسائل پر گرانقدر کتابیں لکھیں۔ سیرتِ طیبہ پر عصرِ حاضر کی روشنی میں ان کی جاندار اور مؤثر کتاب کے کچھ حصے اصل کتاب سے پہلے الحق میں شائع ہوئے۔ ادارہ الحق اور خدام الحق سے بھی ہمیشہ محبت و شفقت فرماتے رہے۔ آج وہ خادمِ علم و دین اور مجاہدِ جلیل جس کی زندگی علماء حق کی روشن مثال تھی خود علماء حق کے شاندار ماضی[1] کا ایک روشن باب بن چکا ہے۔ حق تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور عالم بالا کے اسلامی اُفق پر مجدد الف ثانیؒ سے لے کر شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ تک ائمہ رشد و ہدایت اور ارباب صدق و صفا کی جو بزم سجی ہوئی ہے اس میں بہترین مقام عطا فرماوے۔

الحق

ذیقعدہ ۱۳۹۵ھ

---

[1] مرحوم کی مشہور کتاب " علماء ہند کا شاندار ماضی " کی طرف اشارہ ہے۔ (مرتب)

حافظ منیر احمد شاہ
شہید ناموسِ صحابہؓ

امروٹ شریف سندھ میں امروٹی خانقاہ[1] کے چشم وچراغ حافظ منیر احمد شاہ صاحب کی شہادت پورے ملک کے سُنّی سوادِ اعظم کیلئے عبرت ونصیحت کا مقام ہے۔ مرحوم صحابہ کرامؓ کی سب وشتم گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ اہلِ رفض کے ایسے مظاہروں پر چیں بجبیں ہوئے جو اس سے پہلے امروٹ کی پاکیزہ سرزمین پر نہیں کیے گئے تھے۔ حکومت اہلسنت کے حقوق اور شانِ صحابہؓ کیلئے لڑنے والے مولانا قاضی مظہر حسین صاحب جیسے بزرگوں کی قید وحراست سے فارغ ہوجائے تو شاہ صاحب مرحوم کے قاتلوں پر توجّہ دے۔ یہ شہادت بھی بہر حال شہادت ہے اور اس کا حق اہل سنت والجماعت کو ماتم ونوحہ سے نہیں، دینی حمیّت، بیداری اور صورتحال کا عمیق جائزہ لینے کی صورت میں ادا کرنا چاہیے۔ ہم مرحوم کے والد بزرگوار اور تمام متعلّقین کے ساتھ اس غم میں شریک ہیں۔

الحق

جنوری ۱۹۷۶ء

---

[1] اس کی بنیاد تحریک ریشمی رومال اور تحریک شیخ الہندؒ کے نامور سپوت عارف باللہ مرشد کامل، تاج الاولیاء مولانا تاج محمود صاحب امروٹی قدس سرہٗ نے اپنے مُرشد سید العارفین حافظ محمد صدیق صاحب بھرچونڈوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایماء پر رکھی تھی۔ (مرتب)

مولانا عبدالباری ندوی رحمہ اللہ

پچھلے دنوں برصغیر کے علمی و دینی حلقوں کو متعدد علمی صدموں سے دوچار ہونا پڑا اور دنیائے علم و دین کے سرمایہ میں نہ پوری ہونے والی کمی آگئی۔ بھارت کے صاحبِ دل متکلمانہ اور عارفانہ شان رکھنے والے فلسفی اور صوفی عالم مولانا عبدالباری صاحب[1] ۲۷ محرم ۱۳۹۶ھ کی صبح کو لکھنؤ میں ۸۵ برس کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ ندوۃ العلماء کے صحن میں مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور عصرِ حاضر کے جدید علوم کے نہ صرف بصیر بلکہ نقاد شخصیت کو سپردِ خاک کیا گیا۔ مرحوم ندوہ کے اولین ثمراتِ علم و فضل میں سے تھے۔ علامہ شبلیؒ کے تلمیذِ رشید علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ہمدرس و ہمشرب اور علامہ مناظر احسن گیلانیؒ کے رفیقِ خاص، قدیم و جدید کے جامع، جامعہ عثمانیہ دکن کے شعبۂ فلسفہ کی صدارت پر فائز ہوئے اور فلسفہ و سائنس کے دقیق اور غامض مباحث پر نہ صرف دسترس بلکہ تنقیدی نگاہ سے طبیعیات کے علوم جدیدہ، سائنس اور فلسفہ کے بارہ میں اسلام اور مذہب کے نقطۂ نگاہ کو واضح طور پر پیش کیا اور ثابت کیا کہ صحیح مشاہدہ اور سائنس پر مبنی کوئی نظریہ اسلام کیلئے چیلنج نہیں بن سکتا۔ ہمارے ہاں مذہب اور سائنس کی حدود اور دوائر کار کی نشاندہی کرنے والے علماء میں آپ کا کام سرِفہرست رہے گا۔ پھر عقل و فلسفہ کے ساتھ تصوف و سلوک کا نباہنا کارے دارد۔ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے علوم و معارف کو نہ صرف جذب کیا بلکہ آپ کے تجدیدی کارناموں پر طویل و ضخیم کتابیں لکھیں۔ اور اس طرح عمل کے ساتھ علم و قلم کے میدان میں بھی جام و سندان کو نباہا۔ فرحمھما اللہ وارضاھم۔

الحق ـــــ مارچ ۱۹۷۶ء

---

[1] تاریخ پیدائش ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۰۶ھ بمقام ضلع بارہ بنکی (بھارت)۔ تفصیلی حالات کیلئے ملاحظہ ہو "بزمِ اشرف کے چراغ" ص ۲۹۲ (مرتب)

مولانا مفتی مہدی حسن صاحب رحمہ اللہ

اپریل ۱۹۷۶ء کے آخر میں مولانا مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہانپوری[1] سابق صدر دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۹۶ برس کی عمر میں واصل بحق ہوئے وہ مدتوں دارالعلوم کے صدر مفتی رہے۔ زندگی تدریس، تصنیف اور افتا جیسی خدمات جلیلہ میں بسر ہوئی۔ فقہ اور فتاویٰ کے علاوہ انہیں علم حدیث اور فن اسماء الرجال سے بھی گہرا شغف رہا۔ علم وفضل کے ساتھ شعر وسخن کا بھی ذوق تھا۔ آپ کے علمی حسنات میں امام محمد شیبانیؒ کی وقیع کتاب "الحجۃ لاہل المدینۃ" جو آپ کی تحقیق اور تعلیقات سے دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ قلائد الازھار دو جلدوں میں اور محلّی لابن حزمؒ پر رسالہ "السیف المجلّی" بھی آپ کے آثارِ علمی میں شامل ہیں، آپ کی وفات سے جماعت دیوبند ایک محقق عالم، مصنف اور فقیہ اور جید الاستعداد صائب الرائے مفتی سے محروم ہوگئی ہے۔ حق تعالیٰ اس خلاء کو پُر فرماوے اور مرحوم کو مقاماتِ قرب ورضا اور درجاتِ علم وفضل پر فائز فرمادے۔ آمین

الحق

جولائی ۱۹۷۶ء

◎

---

[1] آپ ۱۳۰۱ھ میں پیدا ہوئے تکمیل تعلیم ۱۳۲۶ھ میں مدرسہ امینیہ دہلی میں کی۔ دارالعلوم دیوبند کے ۱۳۲۸ھ کے جلسہ دستار بندی میں ان کی بھی دستار بندی ہوئی تھی ۱۳۶۷ھ میں انہیں دارالعلوم کے دارالافتاء میں صدر مفتی کے منصب پر مامور کیا گیا۔ آپکے زمانہ صدارت میں دارالعلوم سے ۳۲۴۵۴ فتاویٰ جاری ہوئے فقہ حنفی میں بے نظیر مہارت کے ساتھ اسماء الرجال پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ شاعری کا ذوق بھی تھا اور آزاد تخلص تھا۔ طویل علالت کے بعد اپنے وطن شاہجہان پور میں ۲۸؍ ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ کو وفات پائی۔ (مرتب)

آہ مولانا خان بہادر صاحب
عرف مولانا مارتونگ مرحوم

۲۱ رجب ۱۳۹۶ھ بروز جمعرات زوالِ آفتاب کے بعد تین بجے ہزارہ کے کوہستانی علاقوں میں علم و فضل کا ایک ایسا آفتاب غروب ہوگیا جس کی ضیاء باریوں سے پون صدی تک ایک عالم فیضیاب ہوتا رہا۔ بقیۃ السلف شیخ الکامل جامع المعقول و علامہ مولانا خان بہادر عرف مولانا مارتونگ[1] صاحب قدس سرہ العزیز کا انتقال ہوگیا۔ عمر مبارک ۸۰/۸۵ کے لگ بھگ ہوگی۔ پچھلے چند سالوں سے صاحب فراش تھے۔ جمعرات کی ظہر کو دورۂ قلب پڑا، اور تھوڑی دیر بعد واصل بحق ہوگئے۔ دوسرے دن نمازِ جمعہ کے بعد انہیں اپنے گاؤں مارتونگ علاقہ چکیسر کے خاندانی قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ نمازِ جنازہ ان کے بڑے صاحبزادہ مولانا رشید احمد نے پڑھائی، اور دشوار گذار راستوں کے باوجود اطراف و اکناف سے علماء، صلحاء اور عام مسلمانوں نے اس میں شرکت کی۔

حضرت مرحوم بھی ان اکابر علم و فضل میں سے تھے جن کی ذات علم و عمل، زہد و تقویٰ، تبحر و رسوخ کی

---

[1] آپ ۱۳۱۶ھ کو سوات کے کوہستانی علاقہ چغرزئی میں بمقام ڈیری مضافات دیدل کماچ پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ اور مضافاتِ ہزارہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے دہلی اور ٹونک و فتحپوری میں تحصیل و تکمیل علوم کی اور مولانا حافظ عبدالرحمن صاحب امروہوی رحمۃ اللہ علیہ سے سندِ فراغ حاصل کی۔ آپ کے اساتذہ میں یہ مشاہیر قابلِ ذکر ہیں: مولانا قطب الدین صاحب غورغشتوی، مولانا پوردل صاحب قندھاری، مولانا سیف الرحمن مہاجر کابل، مولانا غلام نبی گیدڑپور اور حکیم برکات احمد وغیرہم۔ ۲۳ رجب ۱۳۹۶ھ کو بعمر ۸۰ سال آپ کا انتقال ہوا۔ تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو: ماہنامہ الحق بابت شوال، ذی الحجہ، محرم الحرام ۱۳۹۲/۹۳ھ۔ (مرتب)

جامع اور شریعت وطریقت کی سنگم ہوتی ہے ایسی عبقری شخصیتوں کے حالات ہم صرف کتابوں میں پڑھ سکتے ہیں۔ زوال وانحطاطِ علم کے اس دور میں ایسے نمونے عنقا نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ مولانا مرحوم نے ساری زندگی دین اور علومِ دین کی تدریس میں گذاری تصوف وسلوک، اصلاح وتزکیہ نفوس کے کام میں بلند مقام پر فائز تھے، علومِ عقلیہ منطق، ریاضی اور فلسفہ میں تو اپنے دور میں "امامت" کا منصب رکھتے تھے مگر اس میدان میں معقولات کے کلاسیکل کتابوں پر کامل عبور اور دن رات مطالعہ وتدریس کے باوجود مشاغل اور باطنی وظاہری کیفیات واحوال پر خشک عقلیت اور فلسفیانہ خصوصیات کا سایہ تک نہیں پڑا تھا بلکہ زندگی عبادات واعمال اور توجہ الی اللہ استغراق و انابت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ نام ونمود اور نمائش سے کوسوں دُور اور کفافِ حیات پر قانع وصابر رہے۔ فقر وسادگی کی ایسی تصویر کہ ہر ہر حرکت سے سادگی اور بے نفسی ٹپکتی تھی ۔۔۔ بانی ریاست سوات میاں گل عبدالودود صاحب کے نہ صرف مقربین میں سے بلکہ ان کے مقتداء اور استاذ تھے۔ مگر اصرار کے باوجود ان کے شاہی محل میں قیام اور تمام شاہی مراعات پر مینگورہ کی ایک چھوٹی سی مسجد کے حجرہ میں طلبہ کے ساتھ گھاس اور چٹائیوں پر سکونت کو ترجیح دی۔ علمی تعمق اور پختگی بے مثال تھی اور حافظہ بے نظیر معقولات کے علاوہ علومِ حدیث میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ زندگی کا ایک بڑا حصہ حدیث کی درس وتدریس میں گذارا ۔۔۔ دارالعلوم کے لیے علم اور دین کے رشتوں کے علاوہ جس نے مشرق ومغرب کے اہل علم اور مسلمانوں کو ایک دھاگے میں باندھ رکھا ہے مولانا مرحوم کی خصوصی عنایتوں نے سانحہ کی شدت کو اور بھی بڑھا دیا ہے ۔۔۔ دعا ہے کہ مرحوم کے برکات جاری وساری رہیں اور ان کے تمام متوسلین واقارب کو صبرِ جمیل نصیب ہو۔

الحق

ستمبر ۱۹۷۶ء

◎

فقیہ العصر مفسّرِ قرآن مفتی اعظم

مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ

۵۔ ۶ اکتوبر ۱۹۷۶ء کی درمیانی شب کو کراچی میں علم و فضل کا ایک ایسا آفتاب و ماہتاب غروب ہو گیا جسکی ضیاء پاریوں سے پون صدی تک برّصغیر کی علمی دنیا مستنیر ہوتی رہی۔ علم و عرفان کی وہ بساط اُجڑ گئی جو قیام پاکستان کے بعد کراچی جیسے صنعتی اور مادی مرکز میں علمی اور روحانی سیرابی کا سامان بنی رہی۔

اسلاف کے کاروانِ علم و فضل کے فردِ فرید، دنیائے فقہ و شریعت کے گوہر تابندہ، فقیہ الملّت، مفسّرِ عصر، محقق بے بدل، مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ واصلِ بحق ہوئے۔ وقعت الواقعۃ، فانّا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت مفتی صاحب کے ہم مشرب بزرگ علّامہ سلیمان ندویؒ نے اپنے مرشد حکیم الامت تھانویؒ کے وصال پر کہا تھا ؎

اے دل خموش صبر و رضا کا مقام ہے
نقشِ دوامِ فیض مٹایا نہ جائے گا

اور آخر میں مقطع تھا کہ ؎

چاہا خدا نے تو تری محفل کا ہر چراغ
یونہی جلا کرے گا بجھایا نہ جائے گا

آج بزمِ اشرفؒ کی محفل دوشین کا چراغ خموش ہو گیا ہے مگر اس کی ضوفشانیاں قائم رہیں گی۔ اور اس چراغِ علم و عرفان کی فیوضِ خیر و برکت کا چراغ جلتا رہے گا۔ حضرت

مفتی صاحب مرحوم کی دینی و علمی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ ایک کم سواد غمزدہ اپنے تعزیتی کلمات میں کسی ایک گوشہ کا بھی احاطہ نہیں کر سکتا حضرت کی ذات شریعت و طریقت کا سنگم اور علم و معرفت کا مجمع البحرین تھی۔ وہ اکابر دیوبند کے اُس سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی تھے جنہیں دیکھ کر اللہ یاد آجاتا اور جن کے وجود سے زمین کی تمکین قائم رہتی ہے۔ اور جن میں سے ایک ہستی علامہ انورشاہ کشمیریؒ کو دیکھ کر عالم اسلام کے مشہور فاضل علامہ رشید رضا مصری نے کہا تھا: واللّٰہ مارأیت مثل ھذا قط (واللہ میں نے ان جیسا شخص کبھی نہیں دیکھا۔) اور ان اکابر کے مادر علمی دیوبند کی عظمت تو ایسی ان کے دل پر نقش ہوئی کہ فرمایا: لولم اَرھا لرجعت من الھند حزیناً۔ (اگر میں دیوبند کو نہ دیکھ چکا ہوتا تو ہندوستان سے غمگین جاتا۔)

حضرت مفتی صاحبؒ کو ان اسلاف کا علم و عمل، زہد و تقویٰ، تبحّر اور جامعیت ورثہ میں ملی، انہوں نے اس وراثت کو اخیر دم تک سینہ سے لگائے رکھا، اور جاتے وقت یہ امانت اپنے اخلاف کے سپرد کر دی ؎

اھیم بلیلیٰ ما حییتُ وان امت
اوکلّ بلیلیٰ من یھیم بھا بعدی

حضرت مرحوم ۱۳۱۴ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے تعلیم و تربیت کے مراحل مرکز علوم اسلامیہ دارالعلوم میں وقت کے ممتاز علماء سے طے کئے۔ ۱۳۳۵ھ میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد قیام پاکستان تک دارالعلوم دیوبند میں افتاء و تدریس اور تصنیف و تالیف کی خدمات جلیلہ میں مشغول رہے، اس دور میں آپ نے قادیانیت کے خلاف اپنے استاذ مولانا کشمیریؒ کی رہنمائی و رفاقت میں علمی و قلمی محاذ پر عظیم الشان جہاد کیا۔ اور ختم نبوت کے موضوع پر اسلامی علم کلام و عقائد میں بہترین اضافہ کیا۔ بیعت اولاً حضرۃ شیخ الہندؒ سے فرمائی ان کے وصال کے بعد ۱۳۴۲ھ یا ۱۳۴۳ھ میں حضرت حکیم الامتؒ سے تجدید بیعت کی اور ایسا ربط و تعلق ان سے استوار ہوا کہ ان ہی کے ہو کر رہ گئے اور تحریک آزادی کے سیاسی ہنگاموں میں بھی ان سے رہنمائی لیتے رہے۔ حضرت حکیم الامت

کہ علمی کاموں میں آپ پر اتنا اعتماد تھا کہ اکثر تصنیفی اور تحقیقی کاموں میں انہیں اپنا شریکِ کار بنایا اور جو کام حضرت حکیم الامتؒ بوجہ ضعف یا مشاغل خود نہ کر سکتے ان کی تکمیل آپ سے کرائی مثلاً حیلہ ناجزہ اور احکام القرآن جیسی علمی اور تحقیقی خدمات آپ سے کروائیں۔ حضرت حکیم الامتؒ کے فقہی، تفسیری اور تحقیقی خدمات کا رنگ آپ کے خلفاء میں حضرت مفتی صاحبؒ پر بہت گہرا رہا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کا خاص وصف فتویٰ نویسی بھی رہا ہر فتویٰ فقہی جزئیات کی تتبع و استقصاء اور اصول و جزئیات پر گہرے نظر کا غمّاز ہوتا۔ عصرِ حاضر کی علمی مشکلات اور حوادث و نوازل کے پیچیدہ مسائل میں علماء اجلہ بھی آپ ہی کی طرف رجوع فرماتے، یہاں تک کہ خود حضرت حکیم الامتؒ نے کئی بار ذاتی معاملات میں حضرت مفتی صاحبؒ سے استصواب فرما کر اس پر عمل کیا۔ ایسے ہی ایک فتویٰ کے جواب میں حکیم الامۃ مولانا تھانویؒ نے انہیں لکھا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میرے بعد بھی کام کرنیوالے موجود ہیں۔

ہزارہا ہزار فتاویٰ کے علاوہ علوم اسلامیہ قرآن و حدیث، تفسیر و فقہ۔ کلام و عقائد، شعر و ادب، قانون و سیاست، معاشیات، و معاشرت کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس پر آپ نے گرانقدر تصانیف نہ چھوڑی ہوں۔ اخیر عمر میں ضعف و علالت کے باوجود معارف القرآن کے نام سے وہ عظیم الشان تفسیر مکمل فرمائی جس نے پہلی بار اردو زبان میں ایک بڑی خلاء کو پُر کر دیا۔ تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ روحانی اصلاح و تربیت کا سلسلہ بھی جاری رکھا، اصابت رائے، تدیّن و تقویٰ، ضبط و نظم اور سب سے بڑھ کر تواضع انکساری اور تحمّل و شفقت میں وہ اکابر کی تصویر تھے، اسی افتادِ طبع کی بناء پر وہ منکرات کے مقابلہ اور اربابِ اقتدار پر تنقید میں بھی مقابلے اور مجادلے کی بجائے داعیانہ اور حکیمانہ طریقِ کار پسند فرماتے اور خاموشی سے اصلاح احوال میں کوشاں رہتے، اسی انداز میں آپ نے صدر ایوب کو حکمت و موعظت سے خطوط لکھے اور اسی انداز میں صدر یحییٰ کو مراسلات کے ذریعہ متوجّہ کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جس کے قیام میں آپ کا بھی حصہ تھا (اور اس باب میں آپ اپنے مرشد حکیم الامت تھانویؒ اور اپنے استاد مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

کے ہمنوا اور شریک کار رہے۔) آپ نے پاکستان میں شریعتِ اسلامی کے نفاذ کی بھرپور کوشش کی قراردادِ مقاصد کی تکمیل میں آپ کا اہم حصہ تھا۔ پھر ہر اہم موقعہ پر سیاسی میدان میں اپنی حد تک اصلاحِ احوال کی سعی فرماتے رہے، مگر قول وعمل میں سیاسی زعماء کی منافقت اور ان کے پرفریب اسلامی دعوؤں کے تسلسل نے بالآخر آپ کو مایوس کر دیا اور خارزارِ سیاست سے کنارہ کش ہو کر علمی و دینی خدمات میں مصروف ہو گئے جو ان کے ذوق و انہماک کا اصل میدان تھا۔ ان کے صدقاتِ جاریہ میں کراچی کا مشہور دار العلوم بھی ہے،

لہ چنانچہ معارف القرآن صفحہ ۶۲-۶۳ جلد نمبر ۱ پر رقمطراز ہیں:

"۲۰ رجمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ مطابق یکم مئی ۱۹۴۸ء میری عمر میں عظیم انقلاب کا دن تھا۔ جس میں وطن مالوف مرکزِ علوم دیوبند کو خیرباد کہہ کر صرف چھوٹے بچوں اور ان کی والدہ کو ساتھ لیکر پاکستان کا رخ کیا۔ والدہ محترمہ اور اکثر اولاد اور سب عزیزوں اور گھربار چھوڑنے کا دلگداز منظر اور جس طرف جا رہا ہوں وہاں ایک غریب الوطن کی حیثیت سے وقت گزارنے کی مشکلات کے ساتھ ایک نئی اسلامی حکومت کا وجود اور اس میں دینی رجحانات کے بروئے کار آنے کی خوش کن امیدوں کے ملے جلے تصوّرات میں غلطاں و پیچاں۔

دہلی اور چند مقامات میں اترتے ہوئے ۲۶ رجمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ مطابق ۶ مئی ۱۹۴۸ء کو اللہ تعالیٰ نے حدودِ پاکستان میں پہنچا دیا۔ اور کراچی غیر اختیاری طور پر اپنا وطن بن گیا۔ یہاں آئے ہوئے اس وقت پندرہ سال پورے ہو کر تین ماہ زیادہ ہو رہے ہیں۔ ان پندرہ سال میں کیا کیا اور کیا دیکھا اسکی سرگذشت بہت طویل ہے۔ یہ مقام اس کے لکھنے کا نہیں جن مقاصد کیلئے پاکستان محبوب و مطلوب تھا اور اس کے لیئے سب کچھ قربان کیا تھا۔ حکومتوں کے انقلابات نے ان کی حیثیت ایک لذیذ خواب سے زیادہ نہ چھوڑی ؂

بلبل ہمہ تن خون شد و گل ہمہ تن چاک
اے وائے بہارے اگر ایں است بہارے

حکومت کے راستے کسی ذہنی انقلاب اور نمایاں اصلاح کی امیدیں خواب وخیال ہوتی جاتی ہیں (م)

جنہیں آپ نے ایک عظیم مرکز بنا کر چھوڑا اور اخلاف میں ہزاروں متوسلین کے علاوہ ان کے قابلِ فخر صاحبزادگان بالخصوص برادرِ گرامی مرتبت مولانا محمد تقی عثمانی مدیر البلاغ جو ان کے لئے سرمایۂ خیر ہیں اور جنہیں خدا نے حضرت مفتی صاحبؒ کے کمالات وصفات سے وافر حصہ دیا ہے۔ اپنے والد بزرگوار سے نہایت گہرے روحانی وعلمی تعلق نے یہ سانحہ ان کے لئے اور بھی شدید بنا دیا ہے، اور اس ناچیز سے برادرِ موصوف کا جو تعلق اخوت و وداد ہے۔ اس بناء پر یہ سانحہ فاجعہ تو میرے لئے بھی ذاتی نوعیت کا بن گیا ہے۔ اور میں خود مستحق تعزیت بن چکا ہوں۔ اب، ان سے تعزیت کروں بھی تو کن الفاظ میں، اور کروں بھی تو کیونکر کہ اسے موہم اجنبیت سمجھتا ہوں۔

دارالعلوم حقانیہ سے حضرت مفتی صاحبؒ کا جو تعلق خاطر رہا اس کے بانی شیخ الحدیث مدظلہٗ سے زمانہ قیامِ دیوبند کے رشتۂ تعلیم وتدریس میں اشتراک ان سب باتوں نے بھی دارالعلوم حقانیہ اور الحق کو شریکِ غم بنا دیا ہے اور دارالعلوم اپنے تمام طلباء و اساتذہ کے ساتھ ایصالِ ثواب اور دعائے رفع درجات میں پوری ملتِ مسلمہ کا شریک ہے۔

الحق

اکتوبر ۱۹۷۶ء

لہ تفصیلی حالات کے لیے "البلاغ" "مفتی اعظم نمبر" ملاحظہ ہو۔ (مرتب)

مولانا اطہر علیخان رح
مولانا مفتی فیض اللہ رح

یہ عجیب سوءِ اتفاق ہے کہ مغرب میں آفتابِ علم مفتی محمد شفیع صاحب رح کی شکل میں غروب ہوا تو اُسی رات پاکستان کا وہ مرحوم حصہ جو کبھی مشرقی کہلاتا تھا، اپنے ہاں کے ایک آفتابِ رشد و ہدایت مولانا اطہر علیخان[1] جامعہ امدادیہ کشور گنج کے اجالوں سے محروم ہو گیا اور انہی ایام کے لگ بھگ بنگلہ دیش کے کئی ایک اور اکابر علم و فضل حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب اور چاٹگام کے مولانا مفتی فیض اللہ صاحب وغیرہ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ایسے تیزی سے علم و فضل کے قافلوں کا دُنیائے فانی سے کُوچ کر جانا دُنیا کے حق میں اچھی علامت نہیں۔ قبضِ علماء کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اشراطِ ساعت میں سے قرار دیا ہے۔ چلنے والوں کی مسندیں خالی ہوتی جا رہی ہیں اور اُمت کی اکثریت "محوِ نالۂ جرس کارواں"[2] ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری حالت پر رحم فرمائے اور ملتِ مرحومہ کو مرحومین کی برکتوں سے مالا مال رکھے۔

الحق

اکتوبر ۱۹۷۶ء

◎

---

[1] مولانا اطہر علیخان رح ۱۳۰۹ھ میں سلہٹ میں پیدا ہوئے، ۱۳۳۸ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت پائی۔ ۹ شوال ۱۳۹۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ (مرتب)

[2] یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا ∴ ہم محوِ نالۂ جرس کارواں رہے
(مرتب)

مولانا شریف الحسنؒ

دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث کی مسند برصغیر کے علم وفضل کی بلند ترین مسند ہے۔ اس پر ہر دور میں اللہ تعالیٰ نے علمی، دینی اور روحانی ہر لحاظ سے جامع شخصیتیں فائز فرمائیں حضرت اقدس مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کے بعد حضرت علامہ مولانا فخر الدین مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ بخاری شریف پڑھاتے رہے، ان کے وصال کے بعد یہ سعادت حضرت مولانا شریف الحسن[1] صاحب مرحوم کے ذمہ آئی انہوں نے اپنے دیگر اہم علمی مشاغل چھوڑ کر دارالعلوم دیوبند کی دعوت پر لبیک کہا اور آخر وقت تک درس بخاری کی عظیم روایات کو برقرار رکھا گذشتہ ۵ جون کو یکایک حرکت قلب بند ہونے سے ان کا وصال ہو گیا اور دارالعلوم دیوبند کی یہ مقدس مسند علم وفضل ایک بار پھر خالی ہو گئی، مگر جس ذات نے غیبی طور پر "رجال غیب" اس منصب جلیلہ کے لئے پیدا فرمائے اس سے قوی امید ہے کہ دارالعلوم کا یہ اہم ترین تدریسی منصب اب بھی خلاء سے محفوظ رکھے گا، حق تعالیٰ مولانا مرحوم کو درجات عالیہ پسماندگان کو صبر اور دارالعلوم کو ان کا نعم البدل عطا فرمادے۔ آمین۔

(الحق) جولائی ۱۹۷۷ء

---

[1] آپ ۹ اگست ۱۹۲۰ء کو دیوبند میں پیدا ہوئے۔ یہیں حافظ عبدالغنی مرحوم سے حفظ قرآن مکمل کیا۔ ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۵۸ھ میں دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے فراغت کے بعد مختلف مدارس میں اعلیٰ کتب کی تدریس کے بعد ۱۳۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند بلائے گئے۔ ۱۴، ۱۵ جمادی الثانی ۱۳۹۷ھ کی درمیانی شب تقریباً ۵۹ سال کی عمر میں آپ واصل بحق ہوئے۔ "تاریخ دارالعلوم دیوبند"۔ (مرتب)

مولانا عبدالرازق شاہ منصوریؒ

۴ شعبان ۱۳۹۷ھ جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب کو صوبہ سرحد کے ایک گمنام مگر جیّد عالم اور صاحبِ دل بزرگ حضرت مولانا عبدالرازق[1] صاحب مجدّدی نقشبندی عرف شاہ منصور لالہ کا تقریباً ۸۵ برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ نمازِ جمعہ کے بعد تدفین ان کے آبائی گاؤں شاہ منصور تحصیل صوابی میں ہوئی، علماء و صلحاء نے دور دراز سے جنازہ میں شرکت کی۔ آپ معقولات اور منقولات کے جامع علماء میں سے تھے۔ تعلیم سرحد کے مختلف مقامات پر حاصل کی اور پھر دہلی، ملکھڈ، مردان، اکوڑہ خٹک کے مدارس میں عمر بھر اعلیٰ کتب کی تدریس ان کا مشغلہ رہا، علوم ریاضی منطق معانی اور تفسیر میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ ان کے تلامذہ میں حضرت حاجی محمد امین صاحب ترنگ زئیؒ، حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب میانیؒ کے علاوہ حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ اور مولانا محمد فرید صاحب مفتی دارالعلوم حقانیہ جیسے اکابر علم و فضل شامل ہیں۔ علوم ظاہریہ کے ساتھ علوم باطنیہ اور سلوک و ارشاد سے بھی تعلق رہا۔ حضرت مولانا عبدالمالک صدیقی خانیوالؒ کے اوّلین خلفاء میں سے اور سلاسل سبعہ میں مجاز تھے۔ صاحبِ جذب بزرگ، کم گو، ہمہ وقت ذاکر، زہد و قناعت اور سادگی میں بزرگوں کا نمونہ تھے، ان کے پسماندگان میں مولانا ضیاالحق، مولانا سعیدالحق، مولانا رفیع الحق وغیرہ ہیں اور ثانی الذکر دونوں دارالعلوم حقانیہ کے فاضل ہیں۔

(الحق) جولائی ۱۹۷۷ء

---

[1] مولانا موصوف ۱۸۸۴ء کو مولوی محمد دوفی بن مولوی عبدالقادر کے گھر موضع شاہ منصور میں پیدا ہوئے۔ مختلف اساتذہ سے علوم فنون کی تکمیل کے بعد موضع متھرا (پشاور) کے مولانا فضل ربانی سے دورۂ حدیث پڑھنے کے بعد دوبارہ شیخ الحدیث مولانا غور غشتویؒ سے سند حدیث حاصل کی (مرتب)

یوسفِ دوراں

مولانا محمد یوسف بنوریؒ

آہ کہ ۳ر ذی قعدہ ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۷ر اکتوبر ۱۹۷۷ء صبح ۵ بجے جبکہ سپیدۂ سحر آفتاب عالمتاب کے طلوع کا مژدہ سنانے لگا تھا، دنیائے علم و ادب کا آفتاب و ماہتاب پون صدی کی تابناکی اور درخشانی کے بعد یکایک غروب ہوگیا اور علم و دین کے ایوانوں میں اندھیرا چھا گیا۔ یعنی حامل علومِ نبوت ماحی الحاد و بدعت یادگارِ سلف محدّث جلیل، محقق یگانہ، ادیبِ اریب، فاضلِ بے بدل، جانشین امام انور شاہ کشمیریؒ علامہ مولانا سید محمد یوسف جان البنوری البشاوری قدس سرہٗ واصل بحق ہوگئے البقاء للّٰہ وحدہٗ۔ انّا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ فالرزیۃ کلّ الرزیۃ۔ وہ شمع جو عمر بھر دین کیلئے اور ملّتِ اسلامیہ کیلئے جل رہی تھی اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ اس کی لَو میں اس کے سوز و تڑپ اور اسکی روشنی میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا تھا اچانک بجھ گئی۔

ع اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

اور اب علم و تحقیق کا عالم اجڑا اجڑا سا ہے۔ دعوتِ حق اور دفاعِ دین کی رزم گاہوں میں سکوتِ مرگ سا طاری ہوگیا ہے ؎

ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں
بڑے چراغ جلاؤ گے روشنی کے لئے

جمعہ کی شام کو قائدِ ملّت مولانا مفتی محمود صاحب، مجمع البحوث الاسلامیہ قاہرہ کے اجلاس میں شرکت کرنے مصر جا رہے تھے، ادھر مولانا بنوری مرحوم اور مولانا محمد تقی عثمانی صاحب وغیرہ اسلامی مشاورتی کونسل کے اجلاس میں شرکت کرنے اسلام آباد تشریف

لائے تھے ، مفتی صاحب کو راولپنڈی ائر پورٹ پر الوداع کہنے کے بعد احقر اسلام آباد گیا ، مولانا بنوری گورنمنٹ ہاسٹل کمرہ ۳ میں مقیم تھے اور دیگر حضرات و احباب دیگر کمروں میں ۔ رات مولانا کونسل کی میٹنگ سے ساڑھے نو بجے پہنچے ، رات میں مولانا تقی صاحب کے ساتھ رہا ، ہفتہ صبح ۸ بجے ہم دونوں مولانا کے کمرے میں گئے تو معلوم ہوا کہ انہیں غسل خانہ میں اچانک دھچکا سا لگا ہے ، گلا کھچ سا گیا ہے اور اب معائنہ کے لئے پولی کلینک اسلام آباد تشریف لے گئے ہیں ۔ گیارہ بجے آپ واپس تشریف لائے ۔ میں اور تقی صاحب نے گاڑی سے سہارا دیا ۔ مولانا کے صاحبزادے محمد بنوری سلمۂ اللہ بھی ساتھ تھے ، ہم تینوں انہیں کمرے میں لے گئے ، خوب بات چیت فرماتے رہے ۔ ہم سب نے اصرار کیا کہ اب مکمل آرام فرمائیں اور بستر پر دراز ہو جائیں ، فرمایا نہیں کوئی خاص بات نہیں ۔ ہنسی خوشی ہم کمرہ سے نکل آئے ، ساڑھے بارہ بجے یکایک مولانا پر دوبارہ اٹیک ہوا ، جسم مبارک پسینہ سے شرابور ، رنگ بالکل پیلا پڑ گیا ، استغفر اللہ استغفر اللہ کا ورد فرماتے رہے ، اور فرمایا کہ اس دفعہ بالکل نئی کیفیت محسوس ہو رہی ہے ، جسٹس محمد افضل چیمہ صاحب چیئرمین مشاورتی کونسل بھی موجود تھے ، سی ۔ ایم ۔ ایچ پہنچانے کا پروگرام بنا ، ایمبولینس آنے میں کافی دیر لگی اور چار بجکر بیس منٹ پر آپ سی ۔ ایم ۔ ایچ کے آفیسرز وارڈ کے ایمرجنسی روم میں داخل کئے گئے ، وہاں پہنچ کر طبیعت کافی بحال ہو گئی اور سب لوگوں نے اللہ کا شکر ادا کیا ۔

دوسرے دن اور پیر کی شب کو آپ یہیں زیر علاج رہے ، وفات کی شب رات نو بجے ان کے صاحبزادے برادرم محمد بنوری ملنے گئے تو کسی ڈاکٹر نے مولانا کو اٹھنے بیٹھنے کے بارہ میں احتیاط کی تلقین کی تو محمد صاحب کی روایت ہے کہ مولانا مرحوم نے انہیں کہا کہ — "اب کبھی نہیں اٹھوں گا ۔" — پیر کی صبح ۵ بجے کے لگ بھگ واصل بحق ہوئے ۔ وفات اپنے اندر شانِ ابوذریؓ لئے ہوئے تھی ، ایسی حالت میں کہ ملت کا یہ غمگسار ملت کے درد و غم کے سلسلہ میں حالت سفر میں تھے ۔ اور وفات کے وقت بستر کے قریب کوئی عزیز بھی نہیں تھا ۔ اس لئے کہ ہسپتال کی طرف سے کسی کو ساتھ رہنے کی اجازت نہیں تھی ، آخری لمحات کیسے گذرے ؟ کیا کیا کیفیات اور تاثرات رہے ۔ ؟ اس کا مشاہدہ کرنے

والا کوئی نہ تھا اور پھر یہ امر بے حد افسوس اور حیرت کا باعث ہے کہ ہسپتال کیطرف سے کسی عزیز کو اطلاع نہیں دی گئی پہلی اطلاع کئی گھنٹے بعد جنرل ضیا الحق صاحب صدر پاکستان و چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو دی گئی۔ ان کے توسط سے چیئرمین اسلامی کونسل کو اور اس کے بعد عزیز و اقارب کو۔

ہم لوگ اکوڑہ خٹک آگئے تھے، گیارہ بجے اطلاع آئی تو حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہٗ، دارالعلوم کے اساتذہ اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد راولپنڈی روانہ ہو گئی۔ ۲ بجے ہم سب راولپنڈی پہنچے۔ برادر عزیز قاری سعید الرحمٰن صاحب کی میں ان کی اقامت گاہ جامعہ اسلامیہ کشمیر روڈ میں مولانا کی تجہیز و تکفین ہو چکی۔ مولانا کا جسد اطہر مسجد کے ایک کمرے میں برف کی سلوں کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ جو مریض و نحیف ہونے کے ساتھ اس صدمہ سے مزید نڈھال تھے سیدھے مولانا کے پاس پہنچے، پیشانی مبارک کو چوما دیر تک کھڑے رہے اور مولانا سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ :

"اے دین کے خادم اور ملت کے غمگسار تجھ پر خدا کی کروڑوں رحمتیں ہوں۔ اے اللہ اس ذات کو جو قرآن و سنت کا حامل اور خادم رہا اپنی قرب و رضا سے مالا مال فرما۔"

مولانا مرحوم کا چہرہ عجیب پرسکون تھا جیسے آسودۂ خواب ہوں۔ چہرۂ انور کا حسن سفید کفن میں اور بھی نکھر گیا تھا۔ ۳ بجے ظہر اس مسجد کے صحن میں نماز جنازہ حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہٗ نے پڑھائی علماء و مشائخ، زعماء و مشاہیر اور عامۃ المسلمین کی ایک بہت بڑی تعداد نے شمولیت کی اس سے قبل حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ نے ۱۵ منٹ تک حضرت مولانا مرحوم کے کمالات علمی اور خدمات دینی پر تقریر فرمائی، نماز جنازہ کے بعد آپ کا تابوت ائرپورٹ لے جایا گیا اور ٹھیک ۵ بجے جہاز علم و معرفت کے اس گنج گرانمایہ کو لیکر کراچی روانہ ہوا اور کراچی میں رات نو بجے آپ کو اپنے قائم کردہ مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن میں سپرد خاک کیا گیا، یہاں دوبارہ نماز جنازہ پڑھائی گئی جس میں مولانا کے عشاق اور عقیدتمندوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

حضرت مولانا بنوریؒ کے وصال سے علم وفضل کی دنیا میں کتنی خلاء پیدا ہوگئی ہے ؟ اس کی وسعت اور گہرائیوں کا صحیح اندازہ ہم جیسے بے مایۂ علم وفہم کر ہی نہیں سکتے ۔مگر مولانا کے طویل وعریض کمالات علمی اور خدمات دینی پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے والا بھی اس حادثہ کی وجہ سے غم واندوہ کی گہرائیوں میں ڈوبے بغیر نہیں رہ سکتا ، مولانا کی ذات جامع صفات تھی اس ہمہ گیر شخصیّت میں امام کشمیریؒ کے کئی مزایا اور صفات کی جھلک نمایاں تھی ، اپنے استاد کا رنگ لئے ہوئے تھے ، علمی تبحّر ، وسعت معلومات ، غضب کا حافظہ ، ادب عربی ، اور علوم ادبیہ میں مکمل دسترس اور اعلیٰ ذوق ، عربی کے ایسے ادیب اور مصنّف کہ گنے چنے افراد میں شمار ہوتے تھے ۔ عربی نثر نگاری میں قدیم اور جدید دونوں اسلوبوں پر گرفت تھی ، عربی شعروشاعری کا ایسا ملکہ کہ قریبی احباب سے ذاتی خط وکتابت بھی عربی نظم میں فرماتے ، کتابوں کا ایسا عمدہ ذوق اور ایسی تشنگی کہ آخر وقت تک دنیا کے کتب خانوں سے چن چن کر کتابیں جمع فرماتے رہے اور ایک نہایت عمدہ لائبریری بھی اپنے آثار میں چھوڑ گئے ۔ عربی ادب اور علوم عربیہ کی نایاب اور قدیم کتابوں کے نام بچپن میں میں نے مولانا ہی سے سنے ، طبیعت میں روانی آجاتی تو صدہا عربی فارسی قصائد واشعار سنانے لگ جاتے ۔ اپنے شیخ اور استاذ علامہ کشمیری کے ذکر سے تو وجد کی کیفیت ان پرطاری ہوجاتی اور آبدیدہ ہوجاتے ، ویسے بھی طبیعت میں سوز وگداز غضب کا تھا ۔ دین کے اضمحلال اور زوال پر آنسو کی جھڑی لگ جاتی ۔

مولانا کو اللہ نے باطنی صفائی کے ساتھ ظاہری نفاست سے بھی بدرجۂ اتم نوازا تھا ہر کام میں نہایت خوش ذوق ، رہن سہن خوراک وپوشاک نشست وبرخاست میں خوش سلیقہ دسترخوان ہو یا میز سرجگہ ہر چیز کو ترتیب سے دیکھنا چاہتے تھے ۔ ہمارے بعض احباب اس معاملہ میں مولانا کو ماہر جمالیات کہتے تھے ، صاف دل اور صاف گو تھے ، کسی کو پسند فرمانے لگتے تو اسکی تعریف وتحسین میں اتنے فیّاض کہ ناواقف حال حضرات کو غلو اور مبالغہ کا گمان ہونے لگتا اور اگر دین اور علم کے معاملہ میں کسی سے اختلاف ہوجاتا تو اپنی صوابدید کی بنا پر بے دریغ اور بلاخوف لومۃ لائم میدان میں آجاتے ۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور اس دور کے

لے

فتنۂ تجدد پر آپ نے بے تحاشا حملے کئے اور اپنا پرچہ بینات اس کے لئے مخصوص فرمایا ، فتنۂ انکارِ حدیث اور اس کے داعی پرویز کی تکفیر کا اجماعی فتویٰ آپ کا کارنامہ ہے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے فتنۂ قادیانیت کا استیصال جس تحریک سے کرایا اس کی سرخیلی کا خلعت فاخرہ بھی آپ کو نصیب ہوا۔

تحریکِ ختمِ نبوت چلی ، لاہور کے مدرسہ شیرانوالہ گیٹ میں ہر مکتب فکر کے علماء اور زعماء مجلسِ عمل کی تشکیل کے لئے جمع تھے ، ایسے متضاد اور مختلف الخیال مکاتب اور عناصر کی قیادت کا مسئلہ بڑی الجھن کا باعث بن سکتا تھا مگر اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا ، حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ یکایک مجلس میں اٹھے اور تمہید کے بعد مجلسِ عمل کی صدارت کے لئے مولانا قدس سرہٗ کا نام تجویز فرمایا۔ اللہ کا کرم تھا اور مجوِّز اور مجوَّز دونوں کی عظمت اور احترام کا تقاضا کہ سب لوگوں نے اس تجویز پر صاد کیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے مشن کو ان کے چہیتے خادم اور شاگرد ہی کے ذریعہ تکمیل تک پہنچایا ذبّ عن الاسلام اور حمیّتِ حق کے ان عظیم معرکوں کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اس عاشقِ رسول سے علمِ حدیث کی خاص طور سے خدمت لی۔ ترمذی شریف کی شرح معارف السنن کی صرف چھ جلدیں چھپ سکیں جو ۲۹۳۳ صفحات پر مشتمل ہیں۔ ابھی اتنا کام اور ہونا تھا اور معارف کا مقدمہ اس پر مستزاد۔

جوانی کے آغاز میں کئی ایک معرکے کی کتابیں لکھیں ۱۳۵۶ھ میں مجلس علمی ڈابھیل کی طرف سے فیض الباری شرح صحیح البخاری کی طباعت کے سلسلہ میں مصر ترکی یونان اور حجاز کے سفر پر گئے تو پایہ کے علماءِ عرب پر اپنا سکہ جمایا اور اظہارِ حق میں عالمِ عرب کے ممتاز مصنّف علامہ طنطاوی صاحب جواہر القرآن سے بھی الجھنے میں جھجک محسوس نہیں کی۔ اس وقت کے امام جلیل علامہ محمد زاہد بن الحسن الکوثریؒ کے منظورِ نظر بن گئے ، اپنے شیخ اور مرشد علّامہ کشمیریؒ کے بعد آپ علّامہ کوثریؒ کے علم و فضل کے مدّاح تھے۔ اس سفر سے ہی عرب کی علمی دنیا میں متعارف ہو گئے۔ کئی ایک مقالات اور قصائد عربی پریس میں شائع ہوئے۔ دمشق کی مجلسِ علمی اور بعد میں قاہرہ کے مجمع البحوث الاسلامیہ اور مکہ معظمہ کے رابطۂ عالم

اسلامی کی کئی مجالس کے ممبر منتخب ہوئے[1]

الحق

ذی قعدہ ۱۳۹۷ھ

اکتوبر ۱۹۷۷ء

---

[1] بروز جمعرات ۶ ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ کو مردان کے قریب مہابت آباد نامی بستی میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب نویں پشت میں جدِ امجد عارف محقق سید آدم بنوریؒ کی وساطت سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ سید آدم بنوریؒ تک سلسلۂ نسب یوں ہے :- سید محمد یوسف بن سید محمد زکریا بن میر مزمل شاہ بن میر احمد شاہ بن میر موسیٰ بن غلام حبیب بن رحمت اللہ شاہ بن عبدالاحد بن حضرت محمد اولیاء بن سید السادات قطب الاقطاب مخزنِ اسرارِ الٰہی السید آدم بنوری بن اسمٰعیلؒ ...... الخ

لطیفہ :- ایک دفعہ آپ دارالعلوم حقانیہ تشریف لائے، میرے والدِ محترم مولانا عبدالحلیم صاحب صدر المدرسین دارالعلوم حقانیہ قدس سرہٗ ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ والد صاحب نے فرمایا کہ کسی طالبعلم سے معلوم ہوا کہ مولانا بنوری تشریف لائے ہیں۔ مولانا نے فوراً کہا: "بنوری نہیں ہے نوری"۔ والد صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ یہ بنوری تو بےنظر بنوری کے قبیلہ سے ہے۔ (مرتب)

تفصیلی حالات کے لیے بینات علامہ بنوری نمبر ملاحظہ ہو۔

مولانا بنوریؒ

کے ساتھ سفر حج کی چند یادیں

حضرت مولانا مرحوم کی زیارت اور سفر و حضر میں رفاقت کے تو اللہ تعالےٰ نے کئی مواقع عطا فرمائے مگر اس فرصت میں اپنے دونوں اسفار حج کے دوران مولانا مرحوم سے وابستہ کچھ یادیں بغیر کسی خاص ربط و ترتیب کے سپردِ قلم کرتا ہوں۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ عالم عرب کے اعیان علم و فضل میں آپ کا شہرہ بڑھتا ہی گیا اور آپ بحیثیت ایک عظیم محدث اور نقاد محقق کے تسلیم کئے جانے لگے، اس کا کچھ مظاہرہ میرے سامنے اس وقت ہوا جب ۱۹۶۴ء میں اپنے سفر حج کے دوران بعض اجلۂ علم و فضل سے میری ملاقات ہوئی، عالم عرب کے ایک عظیم داعی اور محقق عالم علامہ شیخ مصطفیٰ السباعی مرحوم بھی اس سال حرمین الشریفین تشریف لائے تھے۔ شیخ مصطفیٰ السباعی شام کے باشندہ تھے۔ ان کا وقیع علمی مجلہ "حضارۃ الاسلام" دنیائے اسلام میں معروف ہے۔

کئی جلیل القدر کتابوں کے مصنّف ہیں، منکرین حدیث اور بعض متجددین نے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حجیت کے خلاف جو ہنگامہ کھڑا کیا۔ اس کے اصل محرک یورپ کے بعض یہودی مستشرقین تھے۔ ہمارے ہاں بھی غلام احمد پرویز، ڈاکٹر فضل الرحمٰن جیسے لوگ ان معاندین اسلام پروفیسروں اور اسکالروں کا حق تلمذ ادا کرنے میں پیش پیش رہے۔ ادھر عالم عرب میں بھی مصر اور بیروت جیسے خطوں میں انہیں "وفا شعار" مستغربین ملے، ایسے ہی کچھ لوگوں نے حجیت و تدوین حدیث اور حدیث کے بعض

اولین رواۃ اور مدونین کو نشانۂ تحقیق بنایا تو شیخ مصطفیٰ السباعی نے ان لوگوں کی رد میں قلم اٹھایا۔ اور "السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی" جیسی جامع اور محققانہ کتاب لکھی، یہ کتاب جامعیت، سلاست بیان اور منکرین حدیث کا تعاقب اور پوسٹ مارٹم کرنے میں ایک مثالی کتاب ہے، اور ہمارے ہاں کے اہل علم کے لئے مطالعہ کی چیز ہے ہمارے شیخ بنوریؒ بھی جب پاکستان میں اس فتنہ کی ہلاکت آفرینیوں سے بے چین ہو گئے تو انہوں نے ایک وقت پورے شد و مد سے منکرین حدیث اور متجددین کے خلاف علم جہاد بلند کئے رکھا۔ اس ضمن میں آپ کی نظر رسا شیخ مصطفیٰ السباعی کی مذکورہ کتاب پر پڑی اور مولانا محمد ادریس میرٹھی کے اردو ترجمہ و تشریح کے ساتھ اس کتاب کو اپنے ادارہ سے "سنت کا تشریعی مقام" کے نام سے شائع کیا، خیر یہ تو اس ملاقات کے بعد کی بات ہے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔

شیخ مصطفیٰ السباعی مرحوم پر آخری سالوں میں فالج کا حملہ ہوا اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے۔ اسی دوران وہ حرمین الشریفین تشریف لائے۔

ایام حج سے قبل وہ مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے قریب ایک بوسیدہ اور خستہ سے مکان میں صاحب فراش تھے، میں تلاش کرتے پہنچا، بستر علالت پر دراز، چہرہ بالکل زرد، ضعیف و ناتواں، مگر صبر و شکر کا عجیب حال ہے۔ فرمایا کہ میں اس طویل بیماری کو اللہ تعالیٰ کی نعمت اس لئے بھی سمجھ رہا ہوں کہ صحت کی حالت میں ادھر ادھر کے مشاغل میں وقت ضائع ہوتا ہے، جب مجھے تبدیلئ آب و ہوا اور سیر و سیاحت کے لئے کہا گیا اور کچھ وقت ملا تو میں نے اسے جوار رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں گزارنے کو پسند کیا۔

وہ مسجد نبوی میں حاضری سے بھی معذور تھے، مگر قرب حبیب بھی ان کے لئے عجیب تسکین و سرور کا باعث تھا کہ اپنی صحت میں تیزی سے تبدیلی محسوس کرنے لگے تھے۔ گوناگوں آلام و اسقام نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ مگر عشق رسولؐ، قرب رسولؐ اور جذبات جہاد و دفاع حق نے آلام و اسقام کو نعمتوں سے بدل دیا تھا۔ قیام مدینہ کے دوران انہوں نے ایک دن روضۃ من ریاض الجنۃ۔ میں منبر رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس

ایک طویل قصیدہ "مناجاة بين يدى الحبيب الاعظم" کے عنوان سے قلم بند کیا، اور خود اسے مواجہۂ رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش فرمایا جن میں مذکورہ کیفیات کا اظہار موجود ہے۔ اس قصیدہ کے چند اشعار یہ ہیں:

یا سیدی یا حبیب اللہ جئت الی — اعتاب بابك اشكو البرح من سقمی

یا سیدی قد تمادی السقم فی جسدی — من شدة السقم لم اغفل ولم انم

الاهل حولی غرقی رقادهم — انا الوحید جفا النوم من الم

قد عشت دهراً مديداً كلله عمل — واليوم لاشيئ غير القول والقلم

یا سیدی طال شوقی الجهاد فهل — تدعوا الی اللہ عوداً عالی العلم

تاللہ مالهفتی البرء عن رغب — فی ذی الحياة ولاجاه ولا نعم

وانما طمع فی ان تقول غداً — لقد هديتم الی الاسلام كل عمی

هيهات ان تنطوی للدين رايته — او يهزم الكفر دينا غير منهزم

فاكرم الناس من كانت منيته — فی حومة الحق جلداً غير منهزم

واهون الناس من جاءت منيته — خلواً من الهم او خلوا من الهمم

اشكوا الی اللہ شكوی غير ذی جزع — فی شدة الضر وجهی وجه مبتسم

مافی قضائك ظلم العباد ولا — فيه الاساءة بل محض من الحكم

اس قصیدہ کے بارے میں خود شیخ مصطفی السباعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وهی قصيدة طويلة اتجهت فيها بالدعاء الی اللہ والتجأت الی حرم رحمته الواسعة وذكرت فيها رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومعجزاته فی شفاء المرضیٰ فی حياته عليه السلام..... وكنت فی كل ليلة يؤرقنی فيها شدة الالم ازيد فی تلك القصيدة حتى تم منها حينئذ ما يقرب من مائة بيت۔ (حضارة الاسلام جلد ۵ ص ۲۷۳)

مدینہ منورہ میں شیخ سباعیؒ کے ساتھ یہ میری مختصر ملاقات تھی۔ یہ ۲۹ ذی قعدہ ۱۳۸۳ھ جمعۃ المبارک کی شام کا واقعہ ہے حضرت شیخ سباعی صاحبؒ نے مجھے ایک طالب علم

سمجھ کر اپنی عالمانہ شفقت و محبت سے نوازا ، وہ خود بستر سے جو زمین پر بچھا ہُوا تھا اٹھ نہیں سکتے تھے مگر مجھے حکماً کہا کہ سامنے الماری سے شامی حلاوۃ کا ڈبہ اٹھا کر لاؤں ، اور ان کے سامنے اس میں سے کچھ کھاؤں ۔ تاکہ کچھ تو ضیافت ہو جائے ، اس کے بعد ان کی ضیافت و شفقت ان کے نہایت وقیع مجلّہ "حضارۃ الاسلام" کی شکل میں جاری رہی جو ابھی کچھ عرصہ قبل تک ہر ماہ میرے لئے حلاوۃ معنوی و فکری کا موجب بنتی رہی ۔

ایامِ حج قریب ہوتے تو شیخ سباعیؒ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے ، مناسکِ حج سے فراغت کے بعد طالب علمانہ تشنگی کی بنا پر پھر مجھے عالمِ عرب سے آئے ہوئے اعیانِ علم و فضل کی زیارت کی خواہش ہوئی ۔ شیخ مصطفیٰ السباعیؒ اس وقت حرم مکہ کے قریب " فندقِ شبرا " میں مقیم تھے اور یہ ہوٹل عرب علماء اور شیوخ کی آرام گاہ بنا ہُوا تھا ۔ ۲۲ اپریل ۱۹۶۴ء بمطابق ۱۰ ذی الحجہ میں فندق شبرا گیا یہاں شیخ کے علاوہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ ، استاذ سعید رمضان ، السید محمد اعلیٰ الکتانی ، احساء کے قاضی القضاۃ قاضی منصور وغیرہ سے بھی ملاقاتیں ہوئیں ۔

جناب مصطفیٰ السباعیؒ کے ساتھ بات چیت میں مودودی صاحب کا ذکر آیا اور ہندوستان کے مولانا ابوالحسن علی ندوی کا بھی ۔ ان کو میری بعض باتوں سے اتفاق تھا ۔ اور فرمایا کہ اول الذکر پر عقلیت کا غلبہ ہے جب کہ ثانی الذکر پر روحانیت کا ۔ فرمایا ، المودودی رجل عقلی و الشیخ الندوی رجل روحانی ۔ پھر پاکستان سے آئے ہوئے علمائے کرام کا بھی ذکر ہوتا رہا ۔

جناب سباعیؒ نے فرمایا مجھے مولانا محمد یوسف صاحب سے ملنے کا اشتیاق ہے اس سال چونکہ اس نام کے بعض اور اکابر بھی واردِ حرمین ہوئے تھے ، ایک مولانا محمد یوسف شاہ میر واعظ کشمیر ، دوسرے جماعت تبلیغی کے شیخ التبلیغ مولانا محمد یوسف دہلوی ، تیسرے حضرت علامہ محمد یوسف بنوری نور اللہ تعالیٰ مرقدہٗ ۔ اس لئے جناب شیخ سباعی مرحوم و مغفور نے ایک ایک کا نام گنوایا اور تجزیہ کرتے ہوئے الگ الگ ایک ایک کا تعارف سنا اور فرمایا کہ مجھے شیخ محمد یوسف بنوریؒ سے ملنے کی آرزو ہے ۔ اور میں مرنے سے قبل ان

سے حدیث کی اجازت لینا چاہتا ہوں، کاش کوئی صورت اس کی بن سکے۔

میں نے جناب سباعیؒ سے کہا کہ یہ میری ذمہ داری ہے، میں حضرت بنوریؒ کو یہاں لے آؤں گا۔ فرمایا ہرگز نہیں، یہ تو بے ادبی ہے اور شانِ طالب علمی کے خلاف ہے کسی طرح مکان اور وقت کا تعین ہو جائے تو مجھے خود ان کے پاس لے چلیں۔ میں نے کہا لیس علی المریض حرج۔ اس کے بعد میں نے ایک دن حضرت بنوری نور اللہ تعالیٰ مرقدہٗ سے سباعی صاحبؒ کی ملاقات، اور ان کے اس اشتیاق کا ذکر کیا۔ حضرت بنوریؒ نے فرمایا وہ ایک جلیل القدر عالم اور اسلام کے خادم ہیں، میں انہیں کیا اجازتِ حدیث دوں گا البتہ ملاقات اور زیارت کے لئے ضرور چلیں گے، اس کے بعد ایک دن حضرت بنوریؒ میرے ساتھ فندق شبرا تشریف لے گئے۔ شیخ سباعیؒ کو معلوم ہوا تو عجیب کیفیت ان پر طاری ہوئی، دیر تک محفل رہی دونوں اپنی جگہ تواضع اور مسکنت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس مجلس میں جناب سباعیؒ کی دیرینہ مراد بر آئی اور انہوں نے باصرار حضرت بنوریؒ سے صحاح ستہ اور احادیث کی دیگر کتابوں میں سند حاصل کی۔

اس سفرِ حج میں ابتدا سے آخر تک اللہ تعالیٰ نے مجھے حضرت بنوری نور اللہ تعالیٰ مرقدہٗ کی شفقتوں اور عنایتوں سے نوازا، کراچی میں ویزا کرنسی وغیرہ تمام مسائل میں حضرت نے وہ وہ توجہات فرمائیں، اب سوچتا ہوں کہ اگر حضرت کی عنائتیں نہ ہوتیں تو شاید ہم اس سعادت سے بہرہ ور نہ ہوتے۔ ہم لوگ رمضان میں براستہ الخبر اور الریاض مدینہ منورہ پہنچے، حضرت بنوریؒ قاہرہ کے مجمع البحوث الاسلامیہ کی پہلی دعوت پر مصر تشریف لے گئے، اور یکم اپریل ۱۹۶۴ء کو واپسی میں مدینہ طیبہ تشریف لائے، حضرت مولانا مفتی محمود صاحب، حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی، اور حضرت مولانا تاج الاسلام (مشرقی پاکستان) ان کے ہمراہ تھے یہ وفد مسجد نبوی کے قریب پاکستان ہاؤس میں مقیم ہوا، جو اس وقت غلام محمد ہاؤس کہلاتا تھا، ہم لوگ خدمت میں حاضر ہوئے تو مولانا بنوریؒ اور حضرت مفتی صاحب نے سفر قاہرہ کے حالات سنائے۔ "معارف السنن" کی جلد اوّل کا نسخہ ہماری روانگی کے بعد چھپ گیا تھا اور پہلی بار یہاں مولانا بنوریؒ کے ہاں

دیکھا۔

حضرت بنوری نور اللہ تعالیٰ مرقدہٗ نے مدینہ منورہ میں اپنی پہلی حاضری اور بے سرو سامانی کے باوجود وہاں کے شیخ حمیدی سے ملاقات اور ان کے الطاف و عنایات کا ذکر فرمایا کہ حق تعالیٰ نے غیب سے کس کس طرح مدد فرمائی۔ فرمایا کہ شیخ حمیدی کے ساتھ نہایت آرام و راحت اور آراستہ و پیراستہ سواری میں بیٹھ کر پہلی حاضری مدینہ طیبہؐ کے دوران تیرہ، چودہ دن تک میں نے مدینہ طیبہ کے آثار مبارکہ کی تفصیلی سیاحت کی، اپنے طویل اسفار کے دوران قدرت کے ایسے ہی غیبی دستگیریوں کو بیان کر کے حضرت بنوریؒ فرمایا کرتے تھے وکذلک مکنّا لیوسف فی الارض۔ اس سفر میں حضرتؒ کی معیت آخر تک نصیب رہی، یہاں تک کہ میدان عرفات میں وقوف کی سعادت ان کے ساتھ نصیب ہوئی، ان سب حضرات کے معلم سید مکی مرزوقی تھے جو ہمارے بھی معلم تھے۔ میدان عرفات میں ان حضرات اکابر کے علاوہ امیر التبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی بھی اسی معلم کے خیموں میں فروکش تھے اور میدان سعادت میں ایسا قران السعداء سونے پر سہاگہ کا کام دے رہا ہے۔ اب وہ دن اور وہ منظر خواب سا لگتا ہے ؎

خزاں رسید و گلستاں بآں جمال نماند — سماع بلبل شوریدہ رفت و حال نماند
نشانۂ لالہ ایں باغ از کہ مے پرسی — ہر و کہ آنچہ تو دیدی بجز خیال نماند

اپنی حرماں نصیبی اور تہی دستی جتنی زیادہ تھی اتنا ہی قدرت نے فیاضی کے ساتھ ایسے مواقع غنیمت سے نوازا، اپنے دوسرے سفر حج کے دوران تو حضرت بنوریؒ کی رفاقت ابتدا ہی سے نصیب ہوگئی۔ غالباً ۲۹ مارچ ۱۹۶۹ء کو ہم نے حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ان کی قیام گاہ کراچی سے احرام باندھا، تلبیہ احرام اور دعاؤں میں شریک ہوئے دس گیارہ بجے دن کو جہاز نے کراچی سے پرواز کی، ابھی جہاز کراچی شہر پر چکر لگا رہا تھا کہ اناؤنسر نے محتاط رہنے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ چند منٹ میں فنی خرابی کی وجہ سے دوبارہ کراچی ائیرپورٹ پر اتریں گے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے اس لئے تمام عازمین حج میں

جو سب احرام میں تھے نہایت پریشانی اور سراسیمگی دوڑ گئی، یہ پریشانی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی کہ جہاز کراچی کے سمندر پر چکر کاٹتا رہا، چند منٹ تقریباً آدھ گھنٹہ میں بدل گئے، بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اتنے بھاری جہاز میں جدّہ تک چلنے کے لئے جتنا ایندھن ڈالا گیا ہے اتنے وزن کے ساتھ جہاز کا اترنا مشکل ہے اور اب جہاز اپنا وزن کم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بہرحال حضرت بنوریؒ پر مکمل اطمینان اور سکون چھایا ہوا تھا۔ مجھے بھی تسلّی دیتے رہے اور کہا کہ گھبرائیں نہیں سورۃ قریش کا ورد کرتے رہیں سکون خاطر ہوگا۔

بہرحال جہاز اللہ کے فضل سے بخیریت واپس اتر گیا۔ ہم لوگ اب پی۔ آئی۔ اے کے مہمان تھے، جس کی انتظامیہ حضرت بنوریؒ سمیت ہم تمام حجاج کو جو کہ ایک سو بہتر کے لگ بھگ تھے، ائرپورٹ کے قریب جدید طرز کے ہوٹل مڈوے ہاؤس لے گئی۔ دوپہر کے کھانے کے انتظام میں ابھی وقت لگ رہا تھا۔ مڈوے ہاؤس کا وہ خوبصورت ہال جو اس سے قبل رقص و سرور کی ظلمتوں میں ڈوبا ہوتا تھا۔ اس ہال کے ڈائس پر حضرت بنوریؒ تشریف فرما تھے۔ اور لاؤڈ سپیکر سے مناسک حج اور اس کی راہ کی نزاکتوں اور ذمہ داریوں پر خطاب شروع فرمایا، یہ ہال اب لبیک اللھم لبیک کی پرکیف صداؤں سے گونجنے لگا۔ شام کو دوسرے جہاز پر ہم لوگ روانہ کر دئے گئے۔ سفر کے دوران بھی حضرت بنوریؒ نے جہاز کے مائک پر کچھ دیر کے لئے خطاب فرمایا۔

رات کو کسی وقت جدّہ پہنچنے کے بعد حضرت بنوریؒ کے ساتھ موٹر ٹیکسی لے کر مکہ مکرمہ روانہ ہوئے اور غالباً دو تین بجے رات ہم حضرت بنوری قدس اللہ سرہٗ کے ساتھ طواف و سعی سے فارغ ہوئے۔ اس سفر کا ایک عجیب و غریب واقعہ مجھے نہیں بھولتا جو مولانا بنوری قدس اللہ سرہٗ کا حضرت حق جل مجدہ سے خاص تعلق کا مظہر ہے۔ اور ناز کا ایک ایسا انداز ہے جس کا مظاہرہ محبت و عشق کے تمام مراحل طے کر کے مقامِ محبوبیت پر فائز ہونے والے خوش قسمت بندے ہی کر سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا کے لئے حرمین الشریفین کا راستہ غیب سے کھول دیا تھا۔ عموماً آپ ہر سال حج اور رمضان شریف میں عمرہ اور مسجد نبوی کے اعتکاف کی سعادت حاصل

کرتے ، آخر وقت تک کوئی پروگرام متعین نہ ہوتا مگر میعادِ وصال قریب ہوتے ہی آپ آتشیں جذبۂ شوقِ وصل ایسا بھڑک اٹھتا کہ حالات اجازت نہ بھی دیتے مگر آپ سب کام چھوڑ چھاڑ کر آستانہ یار پر جبین نیاز خم کرنے پہنچ جاتے ۔

آخری سالوں میں ضعف و نقاہت بڑھ گئی تھی اور گھٹنوں میں شدید درد کی وجہ سے چلنا پھرنا اور کسی اونچے مکان یا زینے پر چڑھنا بہت مشکل ہوتا ، ادھر موسم حج میں ہر سال حجاج کے اژدہام میں بے حد اضافہ ہوتا رہا۔ اسی سفر میں نمازِ عصر سے قبل میں نے حرم کے قریب مولانا کے مستقر پر حاضری دی۔ آپ خونیز کے مکان پر ٹھہرے تھے وہاں سے نماز عصر کے لئے چل پڑے ، مولانا بڑی مشکل سے اژدہام میں راستہ نکالتے ہوئے چلتے رہے حرم شریف پہنچے تو جماعت تیار تھی اور ہمیں حرم سے باہر سڑکوں پر صفوں میں جگہ ملی ۔ نماز کے بعد گھٹنوں کے درد سے نڈھال ہانپتے کانپتے حرم شریف میں داخل ہوئے ۔گھٹنوں اور جوڑوں کے درد ، حجاج کی دھکم پیل ، اونچے نیچے ڈھلوانوں پر چڑھنا ، اترنا ، مولانا کے لئے اب موسم حج کی یہ تکالیف ناقابلِ برداشت تھیں ۔ یہ حالات تھے کہ ہم اندر حرم شریف میں داخل ہوئے مولانا پر عجیب حالتِ جذب طاری ہوگئی ، اور شانِ دلربائی سے دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہوئے خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر مجھے کہا کہ آپ بھی آمین کہیں ۔

مولانا محمد عبداللہ صاحب بہلوی رحمۃ اللہ علیہ

۲۰ محرم ۱۳۹۸ھ مطابق یکم جنوری ۱۹۷۸ء کو ملک ایک اور جید عالم دین اور مایہ ناز بزرگ کی برکات سے محروم ہو گیا، یعنی حضرت مولانا محمد عبداللہ[1] صاحب بہلوی شجاع آبادی وصال فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ـــــ مرحوم کی تاریخ ولادت یکم رمضان ۱۳۱۳ھ ہے۔ اُس وقت کے اکابر علماء ہند اور مشاہیر دیوبند سے علوم ظاہری حاصل کیے۔ اسی طرح ان کے مشائخ طریقت میں شاہ فضل علی قریشیؒ، حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ جیسے یگانۂ عصر ائمہ اصلاح وارشاد شامل ہیں۔

---

[1] آپ کے والد نے منت مانی تھی کہ اگر خدا نے مجھے اولادِ نرینہ بخشی تو اس کو علم دین پڑھاؤں گا۔ حفظِ قرآن اور مشکوٰۃ شریف وحمائی تک کتابیں پڑھنے کے بعد آپ دیوبند تشریف لے گئے اور حضرت شیخ الہندؒ سے ترمذی شریف کے کئی اسباق پڑھے۔ جب حضرت شیخ الہندؒ مکۃ المکرمہ چلے گئے تو آپ نے حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ کی خدمت میں اکتسابِ علم کیا۔ مولانا محمد امیر دامانیؒ نے آپ کو سلاسلِ سبعہ میں خلافت سے نوازا۔ اور شیخ التفسیر مولانا حسین علی صاحبؒ نے آپ کو تفسیر قرآن کے ساتھ سلاسل اربعہ میں اجازت بخشی۔ حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے سلسلہ چشتیہ میں خلافت سے سرفراز فرمایا۔ پہلے سفر حج میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے مکہ مکرمہ میں سورۃ بقرہ کی تفسیر پڑھی۔ مختلف موضوعات پر آپ کی تقریباً ۲۳ تصانیف مطبوعہ وغیر مطبوعہ موجود ہیں۔ جنازہ مولانا عبداللہ صاحب درخواستی نے پڑھایا۔ اور تقریباً چالیس ہزار مسلمانوں نے اس مرد صالح کی نماز جنازہ میں شرکت کی۔ رحمہ اللہ۔ (مرتب)

عمر بھر درس وتدریس اور اشاعت علوم دینیہ کے ساتھ باطنی رُشد وہدایت کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ تلامذہ ومتوسّلین کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ آپ نے اپنے پیچھے تصوف وسلوک میں بڑی دقیع اور عالمانہ تصانیف ورسائل مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شکل میں چھوڑیں۔ گیارہویں پارہ تک قرآنِ کریم کی تفسیر بھی آپ کے باقیات الصالحات میں سے ہے۔ آپ سادگی، علم اور زُہد وتقویٰ میں اکابر سلف کا ایک نمونہ تھے۔ حق تعالیٰ حضرت مرحوم کی برکات کو جاری وساری رکھے۔ آمین

الحق

صفر ۱۳۹۸ھ

تذکارِ اسلاف

اکابر دیوبند کی یاد

برصغیر کے علمی و دینی اور سیاسی و ملی محسنین جن کے وجود باجود سے برصغیر میں اسلام کی رونق رہی اور جن کی بے مثال اور خیر القرون کی مانند قربانی اور پیہم جہاد سے برصغیر اور بالآخر پوری دنیا میں یورپی سامراج کا جنازہ اٹھا۔ ہمارے ہاں چند مخصوص گروہوں نے موقع بہ موقع ایسے محسن ملک و ملت حضرات کے خلاف کردارکشی کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ الحق کے پچھلے شمارہ میں اس پر مختصراً اظہار افسوس کیا گیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسے لوگ کسی کی شکوہ و شکایت اور نالہ و شیون کی بناء پر اپنے عزائم مشئومہ سے کب دستبردار ہو سکتے ہیں؟ ہمیں ٹھوس اور مثبت انداز میں بھی اس معاملہ پر سوچنا چاہیئے اور امتدادِ زمانہ اور خاص ظروف و حالات کی وجہ سے اسلامیان برصغیر کی اپنے محسن اسلاف کے احوال و سوانح اور ان کی علمی، سیاسی و ملی کارناموں سے جو غفلت اور بے خبری بڑھتی جا رہی ہے، اس کا بھی علاج سوچنا چاہیئے۔ جب خود ہمارے مدارس اور تعلیمی حلقے اپنے قابلِ فخر اسلاف و اکابر کے حالات، کارناموں، علمی مقام، مجاہدانہ کردار اور ان کے افکار و نظریات سے کماحقہٗ باخبر نہ ہوں تو اوروں سے کیا گلہ کیا جائے۔

حسنِ اتفاق کہ سالِ رواں میں برصغیر کی اسلامی اور علمی عظمتوں کا امین تعلیمی مرکز دارالعلوم دیوبند اپنے صد سالہ دور مکمل ہو جانے پر تعلیمی جشن منانا چاہتا ہے، اس مناسبت سے دیوبندی مسلک و مشرب سے وابستہ تمام حلقوں کا فریضہ ہے کہ موقع سے بھرپور

لہ دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ جشن کے موقع کی مناسبت سے استاذ محترم نے یہ نقشِ آغاز قلمبند کیا۔ (مرتب)

فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اسلاف کے سنہری کارناموں سے مسلمانوں کو متعارف کرانے کا بھرپور پروگرام مرتب کریں اور نہ صرف اپنے مدارس، خانقاہوں اور مساجد کی حد تک بلکہ جدید نسل اور نوجوان تعلیمیافتہ طبقوں تک تعارف کا یہ سلسلہ دراز ہو۔

جب ہم دارالعلوم دیوبند کا نام لیتے ہیں تو اس سے مراد دیوبند کے ایک قصبہ میں واقع ایک جامعہ اور دارالعلوم نہیں بلکہ وہ عظیم الشان مکتبِ فکر اور بیمثال تحریک ہے جس کا آغاز حضرت حکیم الامۃ شاہ ولی اللہ دہلوی رح کے ہاتھوں اٹھارہویں صدی کے اوائل میں ہوا، یہ وقت ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال کا آخری دور تھا، ایک طرف برصغیر میں مسلمانوں کی عظمت و شوکت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا تو دوسری طرف انگریزوں کی صبح کاذب نمودار ہونے لگی۔ ایسے حالات میں اس مکتبِ فکر کے بانی رح نے جس ہمہ گیر انقلابی پروگرام کا خاکہ بنایا اس کا عنوان تھا: فك كل نظام، یعنی وہ جاہلیت پر مبنی ہر فکری، عملی، اقتصادی، معاشی سیاسی نظام کو تہس نہس کر دو۔" تحریک دیوبند کا یہی ماٹو بنا اور کفر و استبداد اور جاہلیت و ظلم کی ہر نشانی سے جنگ اس کا منشور ہوا۔ دارالعلوم دیوبند کی اگر دوسرے لفظوں میں تعبیر کی جائے تو وہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح کا یہی الہامی اعلان ہی ہو سکتا ہے کہ: فك كل نظام ــــ تعلیم و معاش، اخلاق و سماج کے ہر ہر شعبہ میں ہمہ گیر انقلاب حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح نے اولاً تعلیم ہی کے ذریعہ اس انقلاب کو منتقل کیا، پھر ان کے فرزند اور جانشین نے پچاس سال تک انقلاب کے اس پودے کی آبیاری کی اور امیر المومنین سید احمد شہید رح اور شاہ اسمٰعیل شہید کی شکل میں یہ پودا تناور درخت بن گیا، اور اس کے ثمرات سے برصغیر کا مشرق و مغرب مالا مال ہونے لگ گیا۔ اصلہا ثابت و فرعہا فی السماء۔ گویا سید احمد شہید رح اور ان کے رفقاء نے اس انقلابی خاکہ میں عملی رنگ بھر دیا اور بالآخر انقلاب کا یہ سارا پروگرام تعلیمی، عملی، سماجی سیاسی تجربہ گاہوں سے گذرتے ہوئے اور جہاد و جہد کی بھٹیوں میں کندن بنتے ہوئے "دارالعلوم دیوبند" کی شکل اختیار کر گیا۔ دیوبند کے مقدس بانیوں رح نے اپنے ان انقلابی سے وہ سب کچھ اپنے وجود میں جذب کر لیا تھا، جو امام انقلاب دہلوی رح سے لے کر

سید احمد شہیدؒ تک چاہتے تھے۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا تفکر و تدبر، شاہ عبد العزیزؒ کا سوز دروں وعظ و تدریس اور تعلیم کے ذریعہ مقصد کی طرف پیشقدمی، انتھک اور مسلسل جدوجہد، سید احمد شہیدؒ کی جہاد و عزیمت، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی حمیت و صلابت، مجاہدین سرحد و یاغستان کی سرمستی و جان سپاری، علماء صادق پور کی سرفروشی، حاجی امداد اللہ کی زہد و روحانیت، رشید احمد گنگوہیؒ کی تبحر و فقاہت اور محمد قاسم نانوتویؒ کی نبوغ و عبقریت۔ ان تمام خصائص اور امتیازات نے مل کر جو مجموعی پیکر اختیار کیا، اس کی تعبیر دار العلوم دیوبند کے نام سے کی جانے لگی۔

دعوت و عزیمت کے یہ اساطین آسمان رشد و ہدایت اور دائرہ تجدید دین کے آفتاب و ماہتاب تھے، اور اب ان ائمہ تجدید کی صلاحیتوں اور کاوشوں کا اجتماعی ظہور دار العلوم دیوبند کی شکل میں ہو کر ـــ اسے ـــ جامع المجددین ـــ کا مقام فاخرہ دے گیا۔

اس مقام دعوت و تجدید کی ذمہ داری صرف یہ نہ تھی کہ ملک اس اجنبی کافر طاقت کے پنجۂ استبداد سے نجات پائے جو نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں انسانیت کی اعلیٰ و ارفع قدروں کا دشمن بن کر طوفان کی طرح چھا گیا تھا بلکہ یورپ کے اس منحوس سامراج کے اقتدار و تغلب کے ساتھ ساتھ عالم اسلام کو اس کے ملعون و مغضوب تہذیب و تمدن، خدا بیزار مغربیت سے بھی محفوظ رکھنا تھا، اور اس کے ساتھ تعلیمی، معاشی اور اخلاقی ہمہ گیر انقلاب سے عالم انسانیت کو سرخرو کرنا بھی، یہ کتنا ہمہ گیر آفاقی اور کٹھن پروگرام تھا؟ محدود و مادی اغراض کے انقلابی اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے ـــ پروگرام کی ایک کڑی تو مکمل ہوگئی، انگریز کو خائب و خاسر ہو کر نکلنا پڑا اور برصغیر کی آزادی کے نتیجہ میں جیسا کہ ہمارے انقلابی اکابرؒ کا اندازہ تھا سارے ایشیا میں برٹش سامراج کا جنازہ اٹھنے لگ گیا۔ مگر یہ تو حصول مقصد کا ایک ذریعہ تھا۔ ہمہ گیر انقلاب کے لیے پہلے دشمن کو نکالنا ضروری ہوتا ہے، پھر مقاصد کی طرف پیش رفت ہوتی ہے۔ انگریز تو نکل گیا مگر بدقسمتی سے مغرب کی جگہ مغربیت نے لے لی اور اب مغربیت کا عفریت مسلمانوں کی تہذیبی، معاشرتی، تمدنی، ثقافتی قدروں کو بری طرح روندنے لگا۔

مفکرِ اسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ہمہ گیر انقلابی پروگرام اور سید احمد شہیدؒ کے متاعِ بےبہا کو لے کر علماءِ دیوبند کا قافلہ ایک صدی سے زائد مدت کی مسافت طے کر چکا ہے۔ اس رواں دواں قافلے کا مقصود و مطلوب خدا کے آخری نظامِ حیات کو رائج کرنے کے علاوہ ہر باطل انقلاب سے برسرِ پیکار ہو کر اسلام کی ابدی صداقتوں کو ہر شعبۂ حیات میں قائم و دائم رکھنا بھی ہے۔ برِ صغیر سے ایک اجنبی کافر طاقت کا اخراج مقصود نہیں بلکہ حصولِ مقصود کا ایک ذریعہ تھا۔ جہادِ آزادی و حریت کے ساتھ ساتھ ان کی خدمات اور امداد و مقاصد کا سلسلہ اتنا وسیع اور دراز ہے کہ جس کا استقصا نہیں کیا جا سکتا۔ جہاد و سیاست کے میدان میں یہ سرخیل رہے۔ اسلامی معاشرت و تمدن کی نشو و نما اور حفظ و بقا کے کام میں ایک ایک سنت کے لیے کبھی کبھار پوری زندگی قربان کر دی گئی۔ اعدائے اسلام اور فرقِ باطلہ کے استیصال اور تعاقب میں یہ لوگ آخری سرحدوں سے دشمن کو نکال کر دم لیتے تھے۔ برِ صغیر میں عیسائیت کی اولین یلغار کے سامنے فولادی دیوار بن گئے۔ تجدد، ماڈرن ازم اور نیچریت کا فتنہ اٹھا تو یہی لوگ تھے جو میدان میں کود گئے۔ پھر جب ایک اجنبی کافر حکمران طاقت انگریز کی تہذیب و تمدن و معاشرت سے مصالحت کرانے والے "مصلحین" اور نام نہاد "ہمدردانِ ملت" پوری ہلاکت آفرینیوں سے میدان میں آئے تو اس کے خلاف ملائیت اور دقیانوسیت کی طنز و تشنیع اور ہر طرح کے مذاق کو سہتے ہوئے یہی جماعت تھی جو پوری جرأت سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سینہ سپر ہو گئی اور برِ صغیر کے مسلمانوں کو "کالا انگریز" بن جانے سے روک دیا ورنہ مصلحین کی صلح جوئیوں کے نتیجہ میں آج لارڈ میکالے کی حسرت پوری ہو چکی ہوتی اور برِ صغیر کا ہر باسی دل و دماغ سے انگریز اور عیسائی ہوتا صرف شکل و شباہت ہندوستانی رہ گئی ہوتی۔ آریہ سماج اور ہندوئیت کا بت توڑنے کے لیے بھی لوگ قریہ قریہ، بستی بستی مناظروں اور مباحثوں کی شکل میں پھیل گئے۔ جعلی استعماری نبوت "قادیانیت" کی متعفن لاش کو ٹھکانے لگانے میں اس طبقہ کا تقریباً صدی بھر جہد مسلسل شامل ہے۔ مذہب بیزار اور خدا بیزار مادی تعلیم کا طوفان اٹھا تو اس جماعت نے بےسر و سامانی اور بےکسی کے باوجود اسلامی علوم و فنون اور دینی تعلیم کے لیے ایک پورا متوازی نظام قائم کر دیا۔ اور

نہ صرف ملک بلکہ بیرونِ ملک بھی قرآن و سنّت کی نشرگاہیں اور انسانیت کی تربیت گاہیں قائم کیں، اسلام کی تشریح و ترجمانی اور علوم اسلامیہ کی ترویج و فروغ میں قرطاس و قلم کے ذریعہ جو عظیم سرمایہ فراہم کیا، اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ مرتب و مدون نہ ہونے کی وجہ سے دنیا کو نہ ہو سکا۔ ورنہ اگر علماء دیوبند کی تصانیف اور کتابوں کا کیٹیلاگ مرتب ہو جائے تو بلا مبالغہ اور محتاط جائزے کی بناء پر "تصانیف علماء دیوبند" کی فہرست اور اجمالی تعارف سے بھی کشف الظنون للچلپی اور ابن ندیم کی الفہرست سے بڑھ کر ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے۔ افسوس کہ اس کام کی طرف بہت پہلے توجہ دی جانی چاہیئے تھی مگر ایسا نہ ہو سکا فضلاء و علماء دیوبند اور دیوبند کے بالواسطہ یا بلاواسطہ علماء کی چھوٹی بڑی تصانیف اور مؤلفات، شروح و تراجم (جن کا سلسلہ پاک و ہند و بنگلہ دیش کے علاوہ افغانستان، مشرق بعید، مشرق وسطیٰ تک دراز ہے) کی ایک مکمل اور مفصل فہرست ضروری کوائف (مصنف، کتاب، موضوع، زبان، صفحات، سائز اور ناشر وغیرہ) کے ساتھ مدون کرانا وقت کا ایک اہم فریضہ ہے جس سے نہ صرف اپنوں بلکہ یورپ کے مستشرقین کی آنکھیں بھی کھل جائیں گی، کہ اس جماعت نے بے سرو سامانی اور منظیم کے بغیر علمی اور اسلامی لٹریچر میں کتنا عظیم اضافہ کیا یا چیز کا ایک محتاط اندازہ یہ ہے کہ اس صدی سوا صدی میں دنیا بھر میں علماء دیوبند کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ جائے گی۔ اس عظیم کام کی تدوین و ترتیب اور احاطہ و استقصاء کے لیے بہت بڑے وسائل، رجال کار اور ایک عظیم اکیڈمی کی ضرورت ہے، اور معلومات کی فراہمی میں پورے دیوبندی مکتب فکر بلکہ علمی ذوق رکھنے والے ہر علم دوست انسان کے تعاون کی بھی کہ وہ اپنی حد تک چھوٹی بڑی ایسی تمام کتابوں کا سروے کر کے اس ادارہ کو صحیح معلومات فراہم کریں۔ ایسے دائرۃ المعارف اور دیوبندی مکتب فکر کے انسائیکلو پیڈیا کے سامنے آجانے سے دیوبندی مکتب فکر کے طلباء اور اہلِ علم کو اپنے عظیم اسلاف کے علمی و فکری کام سے تعارف بھی ہو جائے گا اور احساس کمتری کے تمام پردے بھی ہٹ جائیں گے۔

کاش ایک پورا ادارہ اس کام میں لگ جاتا لیکن ادارہ نہ ہو تو کیا افراد کی ذمہ داریاں

ختم ہو جاتی ہیں۔ ہماری تاریخ ایسے افراد سے بھی تو بھری ہوئی ہے جنہوں نے ایک ذات سے پوری اکیڈمیوں کا کام کیا۔ بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہو اور طلب و جستجوئے صادق اور جوشِ عمل کا سرمایہ بھی ساتھ ہو۔

گو احقر ان تمام معنوی و ظاہری وسائل سے یکسر عاری ہے اور بے مائیگی علم و عمل کے ساتھ نہایت کثیر الاشغال بھی، مگر توکلاً علی اللہ تصانیف علماء دیوبند کی ایک جامع فہرست کی جمع و تدوین کا کام ابتدائی طور پر شروع کرا دیا گیا ہے۔ اس پہلے مرحلہ میں پورے طبقہ اور جماعت کا فریضہ اپنے طور پر معلومات کی فراہمی کا ہے۔ بالخصوص بھارت، بنگلہ دیش، افغانستان، عالم عرب، افریقہ اور مشرقِ بعید میں پھیلے ہوئے علماء و فضلاء دیوبند اور ان کے گوناگوں قومی و علاقائی زبانوں میں تصانیف کے بارہ میں معلومات کو سمیٹنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں اور بھرپور تعاون کا محتاج ہے۔

بہرحال یہ تو ویسے ایک ضمنی بات تھی جو بر سبیلِ تذکرہ آ گئی۔ یہی حال علماء دیوبند کی نگرانی، ادارت اور سرپرستی یا اُن کے قلم سے جاری ہونے والے ماہنامہ، سہ ماہی، پندرہ روزہ، ہفت روزہ، روزنامہ اخبارات و جرائد اور مجلات کا ہے۔ جو لوگ علماء دیوبند کو تحریر و صحافت کے نام سے نا آشنا قرار دیتے ہیں۔ اگر اس صدی میں علماء دیوبند کی صحافتی خدمات کی تاریخ اور دیوبندی علماء و اہلِ قلم کے مجلات و رسائل کا ایک جائزہ مرتب کیا جائے تو یہ بات بہت لوگوں کے لیے موجبِ حیرت ہوگی کہ یہ فہرست پانچ چھ سو سے کم نہ ہوگی۔

یہ تو کام کے کچھ رُخ تھے، رہ گئے رجالِ کار اور شخصیات، تو ان میں سے کتنے ہیں جن کی زندگی، خدمات اور آثار کے لیے کئی کئی اکیڈمیاں ناکافی ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، شیخ الہندؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور بے شمار اعیان و اساطین ہیں جن کے علوم و معارف اور خدمات سے موجودہ دور کی نئی نسل کو فکری و عملی میدانوں میں راہنمائی مل سکتی ہے۔ بانی دیوبند حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اپنے علوم و معارف اور اسلام کی ترجمانی اور دفاع کے لحاظ سے ایک سنتے

علمِ کلام کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ ایک عظیم عالم کی زبان میں انہوں نے آنے والے کئی سو سال تک اسلام کو دشمنانِ اسلام کے علمی و فکری حملوں سے محفوظ کر دیا، جہاد کے میدان میں کمانڈر انچیف کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالتے ہیں، احیاءِ سنّت کے لیے وہ عہدِ صحابہؓ جیسی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ سادگی، نفاستِ عظمتِ اخلاق ہیں وہ خیر القرون جیسی معیاری زندگی رکھتے ہیں۔ مگر ہمارے مدارسِ عربیہ میں کتنے علماء، اساتذہ اور طلبہ ہیں؟ جنہیں اپنے اس حجۃ الاسلامؒ کے علوم واحوال کا علم ہے؟ کتنے طلبہ ہیں جنہیں ایک ہزار سے زائد کتابوں کے مصنف حکیم الامتؒ کی دو ایک کتابوں کے مطالعہ کا بھی اتفاق نہیں ہوا؟ کتنے اخلاص و حمیت سے سرشار فعّال اور پُرجوش کارکن ہیں جنہیں شیخ الہندؒ کی ہمہ گیر بین الاقوامی تحریک کا کوئی ایک گوشہ بھی معلوم ہو؟

دیوبند کے صد سالہ جشن کے موقع پر حقیقی کام یہی ہے کہ دیوبند کے کام سے اپنوں اور پرایوں کو آگاہ کیا جائے ـــــ بھارت غیروں کا ملک ہے، وہاں مولانا انور شاہ کشمیریؒ پر سیمینار ہو رہے ہیں۔ وہاں کے ریڈیو اور ذرائع ابلاغ سے مستقل پروگرام اور فیچر نشر ہوتے ہیں ـــ اور ہمارے ہاں اس محاذ پر جو جمود اور سکوتِ مرگ ہے۔ اس جرم کے رشکوے کی سزا بھی مفاجات سے کم نہیں۔ مگر کیا اپنے طور پر ہم کچھ نہیں کر سکتے؟

مدارس کے طلبہ کے لیے اس موضوع پر ایک اضافی پرچہ شامل کرانا چاہیئے۔ اپنے اکابرؒ کے علوم پر مقالات مرتب کروا سکتے ہیں، توسیعی لیکچر دیئے جا سکتے ہیں، مدارس اور کالجوں میں ہمارے طلبہ کی تنظیمیں معلوماتی تقریبات منعقد کر سکتی ہیں، اپنے وسائل اور رسوخ کے دائرہ میں اخبارات و جرائد میں مضامین لکھ سکتے ہیں ـــ دیوبندی مکتبِ فکر سے وابستہ افراد، تنظیمیں اور جماعتیں ملک بھر میں تعارفی سیمنار منعقد کرا سکتے ہیں۔ جس کی ایک مثال فیصل آباد میں ایسے ایک عظیم الشان اجتماع کی شکل میں سامنے آ چکی ہے اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی یاد میں لاہور میں ایک تقریب کا اعلان ہو چکا ہے۔ اسی طرح عالمِ عرب کو اکابر علماءِ دیوبند کے علوم و معارف سے روشناس کرانے کے لیے بڑی سطح پر کام کی ضرورت ہے۔ یہ کام عربی رسائل اور مجلات کے ذریعہ بھی ہو سکتا تھا۔

مگر بدقسمتی سے پورے پاکستان سے ایک بھی عربی پرچہ نہیں نکل رہا جو ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے ——— اب ایک طویل غفلت کے بعد مادرِ علمی دار العلوم دیوبند سے الداعی کے نام سے ایک پندرہ روزہ جریدہ شائع ہونے لگ گیا ہے جو بسا غنیمت ہے۔ بہرحال یہ اور اس طرح کے بے شمار کاموں کے شعبے اور زاویے ہیں جن پر فکر و عمل کی صلاحیتیں مرکوز کرنی چاہئیں۔

الحق

مئی ۱۹۷۸ء

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ملتانیؒ

اسی ماہ ملتان کے مرکزی مدرسہ قاسم العلوم کے مہتمم اور بانی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع[1] صاحبؒ کا بھی وصال ہوگیا۔ مرحوم نے اپنی طویل زندگی دین کی نشر و اشاعت، درس و تدریس میں گذاری، مدرسہ قاسم العلوم ان کی تابندہ یادگار رہے گی۔ آخری عمر میں بوجہ ضعف و نقاہت اہتمام کی ذمہ داری حضرت مولانا مفتی محمود صاحب قائدِ جمعیۃ العلماء اسلام کے سپرد فرما دی تھی۔ مولانا مرحوم کی وفات پر ہمارے محترم قائدِ جمعیۃ خصوصی تعزیت کے مستحق ہیں۔ حق تعالیٰ مرحوم کے فیض اور برکات کو جاری و ساری رکھے اور مدرسہ قاسم العلوم اسی طرح قاسمی اور مدنی مسلک کا متنا د و ترجمان بنا رہے۔ آمین

الحق

جون ۱۹۷۸ء

◎

---

[1] مرحوم نے کئی دفعہ دارالعلوم حقانیہ میں قدم رنجہ فرمایا تھا۔ ایک بار بعد از نماز عصر دارالعلوم کی جامع مسجد میں طلبہ کو اپنے قیمتی خطاب سے نوازا بھی تھا۔ (مرتب)

مولانا عبدالہادیؒ

مرشد دین پوری

اخباری اطلاع کے مطابق ریاست بہاولپور کے مشہور مرکزِ رشد و ہدایت دین پور شریف کے مسند نشین صاحبِ نسبت، وارثِ بزرگ شیخِ وقت مولانا عبدالہادی[1] صاحب دین پوری قدس اللہ سرہٗ العزیز واصل بحق ہوگئے۔ رمضان المبارک کی وفات ویسے بھی لقاءِ رب اور وصالِ حق کا ایک مبارک ذریعہ، پھر جب ایسے مقربین بارگاہِ ایزدی کا وقتِ موعود آجائے تو ان نفوسِ مطمئنہ کے فوز و فلاح اور سکینہ و رضا کا عالم ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ مگر افسوس اور غم تو ہم پسماندگانِ راہِ سعی و عمل کا ہوتا ہے۔ جو اس قحط الرجال میں ایسے قدسی صفات بزرگوں کی برکات سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔ مولانا مرحوم سے اس خانقاہ کی رونق قائم رہی جو ایک عرصہ تک وعظ و اصلاح اور زہد و ارشاد کے ساتھ جہادِ آزادی اور تحریک استخلاص وطن کا بھی ایک سرگرم مرکز رہا۔ تحریک ریشمی رومال اور جہادِ حریت کے ایک اہم ستون اس خانقاہ کے عظیم روحانی مرشد اور ہادی حضرت مولانا غلام محمد دین پوریؒ تھے۔ شیرِ بیشۂ اسلام اور عظیم انقلابی رہنما مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے ان گوناگوں نسبتوں کی وجہ سے یہاں کی سرزمین کو اپنے ابدی استراحت کیلئے منتخب کیا۔ حضرت مرحوم مولانا عبدالہادی

---

[1] آپ حضرت خلیفہ غلام محمد دین پوری قدس سرہٗ کے خلفِ اکبر ہیں۔ ۴، ۵ راپریل ۱۹۰۲ء کی شب آپ کی پیدائش ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل۔ حضرت دین پوری، حضرت امروٹی اور حضرت لاہوری (رحمہم اللہ) ان تینوں مربیوں کے ساتھ آپ کو خاص نسبت تھی ــــ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: "یدِ بیضا از حاجی علیدی" (مرتب)

قدس سرہٗ کی صحت، ضعف ونقاہت اور طویل علالت کے باوجود بھی ایسی نہ تھی کہ گویا آپ یکایک رخت سفر باندھ لیں گے۔ اور یہ ناچیز کی خوش بختی یا حسن اتفاق ہے کہ ایسے دور دراز علاقوں میں جانے کا اتفاق بہت ہی کم ہونے کے باوجود اسی رمضان المبارک میں یعنی حضرت کے وصال سے چند دن قبل ۷ رمضان مطابق ۱۲ اگست کو دین پور شریف جاکر حضرۃ کی خدمت میں کچھ دیر کیلئے حاضری کی غیبی صورت ظاہر ہوئی۔ حضرت اس وقت صاحب فراش تھے۔ فرمایا کہ وضوء اور نماز سب کچھ اسی چارپائی پہ ہوتا ہے اور جماعت کے وقت چارپائی اٹھاکر صف کے ساتھ لگادی جاتی ہے، کچھ دیر دعاؤں سے نوازا جمعیۃ اور ملکی حالات کا بھی دریافت فرماتے رہے۔ حضرات مشائخ مولانا دین پوریؒ، مولانا سندھیؒ کے مزارات پر فاتحہ پڑھنے کے لئے اپنے خادم کو ساتھ بھیجا اور بڑی محبت وشفقت سے رخصت فرمایا۔ یہ خیال نہ تھا کہ ظلمتہائے دوراں کے چند سحری چراغوں کا یہ ٹمٹماتا چراغ بھی رواردی میں ہے کہ ؎

دل کا جانا ٹھہر گیا ہے   صبح گیا یا شام گیا

اسی دن مخدوم محترم حضرت مولانا عبداللہ درخواستی مدظلہٗ کی خدمت میں خان پور شریف حاضری بھی ہوئی اور ان کے دورۂ تفسیر میں کچھ دیر بیٹھنے کا شرف بھی نصیب ہوا مجھے پہلی بار ۱۹۷۰ء کے لگ بھگ حضرت مولانا عبیداللہ انور مدظلہٗ کی معیت میں دین پور ان کی خدمت میں حاضری اور دن بھر قیام اور ان کی میزبانی کا شرف نصیب ہوا تھا۔ پھر ایک بار مری کے مضافات میں جبکہ آپ بحالیٔ صحت کے سلسلے میں وہاں مقیم تھے، ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی اور یہ تیسری اور آخری زیارت تھی۔ ایک بار جب الحق میں ایران کے جشن شہنشاہیت کے جاہلیت پہلوؤں پر تفصیل سے اداریہ آیا تو آپ نے ایک مفصل مکتوب کے ذریعہ تحسین، حوصلہ افزائی اور دعاؤں سے نوازا۔ حق تعالیٰ ایسے سراپا فیض وبرکت بزرگوں کے فیض کو جاری وساری رکھے اور ان کے اخلاف صدق کے ذریعہ خانقاہ کی رونق قائم ودائم رکھے۔

الحق

اگست ۱۹۷۸ء

مولانا بادشاہ گل بخاریؒ

اسی اکوڑہ خٹک میں ایک بزرگ شخصیت حضرت مولانا بادشاہ گل بخاری نے بھی داعئ اجل کو لبیک کہا، وہ اپنے بزرگ صاحبِ رُشد و اصلاح والد مرحوم کے مسندنشین بھی تھے، اور اپنے قائم کردہ مدرسہ جامعہ اسلامیہ کے مہتمم اور منتظم بھی۔ وعظ و تبلیغ، درس و تدریس اور اصلاح و سلوک ان کا مشغلہ رہا۔ حق تعالیٰ جانے والے تمام اکابر علم و فضل کے فیوضات و برکات کو جاری و ساری رکھے اور قحط الرجال میں ملتِ مسلمہ کی خزانۂ غیب سے دستگیری فرمائے۔ آمین

الحق

نومبر ۱۹۷۸ء

---
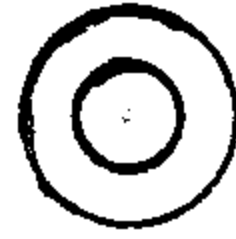
۱ آپ بروز جمعہ دسمبر ۱۹۱۴ء میں جناب سید مہربان علی شاہ بن سید حبیب شاہ بخاری کے ہاں اکوڑہ خٹک میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی کتابیں اپنے والد صاحب، علاقہ کے علماء اور پشاور کے مدرسہ تعلیم القرآن میں مولانا عبدالمنان فاضلِ دیوبند سے پڑھیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۳۵۶ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۵۷ھ میں سندِ فراغ حاصل کی۔ فراغت کے بعد اکوڑہ خٹک میں جامعہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ بیعت کا تعلق اپنے والد سے رہا۔ اور سلسلہ قادریہ و نقشبندیہ میں آپ کے خلیفہ و ماذون رہے حضرت مدنیؒ کے دستِ حق پرست پر بھی بیعت کی تھی۔ ("الرشید" دیوبند نمبر)

(مرتب)

مولانا محمد عرفان رحمہ اللہ

۱۹ صفر ۱۳۹۹ھ جامعہ اشرفیہ لاہور کے حضرت مولانا محمد عرفان صاحب مرحوم تقریباً ستّر برس کی عمر میں انتقال فرما گئے، مولانا مرحوم حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب بانی جامعہ اشرفیہ کے بھتیجے تھے ان کے بعد زندگی بھر جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد کے مخلص خادم اور کارکن رہے۔ آپ کو حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحؒ سے استفادہ کا موقعہ ملا حضرت مفتی صاحب مرحوم کے معتمد اور منظور نظر تھے عجیب اخلاق کریمانہ کے مالک تھے، ان کی وفات سے حضرت مفتی صاحب مرحوم کا پورا خاندان اور حلقہ متاثر ہوا ہے۔ خداوند کریم مرحوم کو اعلیٰ ترین مقامات قرب سے نوازے۔ جامعہ اشرفیہ کے اس صدمہ میں ہم سب شریک ہیں۔

الحق
مئی ۱۹۷۹ء

حاجی شیر محمد گوجرہ

۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۹ھ کو گوجرہ ضلع فیصل آباد میں حکیم الامّت مولانا تھانوی رحؒ کی بزم انور کا ایک چراغ بجھ گیا اور جناب حاجی شیر محمد صاحب انتقال فرما گئے۔ مرحوم حضرت تھانوی رحؒ کے مجاز بیعت دینی و اخلاقی اور روحانی خدمات میں زندگی گذری فرحمۃ اللہ وارضاہ۔

الحق
مئی ۱۹۷۹ء

مولانا سیّد فضل اللہ رحمانی ــ مولانا اسعد اللہ صاحب
مولانا فضل احمد صاحب رحمہم اللہ

علم وحکمت، دین وموعظت کے کتنے چراغ پچھلے دنوں گُل ہوگئے اور کیسے کیسے ستون پیوندِ خاک ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

۲۴ مئی کو مولانا محمد علی مونگری کے پوتے اور سچّے جانشین جامعہ عثمانیہ دکّن کے صدر شعبۂ دینیات، علم حدیث، اسماء الرجال اور فقہ پر گہری نظر رکھنے والے نقّاد و بصیر اور امام بخاری رحمہ اللہ کی کتاب الادب المفرد کی بسوط عربی شرح فضل اللہ الصمد کے مصنف حضرت مولانا سید فضل اللہ صاحب رحمانی رح تقریباً ۷۸ برس کی عمر میں علی گڑھ میں انتقال فرما گئے۔

اور اب خبر آئی ہے کہ مظاہر العلوم سہارنپور کے باصلاحیت منتظم، حدیث کے بلند پایہ استاذ، ایک شیخ طریقت اور متبحر عالم حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب رح ناظم مظاہر العلوم سہارنپور بھی رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ مرحوم نے عمر بھر دین اور طلبۂ دین کی خدمت کی۔ وہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہٗ (رحمہ اللہ) نزیل مدینہ طیبہ کے شاید سب سے بڑھ کر دیرینہ رفیق اور معتمد تھے۔ حق تعالیٰ دین کے ان خادموں کو ان کی محنتوں کا غیر متناہی صلہ عطا فرما دے۔

انتقال فرمانے والے حضرات میں ہمارے ملک کے ایک بزرگ حضرت مولانا فضل احمد صاحب سکنہ تلہ گنگ بھی ہیں جن کی ساری زندگی دینی و ملّی کاموں میں محنت اور جدّ وجہد میں گذری۔ وہ امیر شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری قدس سرہٗ کے مخلص

ساتھیوں میں سے تھے۔ اور اب بھی تحفظِ ختمِ نبوت کے کاموں میں سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے ـــــ دارالعلوم حقانیہ کی امداد اور تعاون میں بھی وہ ہمیشہ بھرپور حصہ لیتے رہے ـــ حق تعالےٰ علم وادب کے ان چراغوں کی روشنی سے اس دنیا کو روشن رکھے اور ان کے معنوی برکات وفیوضات جاری وساری رہیں۔

رحمہم اللہ تعالیٰ ورضی اللہ عنہم وارضاہم

الحق

جون ۱۹۷۹ء

مولانا انعام کریم صاحب

ایک قابل رشک مدنی مہاجر

ہمارے ایک مدنی مہاجر محب و مخدوم حضرت مولانا انعام کریم صاحب ناظم مدرسۃ الشرعیہ مدینہ منورہ بھی یکایک دارِ فانی سے دار البقاء کو چل بسے۔ وہ تیس بتیس سال سے خاکِ مدینہ میں پیوند ہو جانے کیلئے آستانۂ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے شام کے وقت اچھے بھلے تھے۔ کسی نے کہا کہ صحت کمزور ہے، آپ گرمیوں میں حسبِ معمول ہندوستان جائیں گے۔ کہا اس انتظار میں دن گن رہا ہوں کہ یہاں کی حیاتِ ابدی نصیب ہو جائے۔ بعد از مغرب، مواجہہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں گئے حسبِ معمول صلوٰۃ و سلام پڑھ کر اپنے کمرہ میں آئے، اندر سے کنڈی لگا دی، نمازِ عشاء کیلئے باہر نہ آئے تو کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، جواب نہ پایا۔ بالآخر کسی طرح دروازہ کھلوا دیا گیا۔ دیکھا تو فرش پہ دراز واصل بحق ہو چکے تھے۔ نمازِ فجر کے بعد مسجدِ نبوی میں جنازہ پڑھا گیا۔ اور جنت البقیع میں اپنا ٹھکانا بنا لیا۔ عاش سعیداً ادیاب سعیدا۔ تواضع للّٰہیت، اخلاق و شرافت، نفاست و طہارت میں اپنے اسلاف کا نمونہ تھے۔ قریبی رشتہ حضرت شیخ الہندؒ سے تھا۔ پاکستان آتے تو حضرت مولانا عزیر گل اسیر مالٹا اور ہم گنہگاروں کو بھی اپنی زیارت اور قدوم سے مشرف فرماتے۔ مولانا عزیر گل سے بھی خاندانی رشتہ تھا۔ اس موقعہ پر ہم مولانا مدظلہ سے بھی تعزیت کرتے ہیں اور مرحوم کے تمام خاندان سے بھی۔

اللّٰھم اجعلہ لنا خیر ذخر وخیر شفاعۃ فی بلدۃ حبیبک صلی اللہ علیہ وسلم۔

الحق
اگست ۱۹۷۹ء

◎

مولانا شریف اللہ خان رحمہ اللہ

یکم ستمبر ۱۹۷۹ء کو لاہور میں علمی اور تدریسی دنیا کی جانی پہچانی شخصیت حضرت علامہ مولانا شریف اللہ خانؒ کا انتقال ہوا۔ مرحوم بقیۃ السلف، اور جامع المعقول والمنقول علماء میں سے تھے تقسیم ہند سے قبل مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی اور مدرسہ امینیہ دہلی اور تقسیم کے بعد لاہور کے مختلف مدارس بالآخر جامعہ مدنیہ لاہور میں اعلیٰ انتہائی کتب پڑھاتے رہے۔ مرحوم برصغیر کے کئی علماء کے استاد تھے۔ تلامذہ میں عصر حاضر کی بعض اور معروف شخصیتیں بھی شامل ہیں۔ مرحوم کے کمالات کا شہرہ بچپن سے اپنے استاد حضرت مولانا عبدالغفور سواتی مرحوم صدر مدرس دارالعلوم حقانیہ سے سنتا رہا جو دہلی میں مولانا مرحوم کے ہم عصر اساتذہ میں سے تھے۔ حق تعالیٰ مرحوم کو درجات عالیہ عطا فرماوے۔

الحق

ستمبر ۱۹۷۹ء

مولانا محمد اسرائیل

رمضان کے عشرۂ اخیرہ میں صوبہ سرحد کے ایک ممتاز عالم حضرت مولانا محمد اسرائیل صاحب بانیٔ دارالعلوم نعمانیہ اتمانزئی نے طویل علالت کے بعد انتقال فرمایا دارالعلوم نعمانیہ کی شکل میں آپ کی زندگی دینی علوم کے ترویج و فروغ میں گذری یہ مدرسہ صوبہ سرحد کے قدیم مدارس میں سے ہے۔ مرحوم کی وفات سے علاقہ ایک معمر اور قدیم روایات کے حامل بزرگ سے محروم ہوگیا۔ ادارۂ الحق اور دارالعلوم حقانیہ مرحوم کے تمام متعلقین بالخصوص فرزند و جانشین مولانا روح اللہ صاحب کیساتھ تعزیت میں شریک ہے۔

الحق :۔ ستمبر ۱۹۷۹ء

مولانا فضل محمد نقشبندی

یکم جولائی ۱۹۷۱ء بعد از مغرب پلّہ ضلع جہلم میں حضرت مولانا فضل محمد نقشبندی مجددیؒ نے بعمر ۸۷ سال انتقال فرمایا موصوف نے نامساعد حالات میں دینی علوم کی تحصیل کی تکمیل مولانا سید امیر صاحب کوروھوی تلمیذ حضرت مفتی کفایت اللہ مرحوم سے فرمائی تصوّف و سلوک مراحل سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں سید حبیب شاہؒ اور بعد میں حضرت مولانا عبدالمالک صدیقیؒ سے طے کئے اور خلافت پر فائز ہوتے دینی علمی سماجی و ملّی کاموں میں پیش پیش رہے۔ شاہ جیؒ اور ان کی مجلس احرار سے والہانہ تعلق رہا۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوّت میں قید و بند کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ بدعات و رسومات کے رد میں پیش پیش رہے۔ دارالعلوم حقانیہ کے لئے تعاون و امداد میں دلالۃ علی الخیر کرتے رہے۔ حق تعالیٰ ان تمام خدمات کا صلہ اب دارالقرار میں عطا فرمادے۔

الحق :۔ ستمبر ۱۹۷۹ء

مولٰنا عبدالاحد صاحب رحمہ اللہ

پچھلے ماہ ۲ راکتوبر منگل کی شام کو دارالعلوم دیوبند کے ایک مایہ ناز استاذ حضرت مولانا عبدالاحد صاحب مرحوم انتقال فرما گئے۔ وہ پچھلے تیئس سال[1] سے دارالعلوم میں اسلامی علوم وفنون پڑھاتے تھے اوراب طبقۂ علیا کے اساتذہ میں سے تھے۔

مولانا مرحوم دارالعلوم کے عہدِ سعادت کے ایک ممتاز اور جید مدرس استاذ العلماء حضرت مولانا عبدالسمیع دیوبندی مرحوم کے صاحبزادہ تھے، اوراس وقت کے عہدِ زوال وقحط الرجال میں دارالعلوم دیوبند کے لیے بقیۃ السلف اور غنیمت۔ اس عرصہ میں ہزاروں افراد نے ان سے استفادہ کیا ہوگا۔ ایسے دیرینہ خدام واساتذہ کا ایسے وقت میں اپنے مادرِعلمی سے یکایک جدا ہوجانا اور بھی باعثِ غم ہے کہ دارالعلوم کا عظیم الشان علمی جشن صدسالہ سرپر ہے۔ حق تعالیٰ دارالعلوم اور مرحوم کے متعلقین کو صبرواجر اور مرحوم کا نعم البدل عطا فرمادے۔

دارالعلوم حقانیہ اور ماہنامہ الحق مولانا مرحوم کے تمام متعلقین اور ارباب دارالعلوم دیوبند سے اس صدمہ میں اظہارِ تعزیت کرتا ہے اور رفع درجات کا متمنی ہے۔

الحق

نومبر ۱۹۷۹ء

---

[1] دارالعلوم دیوبند میں آپ ۱۳۵۸ھ میں مدرس مقرر ہوئے تھے۔ (مرتب)

مولانا محمد الوری لائلپوری رحمۃ اللہ علیہ

علمی حلقوں کو اس خبر سے بڑا صدمہ ہوگا کہ حضرت مولانا محمد انوری[1] لائلپوری ؒ ۲۲ جنوری ۱۹۸۰ء کو صبح سات بجے انتقال فرما گئے۔ مولانا مرحوم کی عمر تقریباً ستر برس تھی۔ حضرت مولانا رائے پوری ؒ سے خلافت پائی اور حضرت علامہ انور شاہ کشمیری ؒ سے تلمذ اور صحبت و خدمت کی خاص نسبت حاصل تھی۔ عمر بھر علم اور دین کی خدمت و اشاعت میں کوشاں رہے۔ ۱۹۴۷ء میں لائلپور (فیصل آباد) آکر ایک دینی مدرسہ قائم کیا اور بڑی بے نفسی اور خاموشی سے تبلیغ و تعلیم میں مصروف رہے۔ حق تعالیٰ مولانا مرحوم کو درجاتِ عالیہ اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ رحمہ اللہ الجنۃ مثواہ

الحق

فروری ۱۹۸۰ء

---

[1] مرحوم مشرقی پنجاب کے شہر لدھیانہ کے قریب ایک قصبہ کے باشندہ تھے۔ دارالعلوم دیوبند اپنے والد مرحوم کے ہمراہ تعلیم کے لیے حاضر ہوئے۔ دورۂ حدیث حضرت محدث عصر مولانا انور شاہ کشمیری ؒ سے پڑھا اور آپ کے خواص میں شمار ہونے لگے، بیعت کا تعلق ان ہی مرحوم استاذ سے تھا۔ بعد میں خلافت حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی۔ فراغت کے بعد مدتوں لدھیانہ کے قریب ایک قصبہ میں تدریس (کے فرائض سرانجام) دیتے رہے۔ شاہ صاحب ؒ سے متعلق ایک مستقل سوانح "آئینہ کمالاتِ انوری" کے نام سے شائع کی۔ ماہنامہ الحق سے بڑا تعلق خاطر رہا۔ اپنے گرانمایہ مضامین اس میں شائع کرتے رہے۔ (مرتب)

مولانا عبدالرفیع بادشاہ صاحبؒ

۱۴ ربیع الثانی (سنہ ۱۴۰۰ھ) کو حضرت مولانا عبدالرفیع بادشاہ صاحب فاضلِ دیوبند، بام خیل تحصیل صوابی میں انتقال فرما گئے۔ علوم دینیہ کی ترویج میں پیش پیش، مدرسہ مدینۃ العلوم کے بانی اور حکیم حاذق تھے۔ تحریکِ پاکستان کے بھی سرگرم کارکن رہے۔ نمازِ جنازہ دارالعلوم حقانیہ کے استاذِ حدیث مولانا عبدالحلیم مردانی مدظلہ نے پڑھائی۔ آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

الحق

مارچ، اپریل سنہ ۱۹۸۰ء

◎

شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان

ع بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

۲۸ مئی ۱۹۸۰ء کو ہمارے علمی و دینی حلقے شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان صاحب قدس سرہٗ (راولپنڈی) کے سانحۂ وفات کے عظیم حادثہ سے دوچار ہوئے، وفات کا واقعہ بحالتِ سفر دوبئی متحدہ امارات کے راشد ہسپتال میں پیش آیا۔ مولانا کی ذات سے دینِ متین اور قرآنِ مبین کی وسیع خدمات کا سلسلہ جاری تھا۔ حق تعالیٰ نے انہیں بڑی نمایاں اور منفرد خصوصیات سے نوازا تھا۔ گو ان کا خاص میدان قرآن کریم کی نشر و اشاعت اور درس و تدریس رہا مگر وہ دیگر علومِ عقلیہ و نقلیہ میں بھی ماہرانہ دسترس رکھتے تھے۔ درسِ نظامی پر عالمانہ عبور رہا اور ان علمی ملکات کو انہوں نے قرآنِ کریم کی تفسیر و تدریس میں ایسا استعمال کیا کہ آج ان شاء اللہ ان کا نام قرآن کے خاص خدّام میں محسوب ہوگا۔ زبانِ خلق پر بھی وہ شیخ القرآن کے منفرد لقب سے معروف ہوئے کہ شیخ الحدیث کا لقب اور منصب تو تاریخِ اسلام میں چلا آرہا ہے۔ مگر وہ غالباً پہلے بزرگ ہیں جنہیں شیخ القرآن کے تمغۂ سعادت کے ساتھ شہرت ملی۔ قرآنِ کریم میں دین و دنیا کی تمام مشکلات اور لاینحل گتھیوں کو سلجھایا گیا ہے۔ معاشرت و تمدّن، تہذیب و سیاست، اخلاق و سیرت، قانون و دستور، احکام و اصول ہر پہلو سے جامع اور معجز کتاب ہے۔ مگر اس کے باوجود از اوّل تا آخر خداوند کریم نے اپنی کتاب کو توحید کے آہنی اور فولادی مباحث اور دلائل کی زنجیروں سے باندھ کر ایک وحدت اور اکائی کی شکل میں پیش فرمادیا ہے۔ حضرۃ مرحوم کی ساری تگ و دو شرح بیان درس و تدریس وعظ و تقریر بھی توحید کے مربوط و مضبوط

سلسلہ سے بندھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اور ان کے معتقدین اور ہمنوا حضرت پر یہ رنگ اتنا گہرا اور پختہ ہوا کہ اور سارے رنگ معدوم ہوگئے۔ اور یہ لوگ عرفِ عام میں توحیدی کہلائے اور حالت یہ ہوگئی کہ ؎

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

اس جذبۂ توحید کی چھاپ مولانا مرحوم کی ساری زندگی پر حاوی رہی۔ اور اس میدان میں جب وہ اپنی قلندرانہ شان کے ساتھ پورے طمطراق اور جاہ و جلال سے اترتے تھے تو کبھی کبھی بیگانوں کے ساتھ معتدل مزاج اپنے بھی زد میں آجاتے تھے۔ اصحاب ہوٰی و ہوس اربابِ شرک و بدع کے تعاقب اور مقابلہ میں وہ بلاشبہ مردِ جری اور صاحبِ عزیمت و استقامت سپاہی تھے اور وہ جب ڈنکے کی چوٹ توحید بیان کرتے تھے مسلمان تو مسلمان واحد لاشریک لہٗ کے تکوینی غلام بھی وحدتِ باری تعالیٰ کے اس بیان و تشریح پر وجد کرتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ غیور ہیں اور مولانا کی یہی ادا ان شاء اللہ ان کے لئے بارگاہِ ایزدی میں خلعتِ قرب و رضا سے سرفرازی کا ذریعہ بنے گی۔ جرأت و بے باکی سخاوت و مہمان نوازی دین کے اعلاء و اشاعت کے ہر ہر میدان میں جرأت مندانہ کردار اور آتشِ نمرود میں بے خطر کود پڑنے کا ابراہیمی جذبہ، پھر اس کے ساتھ گرد و پیش ماحول اور مجلس سے جلد متاثر ہوجانے والی سادہ دلی، مولانا کی یہ سب ادائیں ملت کو رلاتی رہیں گی۔ وہ ایک مکتبِ فکر کے محبوب تھے۔ ہزاروں تلامذہ کے استاد تھے اور استاد بھی ایسے کہ معلّم قرآن اور کئی دینی تعلیمی مراکز کے موسس و مدیر۔ اور ان سب خدمات اور فیوضات کی وجہ سے ان کی وفات وقت کا ایک عظیم سانحہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ملّتِ مسلمہ کو مولانا مرحوم کا نعم البدل عطا فرماوے اور ان کے اخلافِ صدق، تلامذہ، معتقدین اور مدارس کے ذریعہ ان کا فیض جاری و ساری رہے۔

الحق: مئی ۱۹۸۰ء

◎

زعیم جہاد و عزیمت

مولانا مفتی محمودؒ

رفتم و از رفتنم یک عالمے تاریک شد
من مگر شمعم چوں رفتم بزم برہم ساختم

واویلاہ، وامصیبتاہ، حیف صد حیف۔ ۴ ذی الحجہ ۱۴۰۰ھ کو چودھویں صدی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ آخر شب اپنے ساتھ علم و عمل اور جہاد و سیاست کا ایک ایسا تابندہ و درخشندہ ستارہ بھی لیکر رخصت ہوا جو ایک عرصہ تک ہر نازک بحرانی اور ظلماتی لمحات میں ہدایت و رہنمائی کا پیغام اور مینار رشد و ہدایت بنتا رہا۔ ظلم و عدوان سے برسرپیکار قوتوں کے لئے اس کا وجود مرکز تعلق اور اسلام و شریعت کی بالادستی سے سرشار طاقتوں کے لئے اس کی ذات سنگ میل رہتی جو علمی و دینی قومی و ملی کاموں کیلئے ایک قطب الرحیٰ بن گئے تھے اور جو پاکستان کے مختلف صوبوں اور علاقوں میں ملکی اتحاد و یکجہتی کی علامت اور یکتا و منفرد قدر مشترک بن چکے تھے اور جس نے اپنے وجود اور دلآویز شخصیت کی شکل میں دین و سیاست کا ایک ایسا حسین امتزاج پیش کیا۔ جس نے عملاً دین و سیاست کی دوئی کو مٹا کر رکھ دیا اور جس نے اپنی متنوع اور جامع شخصیت کی صورت میں یہ ثابت کر دکھایا کہ قدیم علوم و فنون اور اسلامی مدارس کا ایک فارغ التحصیل مولوی عصر حاضر کے نہایت عیارانہ اور شاطرانہ جمہوری ماحول مغرب کی میکیاولی سیاست کی فضا میں کس ہوشمندی تدبر و بصیرت، وقار و متانت اور دیانت و امانت کے اصولوں اور مومنانہ صفات کو سینہ سے لگاتے ہوئے بھی قائدانہ اہلیت و صلاحیت کے ساتھ ماحول پر غالب آسکتے ہیں۔

علماء جنہیں معاشرہ کا عضو معطل ملائے مسجد و مکتب اور "دو رکعت کا امام" سمجھا

اور بنایا گیا تھا۔ اور آج اسے ملکی سیاست اور قومی معاملات کا ایک اہم ترین عنصر سمجھا جارہا ہے اور کوئی چاہے یا نہ چاہے علماء کرام کی اہلیت اور صلاحیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس کا دائرۂ عمل مسجد و خانقاہ سے پھیل کر ایوان حکومت، اسمبلی اور ہر سیاسی قومی پلیٹ فارم تک وسیع ہو گیا ہے۔ تو اس انقلاب احوال میں حضرت مفتی محمود صاحب قدس سرہٗ العزیز کے طویل اور صبر آزما ہمہ پہلو جہاد اور جدوجہد اور روشن و تابناک کردار کا بھی بنیادی دخل ہے۔ اس مخلصانہ اور بے لوث جدوجہد نے مروجہ سیاست کے اطوار و انداز بدل دئے اور ایک نئی نیو رکھ دی۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی ذات میں اللہ تعالیٰ نے ایسی بے بہا اور بے حد و حساب صلاحیتیں جمع فرما دی تھیں۔ جنہوں نے واقعی انہیں اس عہد کی تاریخ ساز شخصیت بنا کر رکھ دیا تھا جنہیں دیکھ کر کسی نے سچ کہا ہے کہ آپ کی وفات حقیقت میں صدی کی موت ہے۔

وسیع النظر عالم فقیہ النفس مفتی، روشن دماغ اور روشن ضمیر رہنما، ہمت، واستقامت کے کوہ گراں، جرأت و شجاعت کے سد آہنی جب کسی موقف پر ڈٹ جاتے تو پرائے تو کیا اپنوں نے بھی اگر ہزار اختلاف رائے ظاہر کیا لیکن آپ کی سختی اور استقامت کو ذرا بھر جنبش نہ ہوتی اور وہ گرد و پیش سے متاثر ہوئے بغیر اپنا سفر جاری رکھتے۔ اس کے ساتھ وسعت ظرف اور وسیع المشربی اور نرمیٔ مزاج معاملہ فہمی اور عاقبت اندیشی ایسی کہ مختلف الخیال اور مختلف، متضاد مکاتب فکر کو ساتھ لے کر چلتے اور منزل مقصود تک پہنچ کر دم لیتے۔ وہ برصغیر کی سب سے بڑی زوردار اور ہمہ گیر تحریک نفاذِ اسلام کے ہیرو اور قافلہ سالار تھے۔ اس وقت کروڑوں انسانوں نے علماء سیاستدانوں نے ان کی قیادت و زعامت پر اعتماد کیا وہ بلندیٔ نگاہ، دلنوازیٔ گفتار اور جان پرسوز کا متاع سفر لیکر میر کارواں کی صفات پر پورے اترے۔

وہ چودھویں صدی کے اس قافلۂ صدق و صفا اور کاروان جہاد عزیمت کے آخری جرنیل تھے جسے شاہ ولی اللہؒ اور سید احمد شہیدؒ نے ترتیب دیا اور جس کو حافظ ضامن شہید، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے مضبوط اور مستحکم کیا۔

اور جس کے سالاروں میں حضرت شیخ الہندؒ اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ شامل تھے اس جماعت حقہ کی شخصیات کو برقرار رکھنے اور اس قافلۂ تسلیم و رضا کے جہاد و عزیمت، علم و عمل، استقامت، و ایثار، اخلاص و قربانی کی امانتیں حضرت مفتی صاحبؒ نے چودھویں صدی کے اختتام پر پندرھویں صدی کی دہلیز تک پہنچا دیں۔ تاکہ نئی صدی میں اپنے قابل فخر اسلاف کے نقش پر چلنے والوں کیلئے یہ چیزیں متاع عمل اور سرمایۂ نجات بنی رہیں۔ انکی ہمہ گیر اور جامع شخصیت نئی صدی میں دعوت عمل کا کام دیتی رہے گی۔

اس ہمہ گیر محبوب و دلآویز شخصیت جس کی صحبتوں اور محبتوں، خلوت اور جلوت اور سفر و حضر کی رفاقتوں اور کفش برداریوں کا اس غمزدہ کو ایک طویل موقع اللہ تعالیٰ نے دیا، اور جو کبھی کبھی شفقت و محبت کی وجہ سے ع کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ۔ کا مصداق بھی بن جاتا تھا، اس کا یکایک دنیا سے اُٹھ جانا، اللہ اکبر — وقعت الواقعۃ — قیامت صغریٰ سے کسی طرح کم نہیں۔ ایسے میں قلم و قرطاس اور ذہن و دماغ ماؤف و مفلوج ہو کر بیان جذبات اور اظہار احساسات سے اعتراف عجز کر دیں تو کیا تعجب ہو۔ آج ڈیڑھ ماہ اس سانحۂ ہائلہ کو گذرا ہے مگر قلم نے اپنے آپ کو اتنا عاجز و درماندہ کبھی نہ سمجھا تھا۔ اور یہی عجز و تعطل پرچہ کی تاخیر کا بھی سبب بن رہا ہے۔ وہ جو محبت اور عظمت کے چراغ گل کر کے رخصت ہوئے تو خدام و عشاق نے بھی کچھ عرصہ کیلئے محفل زیست کی شمعیں بجھا دیں تو انہیں سزاوار ملامت نہ سمجھا جائے[1]۔

من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضی نحبہٗ ومنھم من ینتظر

الحق

اکتوبر، نومبر ۱۹۸۰ء

---

[1] تفصیلی حالات کے لیے "ترجمان اسلام" اور "قومی ڈائجسٹ" کا مفتی محمود نمبر ملاحظہ ہو۔ (مرتب)

آہ ! شیرِ اسلام

مولانا غلام غوث ہزارویؒ

یا اسفا ! قلم کا جگر کیوں شق نہ ہو، اور دل و دماغ کیوں جواب نہ دے بیٹھیں جبکہ کسی ایک متاعِ عزیز کے کھو جانے کے ماتم و شیون سے فارغ ہوئے بغیر لگاتار اپنی ساری متاعِ دین و دنیا سے ایک ایک کر کے محروم ہونا پڑ جائے۔ ایسا لگتا ہے کہ علم و فضل زہد و تقویٰ، جہاد و ریاضت کے سارے تارے ٹوٹ ٹوٹ کر ہم غمگساروں کو شبِ دیجور کے حوالے کر رہے ہیں، ایمان و یقین اور اخلاق و شرافت کے چمکتے ہوئے ہیروں کی جو مالا اکابر علماء حق کی شکل میں ملّتِ مسلمہ کے سنگار کا باعث بنی رہی وہ جب ٹوٹی تو ایسی ٹوٹی کہ لڑی کا آخری موتی بھی گر کر پیوندِ خاک ہُوا چاہتا ہے۔ چودھویں اور پندرھویں صدی ہجری کا سنگھم تو درحقیقت صدی کا عام الحزن ثابت ہونے لگا کہ جو ستارہ غروب ہُوا کسی نعم البدل کی شکل میں دوبارہ ابھر ہی نہ سکا، اور اب تو ہر طرف اندھیرہی اندھیرہے۔ وہ وہ دیکھو قافلۂ حق و صداقت کے آخری سپاہی بھی کتنی تیزی سے ایک ایک کر کے دارِ فانی کی سرحد کو عبور کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ؎

دیکھو جسے ہے راہِ فنا کیطرف رواں
تیرے محل سرا کا یہی راستہ ہے کیا

ابھی ہم محمود الملت والدین مولانا مفتی محمودؒ کے غم سے فارغ نہ ہوئے تھے، کہ یکایک ملّت کے غمخوار، عمر بھر حق و صداقت کے لئے باطل سے برسرِ پیکار اور چراغِ مصطفوی کی حفاظت کے لئے شرار بولہبی سے ستیزہ کار مردِ مجاہد، بطلِ جلیل حضرت مخدومنا مولانا

غلام غوث ہزاروی نے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔ فرحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃً۔

مولانا مرحوم ۱۸۹۶ء میں بمقام بفہ ضلع ہزارہ جناب حکیم سید گل صاحبؒ کے گھر پیدا ہوئے۔ مڈل پاس کیا اور ابتدائی دینی تعلیم بھی علاقہ میں حاصل کرتے رہے۔ استعداد بڑھ گئی تو ۱۹۱۵ء میں مرکز علم و ہدایت دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ اس چشمۂ فیض سے فیضیاب ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۹ء میں علامہ انورشاہ کشمیریؒ، مولانا رسول خان ہزارویؒ، مولانا اصغر حسینؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، علامہ ابراہیم بلیاویؒ جیسے اساطین علم و فضل سے سند حدیث حاصل کی۔ نہایت ذکی اور قوی الاستعداد تھے۔ پورے دورۂ حدیث میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ علامہ قاری محمد طیب قاسمی جیسے مشاہیر معاصرین درس نے ان کے دور طالب العلمی کی صلاحیت اور قابلیت کا اعتراف کیا فراغت کے بعد کچھ عرصہ اپنے مادر علمی دارالعلوم دیوبند ہی میں معاون استاذ کے طور پر مامور رہے۔ پھر اساتذہ کی خواہش پر جمعیۃ العلماء ہند کی تنظیم کے سلسلہ میں ہندوستان کا دورہ کیا، دو سال تک ایک ہندو ریاست "سمستان گدوال" میں تبلیغ اسلام میں مصروف رہے اور مسلمانوں میں غیر اسلامی رسم و رواج کے خلاف بھی نبرد آزما رہے۔ دبستان شیخ الہندؒ سے وابستگی اور قریبی تعلق کی وجہ سے مغربی سامراج بالخصوص برطانیہ سے نفرت و عداوت گویا گھٹی میں پڑ گئی تھی۔

عہد طالب العلمی میں بھی تقریر و خطابت مناظرہ اور تنظیم و جماعت جیسے امور و صفات سے شغف اور تعلق تھا۔ تحریک آزادی اور جہاد حریت کا دور دورہ تھا۔ آپ نے بھی پورے جوش و خروش سے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا جس کی پاداش میں ۱۹۳۲ء کا پورا سال بنوں اور ایبٹ آباد کی جیلوں میں کاٹنا پڑا، جہاد اور جد و جہد کا یہ دائرہ صرف مغربی سامراجیت تک محدود نہیں تھا۔ بلکہ برطانوی سامراج کے شجرۂ خبیثہ کی بیخ کنی کے ساتھ ساتھ اس کے منحوس برگ و بار اور شاخوں پر بھی کڑی نگاہ تھی۔ برطانیہ کے خود کاشتہ پودے "قادیانیت" پر بھی انہی ایام میں کاری ضرب لگانا شروع کر دیا اور پیہم مقابلے کرتے رہے۔ ۱۹۳۴ء میں پشاور کی مشہور شریعت کانفرنس منعقد ہوئی تو نہ صرف

اس میں شریک ہوئے بلکہ انتظام و انصرام میں بھی بنیادی حصہ لیا۔ مجلس احرار کی تشکیل ہوئی تو اس کے ہراول دستہ اور رکنِ تاسیسی ثابت ہوئے، اسی اثنار میں "خاکسار تحریک" کا غلغلہ اٹھا جو اپنی فکری و عملی جدت، آزینیوں اور اس کے قائد کی فکری زیغ اور کج روی اور سب سے بڑھ کر علمار و سلف سے بیزاری دینی و اسلامی جماعتوں اور محترم اشخاص کی تحقیر و تضحیک کی وجہ سے ملت کے لئے ایک فتنہ ثابت ہو رہا تھا۔ علمارِ حق نے بروقت اور بجا طور پر اس فتنہ کی خبر لی اور اسے روکا۔

مولانا ہزاروی مرحوم دیگر محاذوں کے ساتھ ساتھ اس محاذ پر بھی ڈٹ گئے اور بے جگری سے لڑے، قصبہ قصبہ اور شہر شہر جاکر اس فتنہ کا تعاقب کیا۔ اکوڑہ خٹک سے غالباً سب سے پہلا واسطہ مولانا کا اسی سلسلہ میں پڑا "فتنۂ مشرقی" کی جڑیں یہاں بھی پھیلنے لگیں۔ سرحد کے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ اور دین سے باخبر دو ایک، علمار بھی اس کی لپیٹ میں آگئے۔ فیصلہ مناظرہ پر چھوڑ دیا گیا۔ "خاکسار" کی طرف سے ایک جیّد عالم مولانا مروت صاحب نامزد ہوئے اور دوسری طرف سے ہمارے مولانا ہزارویؒ مرحوم "ثالث اور حکم" کے لئے مسلمانوں نے حضرت والد ماجد مدظلہٗ پر اتفاق کیا جو کچھ عرصہ قبل دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوکر تشریف لائے تھے اور گھر کی مسجد میں مصروف درس و تدریس تھے۔ مناظرہ ہُوا اور خوب زور دار کہ جس کا چرچا عرصہ تک گرد و نواح میں ہوتا رہا اور ہم نے بزرگوں سے بارہا اس کا ذکر سنا۔ مولانا ہزارویؒ نے حق و صداقت پر مبنی موقف کی زور دار وکالت کی۔ ثالث اور جج یعنی حضرت والد ماجد مدظلہٗ نے فیصلہ مولانا کے حق میں دیا۔ الحمد للہ کہ اس مناظرہ کی تفصیلی روئداد ایک موقع پر حضرت مولانا مرحوم نے راقم الحروف، کو قلمبند کرائی جو محفوظ ہے۔ اور کسی اور موقع پر شائع کی جائے گی۔

احرار نے جہادِ آزادی کے سلسلہ میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کی تو نتیجۃً مولانا کو ۱۹۴۲ء کا سال ڈیرہ اسماعیل خان جیل میں گذارنا پڑا۔ احراری سرگرمیوں کے ساتھ جمعیۃ العلماء ہند کی رکنیت بھی قائم رکھی اور اس کے کاموں میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۹۵۳ء میں تحریک ختم نبوت چلی تو اس میں نمایاں کردار ادا کیا۔ علمارِ حق کا شیرازہ مجتمع کرنے کی

فکر دامنگیر ہوئی تو ۱۹۵۶ء میں حضرت شیخنا واستاذنا مولانا احمد علی لاہوریؒ کی سرپرستی و قیادت میں جمعیۃ العلماء اسلام کو وسیع پیمانے پر از سر نو منظم کیا۔ مولانا مرحوم پہلے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے، اور حضرت لاہوری قدس سرہٗ جمعیۃ کے پہلے امیر۔ اور پھر جب علماء کے بچھڑے ہوئے قافلہ کی ترتیب اور نئی شیرازہ بندی میں منہمک ہو گئے تو اخلاص جوش عمل اور سوز دروں کا زاد راہ لیکر اس کام میں وہ وہ صعوبتیں اور مشقتیں اٹھائیں کہ الامان الحفیظ۔ بڑوں کے ناز اور ہمعصروں کے نخرے اٹھائے، چھوٹوں کی منتیں کیں۔ بزرگوں کے بستر اور جوتے اٹھا اٹھا کر اور خوشامد کر کر کے انہیں مدرسہ وخانقاہ کے گوشہ ہائے عافیت سے نظم وجماعت اور جہاد وسیاست کی رزم گاہ میں کھینچنا چاہا، اسی اثنا روکھی سوکھی پر گذارا کرتے رہے، جو قوت لایموت ملی بھی اسے اس دور میں جمعیۃ کے آرگن "ترجمان اسلام" کے زندہ رکھنے میں خرچ کیا، یہاں تک کہ موٹا جوٹا کھدر قسم کا جو ایک جوڑا تھا، جمعیۃ کے دفتر دہلی دروازہ میں قیام کے دوران اسکی دھلائی بھی قیمتاً نہ کر سکتے تو خود لنگی باندھ کر اسے دھو لیتے کہ بچے ہوئے پیسے اخبار کے اخراجات میں لگ جائیں گے۔

یہ سارا عرصہ دین کی اشاعت باطل کے تعاقب اور جماعتی تنظیموں کے سلسلہ میں "ہر صبح سفر ہر شام سفر" کا مصداق رہا۔ مگر سفر بھی کیسا کہ بغل میں چھوٹا سا بستہ ایک جوڑا کپڑے اور حوالہ کے لئے فرق باطلہ کی دو چار کتابیں، روکھی سوکھی خشک روٹی۔ تھرڈ کلاس میں سوار ہوئے جگہ نہ ملی تو چپکے سے کسی کونہ میں چادر بچھا کر بیٹھ گئے، رات بھر پاؤں پھیلانے کی کوئی جگہ نہ ملی تو بیٹھنے کی نشستوں میں کسی سیٹ کے نیچے چادر بچھا دی اور لیٹ گئے۔ منزل مقصود پر پہنچے، خرمن باطل پر یلغار کر دی۔ اگر کسی جگہ داخلہ پر پابندی ہے تو جل دیگر بہ جادہ جا۔ اور اب کسی اور محاذ پہ شبخون مارنے کے درپے ہیں۔ نہ صلہ کے طالب، نہ ستائش کی تمنا اور نہ میزبان کی میزبانیوں سے لطف اندوز ہونے کی فرصت وخواہش۔ ۱۹۵۸ء میں جمعیۃ پہ پابندی لگی تو نظام العلماء کے نام سے جمعیۃ اور اخبار کا کام نہایت کٹھن حالات میں جاری رکھا۔ ۱۹۶۲ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کے لئے ہزارہ کے ایک حلقہ سے انتخابات جیت کر منتخب ہوئے۔ یہ علاقے عموماً دشوار گذار پہاڑوں اور

دروں سے اٹے ہوئے تھے، مواصلات منقطع، اور وسائل الیکشن بھی قطعی ناپید، اور سب سے بڑی مشکل یہ کہ ان علاقوں پر ایک طویل اور قدیم عرصہ سے جاگیرداروں اور خوانین کی ایسی مضبوط گرفت تھی کہ بظاہر یہ قبائلی اور نیم آزاد علاقے شخصی راجواڑے اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ مولوی اور عالم تو اس نظام میں عموماً تیسرے درجہ کا شہری بنا دیا جاتا ہے۔ جس کا کام صرف نماز پڑھانا اور تجہیز و تکفین اور تدفین کے کاموں میں مدد کرنا ہوتا ہے۔ اور بس ان خوانین اور زمینداروں کے خلاف نبرد آزما ہوتا اور ان کے غرور و نخوت کو للکارنا مرحوم جیسے دل گردے والے شخص کا کام تھا جو واقعی شیرِ سرحد کہلانے کا مستحق تھا۔ عالمی استبداد کے مقابلہ کے ساتھ ساتھ مولانا ایک طویل عرصہ سے اس علاقائی استبداد اور "خان ازم" سے بھی مصروف جنگ رہے۔ الیکشن میں اس بے سروسامان مردِ فقیر نے یہ جنگ بالآخر جیت لی اور اس علاقہ کے علماء اور دینی پسماندہ طبقے بھی معاشرہ میں اس مجد و شرف سے دوبارہ ہمکنار ہو گئے جن کے وہ حقیقی مستحق تھے۔ یہ مولانا کی زندگی کا ایک اہم باب ہے۔ جو نظروں سے عموماً اوجھل رہا ہے۔

اسمبلی میں پہنچ کر ملک کا وہ سرکردہ طبقہ اب براہِ راست آپ کی زد میں آنے لگا جو اب تک سٹیج اور منبر و محراب سے آپ کا نشانہ بنتا تھا اور جسکی اکثریت کو قرآن کریم نے "اکابر مجرمیھا" سے تعبیر کیا ہے۔ مترفین اور صنادید کا یہ طبقہ مولانا کی تیز و تلخ نشتروں سے تلملا اٹھا۔ اس اثناء میں عائلی قوانین جسے اسوقت کی حکومت نے اپنے وقار کا مسئلہ بنا دیا تھا، کے خلاف آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ جن میں کتاب اللہ، سنتِ رسول اور تعامل صحابہؓ کی صریحاً خلاف ورزی کی گئی تھی۔ تجدّد اور ترقی پسندی کا مقامِ تجدید و امامت حاصل کرنے کے شوق میں اس وقت کے صدر نے انہیں نافذ کر دیا جس کے محرکات میں اس صدر مرحوم کے گھریلو اور خانگی کچھ عوامل بھی کارفرما رہے، جس نے بچپن سے موصوف کو "تعدد ازدواج" سے برگشتہ کر دیا تھا۔ اسمبلی میں اس کے خلاف قرارداد پیش ہوئی۔ فضا ناسازگار بلکہ مخالف تھی مگر مولانا نے برجستہ

ایسی عالمانہ اور پُر مغز اور مؤثر تقریر فرمائی کہ ایوان کی اکثریت نے اس قرار داد کی تائید کی اور وہ پاس ہوگئی۔ اس سے مغرب زدہ طبقہ عموماً اور آزادیٔ نسواں کی شوقین خواتین میں خصوصاً اضطراب کی لہر دوڑ گئی، مولانا کا جی بھر کر مذاق اڑایا گیا۔ مگر اظہارِ حق اور غلبۂ حق کی یہ سعادت مولانا کو حاصل ہوگئی۔ بعد میں جب وہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تب بھی ان قوانین کے خلاف مؤثر ترجمانی کی۔ اور اسمبلی میں موجود تجدّد پسند خواتین ان کے چبھتے ہوئے ظریفانہ نشتروں سے سٹپٹا کر رہ جاتیں نشتر زنی اور حاضر جوابی سے مقابل کے وار کو اسی کی طرف پلٹا دینا مولانا کی پوری اجتماعی اور پارلیمانی زندگی کا ایک دلچسپ باب ہے۔

بالآخر رفتہ رفتہ مولانا کا شہرہ ملک سے باہر بھی پہنچا ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۵ء میں انہوں نے دو دفعہ مصر کے مجمع البحوث الاسلامیہ میں شرکت کی اور عالمی علماء و ارباب دانش سے خطاب کیا۔ پہلی بار ۱۹۶۴ء میں قاہرہ سے واپسی پر مدینہ منوّرہ تشریف لائے۔ خوش قسمتی سے احقر بھی وہاں موجود تھا۔ حضرت بنوریؒ، حضرت مفتی محمودؒ، حضرت مولانا ہزاروی مرحوم یہ تینوں اکابر اکٹھے تھے۔ پھر عرفات میں بھی ان اکابر کی ایک گونہ ہمرکابی کا شرف ملا۔ مولانا مرحوم کا حرمین بالخصوص مدینہ طیّبہ میں سوز و گداز، استغراق و انہماک قابل دید تھا۔ پھر تو بارہا سعادت حج و زیارت سے مشرف ہوتے رہے۔

مولانا مرحوم کی عالمی سیاست بالخصوص مشرقِ وسطیٰ کی سیاست پر گہری نظر تھی، وہ برطانوی سامراج سے برسرِ پیکار رہے، اور یہ نفرت و عداوت ان کے دل و دماغ پر آخر تک حاوی رہی۔ ان دنوں مشرقِ وسطیٰ میں صدر ناصر مرحوم اور ان کے نظریۂ قومیّت کا طوطی بول رہا تھا۔ مصر کے "عدوانِ ثلاثی" میں فتح کے بعد صدر ناصر لوگوں کے محبوب اور نورِ نظر بن گئے تھے۔ ہمارے مولانا ہزاروی اور ان کے ہم خیال اکابر علماء پر صدر ناصر کی عقیدت و محبت پوری طرح غالب ہوگئی تھی، اور یہ محبت کبھی کبھی ایسے غلو کی صورت اختیار کر جاتی جس طرح تحریکِ خلافت کے دوران ہمارے بہت سے مخلص ترین بزرگ ترکی کے مصطفیٰ کمال کی محبت میں گرفتار ہوگئے تھے۔

گو ان ہر دو باتوں کا محرک وہی انگریز دشمنی تھی۔ اور لِلّٰہی بغض کا مصداق تھی

مگر غلو محبت میں ہمیشہ کسی آئیڈیل اور محبوب شخصیت کے اکثر خدوخال اوجھل ہوجاتے ہیں صرف محاسن ہی محاسن پر نظر رہتی ہے اور رشتۂ اعتدال ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ خود راقم بھی ایک عرصہ تک صدر ناصر کے ساتھ اس غالی عقیدت کا شکار رہا مگر پھر رفتہ رفتہ اس میں کمی آگئی، مگر اتنی نہیں جو صدر ناصر کے مخالف کیمپ میں تھی۔ اُدھر نفرت و عداوت کے معاملہ میں صرف معائب پر نظر تھی، اور دوسری جانب صرف محاسن پر۔ اس بے اعتدالی نے دونوں طرف ایک عرصہ تک سرد اور گرم جنگ کی فضا پیدا کی، حقیقت جو بھی ہو مگر یہ ایک افسوسناک المیہ ہے کہ بالآخر صدر ناصر کے جانشین اور معتمد دست راست نے کیمپ ڈیوڈ کی شکل میں پوری عرب دنیا کی دشمنی مول لے کر بھی اسرائیل اور مغربی سامراجیت کی دوستی میں مصلحت سمجھی صدر ناصر تو صدر ناصر تھے یہ معاملہ مولانا مرحوم کا کسی افریقی ملک کے کسی غیر مسلم اس لیڈر کے ساتھ بھی تھا جو مغربی سامراج سے نبرد آزما تھا۔ تقاریر میں دائیں بازو ان بزرگوں کا نشانہ عتاب بنا رہتا۔

صدر ناصر قسم کے سیاسی زعماء سے اتنی غالی عقیدت جو مولانا مرحوم کے سیاسی رجحانات پر مبنی ہوتی تھی کا نتیجہ تھا کہ وہ صدر ناصر کے بارہ میں معمولی سی تنقید بھی برداشت نہ کر سکتے جس وقت اخوان المسلمین کے کئی زعماء و ارکان صدر ناصر کا نشانہ بنے جن میں کئی ایک نامور مصنف ادیب اور عالم بھی تھے۔ اور مصر کے مشہور مصنف سید قطب بھی۔ تو احقر نے نہایت اعتدال سے اور نرم الفاظ میں صدر ناصر پر الحق میں تنقید کی اور یہ کہ صدر ناصر مرحوم کو مغرب کے ساتھ ساتھ اپنے ملک میں مغربیت کی بے لگام فروغ پر بھی نظر رکھنی چاہیئے۔ بس یہ لکھنا تھا کہ مولانا کو جلال آگیا، بے تحاشہ برس پڑے تلخی اور غصہ پر مبنی لمبے لمبے خطوط سے نوازا، جواباً میں نے ایک مفصل عریضہ لکھا جس کے جواب میں ایک اور طویل مکتوب آیا۔ مگر اب اس میں شدت اور تلخی کی بجائے شفقت، دلیل اور متانت کا عنصر نمایاں تھا۔ سید قطب کی کتابیں کھنگال کر انہوں نے سید قطب مرحوم کی شان صحابہؓ بالخصوص امام مظلوم حضرت عثمان شہیدؓ پر گستاخانہ ریمارکس پر مبنی عبارتیں حوالوں کے ساتھ نقل کر کے بھیج دیں جسے پڑھتے ہی مجھے مولانا مرحوم کے سامنے سپر انداز ہونا پڑا۔

مولانا کے اس تحمس اور حمیت دین پر مبنی جذبات کی شدت کی وجہ بھی سامنے آئی جسے مولانا کا اسلاف کرام بالخصوص صحابہ کرام سے شدت تعلق اور والہانہ ارتباط کا طبعی نتیجہ سمجھنا چاہیئے جو ہر مومن کا لازمۂ ایمان ہے ۔ الحب فی اللہ والبغض للہ ۔ اور اشداء علی الکفار رحماء بینھم ۔ کے مظاہر صرف کافروں کے سامنے نہیں اہل زیغ والحاد اور منحرفین و غالین کے ساتھ بھی سامنے آنے چاہئیں مگر اس کے لئے بھی حکمت و موعظۂ حسنہ اور شفقت و نرمی ، دلیل اور وقار کے ساتھ تعاقب ، باطل اکابر کا شیوہ رہا ہے ۔ مگر مولانا مرحوم جس سے بھی الجھ جاتے اور جس مسئلہ میں اختلاف کر بیٹھتے پھر اس کے بارہ میں کسی رو رعایت حکمت عملی ، مصلحت آمیز انداز بیان کے روادار نہ ہوتے اس معاملہ میں ان کا لب ولہجہ نہایت سخت اور درشت ہو جاتا ان کے خلاف لکھتے یا تقریر کرتے ہوئے عالمانہ توازن و اعتدال کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا اور عدم توازن کا شکار ہو جاتے ۔

مولانا کے اس انداز نے بہت سے مخلص احباب و معاصر علماء کو ان سے دور رکھا اور جدید طبقہ کے پڑھے لکھے طبقہ کی ایک بڑی تعداد بھی ان کے قرب سے گریز کرتی رہی ۔ اس بارہ میں احقر نے بھی متعدد بار جرأت رندانہ سے کام لیکر مولانا سے گفتگو کی پھر ایک بار تو کھل کر انہوں نے اپنے اس انداز اور دشمن پر ان کے اس طریق واردات پر روشنی ڈالتے ہوئے مجھے فرمایا : " کہ دیکھئے جب دشمن پر حملہ بولا جاتا ہے ۔ تو ایک جماعت اصل لڑنے والی فوج سے پہلے چیختی چلاتی اور چنگاڑتی ہوئی اور ہلچل افراتفری مچاتی ہوئی غنیم پر یلغار کرتی ہے جس کا مقصد مخالف کے دل و دماغ کو پراگندہ اور سراسیمہ کرنا ہوتا ہے ۔ کہ اصل فوج کی ہیبت اور دھاک بیٹھ جائے تو میری مثال اس مقدمۃ الجیش کی ہے میں اس طریق کار سے دشمن کو پریشان کرتا ہوں بعد میں دلائل سے بات کرنا حکمت اور مصلحت سے مقابلہ کرنا یہ آپ لوگوں کا کام ہے ۔ میں آپ لوگوں کو کب روکتا ہوں ۔ آپ اپنے طور طریقوں سے کام کرتے جائیں ۔ میں ساٹھ ستر سال سے جس سانچہ میں ڈھل چکا ہوں اب اس میں تبدیلی نہیں کر سکتا ۔ "

اس میں شک نہیں کہ ایسے کئی محاذوں پر سب سے پہلے مولانا مرحوم نے کلمۂ حق

کا پرچم لہرایا جن تک رسائی بڑی جرأت رندانہ کہلائی جاتی ہے۔ اور زمانہ کی عام روادار فضا میں ایسا کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ پھر تو رفتہ رفتہ اور لوگ بھی مولانا کے ہمنوا ہو جاتے اور اکثر و بیشتر ان کی دینی بصیرت اور دور اندیشی کا قائل ہونا پڑ جاتا۔

مولانا کی زندگی کا تقریباً آخری عشرہ ان کی زندگی کا ناخوشگوار دور کہلا سکتا ہے۔ جس میں انہیں اپنے قریب ترین مخلص رفقاء اور ساتھیوں سے بھی الگ تھلگ ہونا پڑ گیا، عزلت و اعتزال کے صدمے بھی سہنے پڑے اور مخالفین کی بے جا سب و شتم اور طعن و تشنیع کا نشانہ بھی بنے۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد سرحد میں نیپ اور جمعیۃ کی مشترکہ حکومت کی تشکیل سے اس نامسعود دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جبکہ دیگر بہت اہل رائے اور اصحاب بصیرت کے علی الرغم اولاً مولانا مرحوم خود اس اتحاد کے داعی اور ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے شدید ترین مخالف جماعت نیپ سے رواداری اور عفو و درگزر کے قائل تھے۔ اس معاملہ میں مجھ جیسے اصاغر کی مخالفانہ رائے سامنے آئی تو ایک بار پھر مجھے نشانہ بننا پڑا۔ بہر حال اتحاد ہو گیا، حکومت قائم ہو گئی، اُدھر ملک میں ایک ایسے آمر کا دور دورہ تھا، جو بڑی عیاری سے اسلام، غریب اور مزدور کا نام استعمال کرتا تھا۔ یہ غریب اور مزدور قسم کے نعرے بھی مولانا کا زندگی بھر کمزوری رہے۔ وہ عمر بھر جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ ذہنیت سے متنفر تھے۔ خود شان بوزری لئے ہوئے تھے اور ذہن فکر کے ساتھ اپنے قلندرانہ انداز میں بھی مولانا حسرت موہانیؒ مولانا عبیداللہ سندھیؒ جیسے حضرات کا نمونہ تھے۔ اس وقت کے حکمران کو مولانا کی اس طبیعت کا اندازہ تھا، اس نے بڑے شاطرانہ انداز میں اسلام کے ایک مخلص سپاہی کا لبادہ اوڑھ کر عجز و انکساری کا پیکر بن کر مولاناؒ کے سامنے اپنے آپ کو پیش کیا ان کے شاطر حواریین اور مقربین نے بھی مولانا کو نرغے میں سے لیا نفاذ اسلام اور غریبوں کے انقلابی منصوبے اور عزائم ان کے سامنے رکھتے رہے۔ اپنوں کے بارہ میں بھی مولانا نے کچھ بے اعتنائی کچھ بے نیازی اور قدر مراتب کو ملحوظ نہ رکھنے کا رویہ محسوس کیا جس نے بُعد و گریز کی یہ خلیج اور بڑھا دی۔ اور رفتہ رفتہ وہ اقتدار کے اس کیمپ میں

سے چلے گئے جن سے ان کی جمعیۃ برسرِ پیکار تھی۔ اس بارہ میں بھی مولانا کی ایک رائے تھی کہ عوام بالخصوص نوجوان نسل اور مزدور اور پسماندہ طبقہ نے انتخابات میں جس بھاری اکثریت سے بھٹو مرحوم کا ساتھ دیا تھا وہ تعلق و اعتماد مولانا کے خیال میں اب بھی قائم تھا۔ (جو درحقیقت مولانا کی خوش فہمی تھی) اور ملک کی اتنی بڑی طاقت خاص طور سے نئی نسل کے نوجوانوں کے ساتھ محاذ آرائی میں اسلام اور علماء کرام کے لئے مصلحت یہی نہیں اپنے سے متنفر کرنے کی بجائے ان سے مل کر اس قوت و طاقت کو دین کے لئے استعمال کیا جائے۔ یہ مولانا کی ایک اجتہادی رائے تھی[1] حالات نے ثابت کر دیا کہ وہ سراب کو پانی سمجھ بیٹھے تھے۔ یہ مولانا کی اجتہادی غلطی تھی مگر نیت میں اگر خلوص ہو اور ہوی و ہوس اور ذاتی نفع و نقصان کے شائبہ سے اگر عمل خالی ہو تو اللہ کریم ایسی غلطیوں پر بھی اجرِ حسن عطا فرما دیتے ہیں۔ اس سارے مرحلہ میں جبکہ انہیں جان سے زیادہ اپنی عزیز جماعت سے ہاتھ دھونا پڑا، اس گلشن سے جسے انہوں نے بویا تھا۔ اور پھر خون پسینے سے سینچا تھا، اور جو انہی کے نام پر ہزاروی گروپ کہلایا۔

کسی بدترین مخالف کو بھی یہ ثابت کرنے کی ہمت نہ ہوئی کہ مولانا نے اپنی ذات کے لئے کچھ نفع اٹھایا، بنگلے پرمٹ اور پلاٹ حاصل کئے۔ نہ تو وہ بکے نہ جھکے، ایک رائے قائم ہوئی، غلط یا صحیح اور اس پر ایسے ڈٹ گئے کہ ساری دنیا ایک طرف اور ان کی بے لچک طبیعت ایک طرف، نہ اپنوں کی خفگی کی پرواہ، نہ کسی کو خوش کرنے کی خواہش، مخالفین نے جو الزامات لگائے وہ بھی محض سیاسی مخالفت میں جنہیں ان کا بے ضمیر ضمیر خود بھی جھٹلاتا تھا۔ مگر جس جماعت سے الگ ہوئے تھے۔ اس کے اکابر الزامات تو کیا لگاتے ایسے ہر قسم کے طمع و لالچ ترغیب و تحریص پر مبنی الزامات کی برسرِعام نفی کرتے اور مولانا مرحوم

---

[1] بھٹو کی ہلاکت کے بعد صدر ضیاء کی حکومت کی مخالفت میں بہت سے ان علماء نے بھٹو پارٹی سے تعاون کے لئے تقریباً یہی موقف اختیار کیا جسکی بناء پر مولانا ہزارویؒ ان کے ہاں گردن زدنی بن گئے تھے۔ (س)

کی صفائی کرتے، حضرت مفتی محمود صاحبؒ نے احقر کو زندگی کے آخری ملاقات میں جو ۳ ستمبر ۱۹۸۰ء کو کراچی میں ہوئی کسی بات کے دوران کہا کہ میرا ایمان ہے کہ مولانا ہزارویؒ بکے نہیں، نہ کچھ فائدہ اٹھایا مگر اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے اور دشمن کی عیاری اور شاطرانہ داؤ پیچ میں آکر کٹ گئے۔ یہ مولانا کی مخلصانہ زندگی پر ایک واضح شہادت ہے۔ جو ان کے عمر بھر کے ساتھی مگر آخری دور کے حریف نے منفرد بار دی۔

بہر حال حکومت کے ساتھ مصالحت آمیز رویّہ کے بعد ایوان میں اسلامی مسائل کے بارہ میں مولانا کے انداز بیان میں وہ گھن گرج، شدّت، اور تلخی تو باقی نہ رہ سکی مگر کوئی بھی موقعہ اظہار حق اور دینی موقف پیش کرنے کا آیا تو مولانا نے ایوان کے ساتھی علماء سے الگ تھلگ رہ کر بھی پورے خلوص وللّٰہیت سے فریضۂ اظہار حق میں کوتاہی نہ کی وہ حکومت کے ہمنوا تھے مگر آئین سازی کے موقع پر نہایت اہم اسلامی اور جمہوری ترامیم پیش کرتے رہے جو ریکارڈ پر موجود ہیں قادیانی مسئلہ اسمبلی کے سامنے آیا تو پورے حزب اختلاف نے متفقہ طور پر "ملّتِ اسلامیہ کے موقف" کے نام سے بیان مرتب کیا جسے حضرت مولانا مفتی محمود صاحب قدس سرہٗ نے کئی نشستوں میں پڑھ کر سنایا۔ جس کا آدھا حصّہ ہمارے فاضل دوست، مولانا محمد تقی عثمانی نے قلمبند کیا اور آدھے حصّے کی سعادت اللہ تعالےٰ نے اس ناچیز کو دی۔

حضرت، مولانا ہزاروی مرحوم ظاہر ہے کہ حزب اختلاف کیطرف سے پیش کئے جانے والے اس بیان پر دستخط نہیں کر سکتے تھے کہ ان کا مزاج ہی بے لچک تھا۔ مگر انہوں نے سکوت ولاتعلقی بھی اختیار نہیں کی بلکہ محضر نامہ کے نام سے دوسو ساٹھ صفحات پر مشتمل ایک طویل مدلل اور محققانہ مقالہ قلمبند کرا کر شائع کیا اور پھر اسے ارکان اسمبلی میں تقسیم کیا یہ کام آٹھ دس دن ہی میں کرنے کا تھا۔ ہمارے ساتھ تو پوری ٹیم اور جماعت تھی جس نے کتابت وطباعت کا یہ معرکہ سر کیا مگر مولانا مرحوم نے بالکل اکیلے یہ ہفت خوان سر کیا، کتنے مصائب جھیلے ہوں گے۔ پروف بھی خود دیکھا پریس کے چکر بھی اس زار ونحیف بوڑھے سپاہی نے اکیلے کاٹے۔

مولانا کی ایک بڑی نایاب و نادر خوبی سیاست کے ہنگاموں، اسٹیج کے شور و شر، بحث و مناظرہ کی گرماگرمی کے ساتھ ساتھ زہد و ریاضت اور اوراد و ظائف، شب بیداری اور اپنے رب سے سوز و گداز کے روابط کا برقرار رکھنا تھا جو اس دور میں عنقا سے کم نہیں۔ وہ بلاشبہ باللیل رھبانٌ وبالنھار فرسان۔ (رات کو راہب دن کو شہ سوار) کا نمونہ تھے۔ جامِ شریعت کیساتھ سندانِ عشق نباہنا تو سنتے ہیں۔ مگر خارزار سیاست میں شریعت و طریقت کے ساتھ ساتھ سوز و ساز رومی اور پیچ و تاب رازی کی قبائے افتخار کو بھی تار تار ہونے سے بچا کر چلنا اس ضیغم اسلام ہی کا کام تھا۔

کون کون سی ادا اور کون کون سی خوبی ہے جس سے ہمارے ان بزرگوں کا گلشنِ حیات مالا مال نہیں۔ وہ جب گزر جاتے ہیں تو ہمیں قدر آتی ہے۔ پھر ایک ایک بات کو لوگ لیئے روتے ہیں کہ زمانہ نہایت بانجھ ہوتا جا رہا ہے مہیب خلاؤں کا سماں ہے ــــ مولانا مرحوم کا ذکر چلا تو عنانِ قلم روکنے سے بھی نہ رک سکا۔

مولاناؒ کے جنازہ پر جاکر زیارت اور کاندھا دینے کی سعادت نصیب ہوئی، فقر و قناعت، زہد و تقویٰ، جہاد و سیاست، حمیت و شجاعت کا یہ گنج گرانمایہ سپردِ خاک کر دینے کے بعد جب ہم لوگ دیارِ ولیؒ کی تنگ گلیوں سے گذرتے ہوئے واپس ہو رہے تھے تو ایک ثقہ متدین قسم کے بزرگ نے مجھے ایک واقعہ سنایا اور اسی واقعہ پر ان سطور کو ختم کرتا ہوں :

"مولانا مرحوم کے جوش و جوانی کا دور تھا، اب جبکہ وہ نرینہ اولاد سے محروم دنیا سے کوچ کر گئے مگر مولانا کی نرینہ اولاد پیدا ہوئی، ایسے ایک موقع پر مولانا کا صاحبزادہ اکلوتا بیٹا جو بڑھاپے کا سہارا بن سکتا تھا۔ شدید بیمار ہوا۔ بیماری سکراتِ موت کی حدود میں داخل ہوئی کہ اچانک بالاکوٹ سے اطلاع آئی کہ وہاں قادیانیوں نے پَر پرزے نکال لیئے ہیں۔ اور فوراً پہنچنے کی ضرورت ہے۔ مولانا نے جاں بلب لختِ جگر کو اسی حالت میں چھوڑ دیا۔ تقریر و مناظرہ کی کتابیں بغل میں اٹھائیں اور چل پڑے۔ لوگوں نے

بے حد روکا کہ بچے کی حالت مخدوش ہے ۔ فرمایا تم لوگ موجود ہو اور وہاں ناموس ختمِ نبوّت کے تحفظ کی بات ہے ۔ روانہ ہوئے ۔ ابھی لبفہ کی ذیلی سڑک سے بالاکوٹ جانے والی سڑک پر پہنچے تھے کہ کسی نے نورِ نظر بیٹے کی وفات کی اطلاع دی ، فرمایا تم لوگ دفن کر دینا ، اللہ نے اپنی امانت واپس لے لی ۔ مجھے بالاکوٹ پہنچ کر قادیانیوں کا تعاقب کرنا ہے اللہ اور رسول کی بات ہر چیز پر مقدم ہے ۔"

مولاناؒ نے بیٹے کے آخری دیدار اور پدری شفقت و محبت کو بھی ناموسِ دین پر قربان کر دیا ۔ اور اپنے روحانی مقتداء سیدنا ابراہیمؑ کی سنت کی پیروی کی ایک اور تابندہ مثال قائم کر دی ۔ مجھے خیال آیا کہ کیا عجب آج کی شام بھی ملاءِ اعلیٰ ایک بار پھر اس ندائے ربانی سے گونج اٹھی ہو کہ :

ونادیناہ ان یا ابراھیم قد صدقت الرویا انا کذلک نجزی المحسنین ؀
یا ایتھا النفس المطمئنة ارجعی الی ربك راضیةً مرضیه فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی ۔

الحق
فروری ۱۹۸۱ء

◎

؎ راقم سطور کو فخر ہے کہ یہ طویل قیمتی اور پُر مغز تعزیتی شذرہ استاذِ محترم نے بندہ کے ایما پر لکھا ورنہ آپ نے حسبِ معمول مختصر نقشِ آغاز لکھا تھا ۔ میرے استفسار پر آپ نے فرمایا کہ چار صفحات پر مشتمل اداریہ میں نے لکھا ہے ، بندہ نے عرض کیا کہ اگر مزید کچھ آپ نے اس نابغۂ روزگار شخصیت پر تحریر فرمایا تو یہ آپ کا قارئینِ الحق پر عظیم احسان ہوگا ، چنانچہ آپ کے رشحاتِ قلم سے جو توقع تھی وہ پوری ہوئی ۔ (مرتب)

مولانا سید امین الحق طوروی رح

دوسرا حادثہ ہمارے علاقہ کے ایک جید محقق اور عبقری عالم و فاضل شخصیت حضرت مولانا سید امین الحق فاضلِ دیوبند طورو ضلع مردان کی جدائی کا ہے۔ مرحوم عرصہ سے صاحبِ فراش تھے۔ ایک بار اس سے قبل نہایت ثقہ اطلاع اور اخباری خبر سے ان کی وفات کا علم ہوا اور الحق میں ان پر تعزیتی شذرہ[1] آیا مگر یہ اطلاع اس وقت غلط تھی۔ الحق کو اس فروگذاشت پر ازحد افسوس

---

[1] وہ تعزیتی شذرہ جو جون ۱۹۷۰ء کے الحق میں شائع ہوا تھا، درج ذیل ہے :- (مرتب)

اوائل مئی میں ہمارے ایک اور محترم عالم نے ہمیں داغِ مفارقت دی۔ مولانا سید امین الحق صاحب خطیب اوقاف شیخوپورہ مرحوم وصال فرما گئے۔ مرحوم ۱۹۰۴ء میں ہمارے علاقہ کے موضع طورو مردان میں پیدا ہوئے جو ایک زمانہ میں علمی عروج اور رونقوں کی وجہ سے "بخارا" کہلاتا تھا۔ ۱۳۴۷ھ میں مرکزِ علمی دارالعلوم دیوبند سے سندِ فراغت لی۔ بیعت و ارشاد کا تعلق شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری رح سے تھا اور خلافت سے بھی نوازے گئے۔ اوقاف جیسے ضمیر کش محکمہ کی ملازمت کے باوجود آپ کا ضمیر آزاد رہا اور اپنی "قلندرانہ شان" قائم رکھی۔ جو جی میں تھا وہ منہ پر اور کبھی غیر محتاط انداز میں بھی، صاف گوئی سے گریز نہیں کیا۔ درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا بھی شغل رہا۔ حجیتِ حدیث پر "بصائر السنۃ" کے نام سے ایک وقیع کتاب لکھی، اسی طرح تقلید کی مدافعت، عیسائیت کے تعاقب صحابۂ کرام رض کی تعدیل، زمینداری اور شرعی نظام پر بھی علمی مواد فراہم کیا۔ کئی تصانیف کی شکل میں اپنی نشانیاں چھوڑیں۔ اب آخر میں امام ابوحنیفہ رح کی مدافعت میں خطیب بغدادی رح کے اعتراضات کا معقول اور مدلل جواب لکھا۔ ان کا اصرار تھا کہ یہ الحق میں شائع ہو اور الحق نے اپنے خاص انداز اور معیار کی بناء پر ایسے اختلافی ادق علمی مباحث سے گریز کیا رہا۔ فضل الرحمٰن کے فتنۂ تجدد و استشراق کے رد میں الحق میں ان کے دقیع مضامین شائع ہوتے رہے۔ مرحوم کی جدائی فضلاء دیوبند اور اہل علم کے لیے موجبِ رنج و غم ہوگی۔

رہا مگر وقتِ موعود نے جب آنا تھا تو اس وقت کی غلط اطلاع اب سچی ہو گئی۔ کہ ہر ایک کو جانا ہے جلد یا بدیر، غنیمت ہے کہ جن کی حیاتِ مستعار کے لمحات و انفاس دینِ حق کے کام آجائیں۔ اور مولانا نے خطابت و تدریس کے ساتھ ساتھ قلم و قرطاس کی شکل میں بھی اس کا حق ادا کیا۔ وہ کئی فاضلانہ کتابوں اور مقالات کے بھی مصنف تھے اور الحق کے ابتدائی سالوں میں اس کے مقالہ نگار بھی۔[1]

دعا ہے کہ حق تعالیٰ مولانا مرحوم کو ان کی خدماتِ علمی و دینی اور حمیتِ حق کا صلہ اس عالم جاودانی میں عطا فرماوے جہاں اس صلہ سے بڑھ کر کوئی دولت و نعمت نہیں ہو سکی۔

الحق

ستمبر ۱۹۸۱ء

---

[1] تصانیف میں حجیت حدیث پر بصائر السنۃ۔ نتائج التقلید کے جواب میں السہم الحدید فی نحر الحدید مولانا محمد اسمٰعیل سلفی گوجرانوالہ کے جواب میں تنبیہ الاغبیاء علیٰ حیاۃ الانبیاء۔ عجالۂ نافعہ۔ بائبل اور قرآن عیسائی مبلغ ایس۔ ایم۔ پال کے رسالہ قرآن کے جواب میں۔ صحابۂ معیارِ حق ہیں۔ تذکرۃ الرسول۔ زمینداری کا شرعی نظام، اسلام کا معاشی نظام۔ اسلام اور قربانی۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو الحق، مضمون قاری فیوض الرحمٰن، علماء سرحد کی تصنیفی خدمات۔ (مرتب)

مولانا اختر حسین دیوبندیؒ

فضلاء دارالعلوم دیوبند اور علمی حلقوں کے لیے یہ خبر موجبِ غم ہوگی کہ اس سال کے آغاز (جنوری) میں دارالعلوم دیوبند کے ایک معمر بزرگ استاذ[1] مولانا سید اختر حسین صاحبؒ کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم دارالعلوم کے مشہور عارف باللہ مدرس مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ کے فرزند تھے۔ پاکستان میں اکثر فضلاء دارالعلوم دیوبند کو مولانا سید اختر حسین صاحبؒ کا شرفِ تلمذ حاصل ہوگا۔ افسوس کہ وفات کی اطلاع بہت تاخیر سے ملی۔

الحق

ستمبر ۱۹۸۱ء

---

[1] دارالعلوم دیوبند میں آپ ۱۳۴۴ھ میں مدرس مقرر ہوئے تھے۔ (مرتب)

حکیم الاسلام مولینا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مہتمم دار العلوم دیوبند

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

دار العلوم دیوبند کی محفلِ دد نشین کا وہ چراغ سحر جو پچھلے دو سال سے حوادث و انقلابات زمانہ کے جھونکوں سے بجھ بجھ کر بھی ٹمٹما رہا تھا، بالآخر شوال ۱۴۰۳ھ کے پہلے ہفتہ میں ہمیشہ کے لیے خموش ہو گیا، یعنی حکیم الاسلام مظہر انوارِ قاسمیہ، مسند نشین جامعہ دیوبندیہ، ترجمانِ حقائق اسلامیہ مولانا حافظ قاری محمد طیب صاحب قاسمی قدس اللہ سرہ العزیز نے داعی اجل کو لبیک کہا، اور دیوبندی مکتب فکر کے اس میر مجلس کے بساط لپیٹ دینے سے محفلیں اجڑ گئی ہیں اور ہر سو وحشت اور ویرانگی کا سا عالم ہے۔ اب اُس دور کا بالکل خاتمہ ہو گیا ہے جو شیخ الہند مولانا محمود الحسن، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، علامۃ العصر مولانا انور شاہ کشمیری، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانی (رحمہم اللہ) کا یادگار تھا۔ ان کی ذات ان اکابر کی نہ صرف بقیۃ السلف نشانی تھی بلکہ ان کی ذات میں ان تمام اکابر و اساطینِ دیوبند کی نسبتیں جمع تھیں اور وہ زندگی بھر اپنی ذاتی، حسبی اور نسبی گوناگوں خصائص و کمالات کی وجہ سے ان تمام اکابر کے محبوب بن چکے تھے۔ ایک مرحلہ ایسا آیا کہ شاید آپ دار العلوم دیوبند چھوڑ کر پاکستان سکونت اختیار کر لیتے، ادھر اکابر دیوبند باصرار آپ کو دوبارہ دیوبند کھینچ لائے تو استقبالیہ تقریب میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے دیدۂ پُرنم اور گلوگیر آواز میں ان کو مخاطب کر کے فرمایا ؎

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو　　　تو کجا بہر تماشا می روی

بلاشبہ ان کی ذات محبوبیت میں تماشا گاہِ عالم تھی، وہ اُس گلشنِ علم ومعرفت کے مالی اور شجرۂ طوبیٰ کے امین تھے جس کے لیے حجۃ الاسلام ولی اللہ دہلویؒ، حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور شہدائے بالاکوٹ نے زمین ہموار کی، جس کی داغ بیل حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور فقیہ الاسلام مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ڈالی اور جس کی آبیاری میں شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانویؒ، علامۃ العصر انور شاہ کشمیریؒ اور مجاہد اعظم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ جیسے عمائدینِ امت نے اپنی زندگی تج دی ——— یہ امانت جب آپ کے ہاتھوں میں آئی تو پون صدی کے طویل اور صبر آزما شبانہ روز جدوجہد، خداداد اہلیت وصلاحیت، اخلاص و دیانت اور والہانہ جہد وعمل کے ساتھ آپ نے اس مدرسۂ علم کو ایک ایسے جامعہ میں تبدیل کر دیا جس کے انوار وتجلیات سے ایک عالم جگمگا اٹھا، اور وہ اس امانت سے الگ ہو کر جب دنیا سے رخصت ہوئے تو دیوبند کا وہ سرچشمۂ علم علومِ نبوت کا ایک بحرِ ذخار بن کر علم ودانش کی پوری دنیا سے اپنی برتری اور فضیلت کا لوہا منوا چکا تھا۔

آپ حضرت بانی دار العلوم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پوتے مولانا محمد احمد مہتمم خاص کے صاحبزادے تھے۔ حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے خصوصی تلمیذ حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت اور حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ مجاز تھے، پورے طبقہ کے محبوب ومنظورِ نظر اور مرکزِ علمی کی سیادت کے لحاظ سے پوری جماعت کے سید الطائفہ تھے۔ علمی فیض کے علاوہ بیعت وارشاد کے میدان میں بھی لاکھوں مسترشدین کے روحانی رہبر ورہنما تھے۔ ۱۳۳۷ھ میں درسِ نظامی سے فراغت پائی اور دار العلوم دیوبند میں درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔

۱۳۴۳ھ سے ۱۳۴۸ھ تک دار العلوم کے نائب مہتمم رہے۔ ۱۳۴۸ھ سے لے کر وفات سے کچھ عرصہ قبل تک اس مرکزِ علم وہدایت کی سیادت آپ کو حاصل رہی نیرنگیٔ زمانہ یا چرخ نیلگوں کی ستم ظریفی کہیے کہ زندگی بھر علم وحکمت کے جس "تاج محل" (دار العلوم دیوبند) کی آرائش وتزئین میں مصروف رہے۔

جب وہ بناء عظیم جشن صد سالہ کی شکل میں عظمت وترقی کے اوجِ کمال کو چھونے لگی تو

اِس عمارت کا یہ "شاہجہان" جدائی اور مہجوری کے داغ لیے ہوئے اس دُنیائے رنگ و بو سے الگ ہوگیا، جو کچھ پیش آیا گو اس کے محرکات ان کے عہد اہتمام کی طرح دیرینہ اور قدیم تھے۔ اور مشیتِ ایزدی کے سامنے کس کی چلتی ہے مگر پھر بھی بے اختیار جی میں آتا ہے کہ کاش یہ صورتحال دو ایک سال مزید پیش نہ آتی اور دار العلوم دیوبند کا یہ جرنیل ان ہی عظمتوں اور رفعتوں کے ساتھ اور انہی قدر شناسیوں کے ساتھ ہم سے رخصت ہوا ہوتا جو زندگی بھر ہم سب نے انہی کے لیے مخصوص کر رکھی تھیں اور جس کے وہ سزاوار تھے کہ سالارِ کارواں کی شوکت و سطوت پوری جماعت اور قافلہ کی شان بڑھاتی ہے۔ وَلٰکِنْ ما شاء اللہ کان وما لم یشاء لم یکن[1]۔

حکیم الاسلامؒ نسبی اور رُوحانی رشتوں کے ساتھ ساتھ علم و حکمت کے لحاظ سے اپنی ذات سے بھی ایک انجمن تھے، ان کے علوم و تصانیف اور خطبات، حکمت ولی اللّٰہی اور معرفتِ نانوتویؒ کے اُبلتے ہوئے سرچشمے ہوتے تھے۔ اسرارِ دین کی تشریح اور رموزِ شریعت کی ترجمانی میں ان کا شمار گنے چُنے حکماء اسلام میں ہو سکتا ہے۔ ان کی ہر تقریر حقائق و معارف کا ایک سمندر اور ہر تحریر اسرار و نکات کی ایک دُنیا اپنے اندر لیے ہوئے تھی۔ ان کے خطبات سے نہ صرف برصغیر کا گوشہ گوشہ بلکہ عالم اسلام کے علاوہ افریقہ اور یورپ کی دُور دراز بستیاں بھی مستفید ہوئیں۔ دین اور مادرِ علمی دیوبند کی آواز پہنچانے میں زندگی کا اکثر حصہ طویل اسفار کی نذر ہوا۔ اسلام کے اہم اور عصر حاضر کے جدید مسائل پر ایک سو سے زائد تصانیف چھوڑیں۔ حدیث و تفسیر اور فنِ حقائق و اسرار کی کتابیں اکثر زیرِ درس بھی رہتیں۔ دعوت و بیان کا انداز حکیمانہ، تصنیف و تالیف کی شانِ فلسفیانہ ہونے کے باوجود شعر و سخن میں بھی اعلیٰ ذوق اور ثقہ انداز رکھتے تھے۔ ان کی مثنویاں، قصائد اور فصیح و بلیغ نظمیں اعلیٰ ترین ذوقِ سخن کی غمازی کرتی ہیں۔

الغرض وہ اپنے جامع الصفات اکابر و اسلاف کے کمالات و محاسن، نجابت و سعادت

---

[1] ما پروریم دشمن و مامی کشیم دوست۔ (مرتب)

شرافت و وجاہت، فضل و کمال، اخلاق و شرافت، وقار و تمکنت، فکر و اصابت، تواضع و متانت کا ایک پیکرِ جمیل اور دیوبند کی اعلیٰ روایات کا ایک مُرقع اور ظاہری لطافت و نظافت اور حسن و پاکیزگی کا ایک مجسّمہ تھے۔ ان کا ماتم ان سب صفات کا ماتم ہے، پوری قوم اور پوری مِلّت کا ماتم ہے، دُنیائے علم و فضل کا ماتم ہے۔ درسگاہوں، جامعات اور خانقاہوں کا ماتم ہے۔ اور دارالعلوم حقانیہ کے لیے بھی اس لحاظ سے ایک عظیم ماتم کہ دارالعلوم اور اس کے بانی مدظلہ کے ساتھ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے علائق و روابط اور خصوصی عنایات و توجہات کی داستان تقریباً نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے ع

کبھی فُرصت میں سُن لینا بڑی ہے داستان میری

الوداع اے فخرِ دین و مِلّت، الوداع اے خادمِ حصنِ اسلام، الوداع اے شارحِ علومِ قاسمیہ، الوداع اے امینِ گلشنِ علومِ نبویہ، الوداع اے میرِ کارواں، الوداع تیری تُربت پر ہزاروں رحمتیں ہوں، اور تُو ربِّ کریم کی بے پناہ لطف و کرم سے مالامال ہو ۔

نذرِ اشکِ بے قرار از من پذیر گریۂ بے اختیار از من پذیر

برد اللہ مضجعك و نور ضريحك و انزل عليك شآبيب رحمتك[1]۔

الحق

جولائی ۱۹۸۳ء

---

[1] سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لیے۔ (مرتب)

قاری محمد طیب صاحبؒ

افکار و سوانح

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقام دعوت و تجدید

پچھلے دنوں جب حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب[1] قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اپنے سفرِ پاکستان کے دوران اپنی خاص محبت اور تعلق کی بناء پر دارالعلوم حقانیہ کو بھی اپنی تشریف آوری سے نوازا اور دارالعلوم حقانیہ کی فضائیں حضرت کی آمد کی وجہ سے پُرنور مجالس اور محافل سے سراپا نور بن گئیں۔ تو اچانک دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ماہنامہ الحق کے لیے مرکزِ اسلام کے مدیرِ شہیر اور حضرت حکیم الاسلام مولانا نانوتویؒ کے علوم و اسرار کے امین سے ایک انٹرویو ریکارڈ کرایا جائے۔ اِدھر یہ خواہش اُدھر حضرت کی مصروفیات، اردگرد پروانوں کا ہجوم اور پھر حضرت کی علالت اور تھکاوٹ سفر کے ساتھ ساتھ تازہ زکام اور نزلہ اس پر مستزاد، مگر خدا کی خاص دستگیری تھی کہ رات گیارہ بجے کے بعد اس مقصد کے لیے کچھ یکسوئی کا وقت نکل ہی آیا۔

---

[1] حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب قاسمی رحمہ اللہ سے دارالعلوم حقانیہ کی آمد ۱۳ر۱۴ اکتوبر ۱۹۶۸ء مطابق ۲۰ر۲۱ رجب ۱۳۸۸ھ کی درمیانی شب کے موقع پر الحق کے مدیرِ شہیر نے بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی شخصیت، ان کے مقامِ دعوت و تجدید، علمی، سیاسی، معاشرتی اور تجدیدی کارناموں پر ایک مفصل معرکۃ الآراء تاریخی انٹرویو لیا تھا حضرت قاری صاحب رحمہ اللہ کے تذکرہ کے ساتھ مناسب تھا کہ اس انٹرویو کو بھی شامل کیا جائے۔ (مرتب)

حضرت سے پہلا سوال دارالعلوم دیوبند کے مستقبل کے بارہ میں تھا۔ بھارت سے مسلمانوں کی ثقافت پرسنل لاء اور ثقافتی مراکز کے متعلق جو خبریں آتی ہیں وہ اگرچہ مبالغہ آمیز سہی لیکن پریشان کن ضرور ہوتی ہیں پھر مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کا تو خیال آتے ہی دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں کہ :- ع

عشق است و ہزار بدگمانی

جس شجرۂ طوبیٰ کے لیے حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، شاہ عبدالعزیزؒ اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور شہدائے بالاکوٹ نے زمین ہموار کی، جس کی داغ بیل حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور فقیہ الاسلام مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے سراپا اخلاص و عمل بزرگوں نے رکھی پھر جس کی آبیاری میں شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ جیسے اساطینِ امت نے اپنی زندگی تج دی۔ آج انوار و معارفِ قاسمیہ کے امین اور بانیٔ دارالعلوم کے حفیدِ رشید مولانا محمد طیب قاسمی سے پہلا سوال اسی دارالعلوم دیوبند کے بارے میں تھا، جس کی تعمیر و تشکیل سے خود حضرت قاری صاحب مدظلہ کی پوری زندگی کی داستان وابستہ ہے۔ حضرت نے پورے اعتماد، مضبوط ایمان اور توکل سے بھرپور انداز میں جواب دیا :-

——— "جی ہاں اللہ بہتر کرے، بنیاد تو اس کی ایسی ہی ہے کہ مستقبل روشن ہے انشاء اللہ اور یہ اس لیے کہ بڑی بڑی گھاٹیاں آئیں، اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ رکھا۔ بڑے بڑے مخالف پیدا ہوئے مگر اللہ کا فضل ہے وہ بڑھتا ہی رہا" ———

اطمینان اور تسلی کے لیے یہی کچھ کافی تھا مگر یکایک دھیان مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدرِ اوّل دارالعلوم دیوبند کے ایک مکاشفہ یا پیشینگوئی کی طرف گیا جسے کہیں پڑھا یا سنا تھا، اور پھر جب یہ بھی خیال آیا کہ دارالعلوم اپنی زندگی کے سو سال تو پورے کر چکا ہے، تو گویا دل و دماغ پر ایک بجلی سی کوند پڑی اور سائل نے حکیم الاسلام قاری محمد طیب سے اس بارہ میں پوچھا کہ حضرت! کسی بزرگ غالباً مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا ایک مقولہ سننے میں آیا ہے کہ سو سال تک تو اس دارالعلوم کا خدا محافظ ہے، اس کے بعد حق تعالیٰ کی

شانِ بے نیازی کا جو فیصلہ ہو —— حضرت نے اس کا جواب دیا اور یکایک فکر و اضطراب کی گھٹائیں اطمینان اور امید کی قندیلوں سے روشن ہوگئیں۔ —— حضرت نے فرمایا۔
—— "نہیں اتنا میں نے سنا ہے کہ یہ مدرسہ چلتا رہے گا، چلتا رہے گا یہاں تک کہ ہندوستان میں انقلاب ہو اور یہ مدرسہ پھر اسلامی حکومت کے ہاتھ میں چلا جائے اس پیشینگوئی سے ہم تو بڑی امیدیں باندھے ہوئے ہیں" —— پھر حضرت نے خود فرمایا —— "یہ ایک عجیب بات ہے اور اب تک تو پوری ہوتی آ رہی ہے"۔
حضرت قاری صاحب وضاحت فرما رہے تھے اور چشم تصور نے دہلی کے لال قلعہ پر ہلالی پرچم لہراتا دیکھا، کانوں نے اس کی سرسراہٹ محسوس کی اور مسلمانوں کی عظمتوں کی امین سرزمین پر شوکتِ اسلام کے تصور ہی سے دل خوشی سے جھوم اُٹھا، مگر کیا خبر کہ یہ سنہرا خواب بھی زندگی کی اور حسرتوں کی طرح شرمندۂ تعبیر ہوتا ہے یا نہیں —— اس امید و بیم میں راقم الحروف نے اپنی بات دوسرے پیرایہ میں دُہرائی ——
حضرت تجدیدِ دین کا زمانہ تو اشخاص و افراد کے لحاظ سے سو سال کا ہوتا ہے، تو یہ تو دین اور علومِ دین کا ایک مجدد ادارہ ہے، تو اس کی عمر تو ہزاروں سال ہونی چاہیئے۔
ابھی میں نے اپنی بات پوری نہیں کی کہ حضرت نے ایسا امید افزا اور ایمان پرور جواب دیا کہ دل و دماغ میں فکر و اضطراب کی بجائے خدا کی رحمت اور وعدۂ حفاظتِ دین کے یقین کی شمع فروزاں ہوئی۔ حضرت نے فرمایا :۔
—— "میں نے اپنے بزرگوں مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ اور دیگر حضرات سے کئی بار سنا ہے کہ مجدد کے لیے شخصِ واحد کا ہونا ضروری نہیں بلکہ جماعت بھی ہو سکتی ہے۔ اور ان حضرات نے فرمایا کہ یہ جو حضرت گنگوہیؒ حضرت نانوتویؒ اور ان اکابر کی جماعت ہے یہ سب مجدد ہیں جنہوں نے سنت اور بدعت میں، معروف اور منکر میں تمیز پیدا کی۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ ان حضرات کی تجدید کا مظہرِ اتم یہ دارالعلوم ہے اسی کو مجدد کہا جائے۔ اور مولانا حبیب الرحمٰنؒ نے دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا تھا کہ یہ جو عمل ہے تجدیدِ دین کا اس کی نسبت اور قیام کا مرکز ہے۔ دارالعلوم اور ہندوستان

میں یہ دارالعلوم قُطبُ الرَّحیٰ کی حیثیت رکھتا ہے، جیسے چکی کے پاٹوں کے بیچ میں کِلی ہوتی ہے تو اس کے اردگرد چکی کے پاٹ گھومتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کے نہ صرف دینی معاملات بلکہ ملکی معاملات بھی اس کے اردگرد گھوم رہے ہیں، اس کے اندر کچھ قوّت اور مقناطیسی طاقت خدا نے رکھی ہے"۔۔۔ اور تیسری بات جس سے ڈھارس بندھتی ہے وہی مولانا یعقوب صاحب کا مقولہ کہ ۔۔۔ "یہ دارالعلوم چلتا رہے گا یہاں تک کہ ہندوستان میں انقلاب آجائے اور یہ پھر اسلامی حکومت کے ہاتھ میں چلا جائے"۔۔۔۔۔

حضرت اپنی بات ابھی سمیٹ رہے تھے کہ حضرت شیخ الحدیث صاحب مدظلہٗ مجلس میں تشریف لائے اور حضرت کے پہلو میں بیٹھ گئے، حضرت نے ان کی طرف متوجہ ہو کر انٹرویو کی ستم کاری کا شکوہ اس ظرافت آمیز انداز میں فرمایا کہ ۔۔۔۔۔ ان لوگوں کا منشا یہ ہے کہ تم رات کو بھی جاگے ہو دن کو بھی نہیں سونا چاہیے اور کل کو آٹھ گھنٹے کا سفر ہے جاگ کر چلے جانا تاکہ مجاہدہ مکمل ہو جائے ۔۔۔۔۔

بزرگوں کی شفقت سے طبیعت میں جو گستاخی اور شوخی آگئی ہے اس کی بنا پر عرض کیا گیا کہ حضرت پورے سفر میں ہماری "قدرشناس میزبان حکومت" نے آپ کے تقریروں پر پابندی لگا کر آپ کو بڑی راحت پہنچائی ہے، اب ہم کل سے اس کی کسر یہاں دارالعلوم حقانیہ میں نکالنا چاہتے ہیں۔ حضرت نے جن کی طبیعت کو خدا نے شکوہ و شکایت کی بجائے صبر و تمکنت اور تحمل کی نعمت سے بڑی فراوانی سے نوازا ہے۔ ہماری اسلامی حکومت کے اس سراسر نامناسب اقدام پر احتجاج یا افسوس کی بجائے احسان مندی کے لہجے میں فرمانے لگے کہ جی ہاں! یہ تو واقعی یہاں کی حکومت کا میرے ساتھ نادانستہ احسان ہے یا پھر میرے ضعف، بڑھاپے اور علالت پر خداوندکریم کا غیبی کرم، ورنہ تقریر پر پابندی نہ ہوتی اور ہر جگہ دوستوں کے تقاضا پر مجھے بولنا پڑتا تو شاید میری طبیعت اس کی متحمل نہ ہوسکتی، گو میں تو وہاں سے یہ ارادہ کر کے آرہا تھا کہ تقریر و بیان سے حتی الوسع علالت کی وجہ سے پہلوتہی کروں گا ۔۔۔۔۔ عالم اسلام کے ایک

جلیل القدر عالم دین اور مسلمانوں کے قابلِ فخر بزرگ کی اپنے ملک میں اس "پذیرائی" کا ذکر چھیڑ کر مجھے خود ندامت اور خفت محسوس ہونے لگی مگر حضرت کی زبان سے ایسا تبصرہ سُنکر اپنے اکابر کی شرافتِ نفس اور علوِّ اخلاق کا ایک پہلو تو سامنے آ ہی گیا ـــــ

اس کے بعد گویا اصل انٹرویو شروع ہوا اور ایک پرزہ جس پر عجلت میں چند سوالات لکھے گئے حضرت کی طرف بڑھایا گیا۔ حضرت نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر گویا ہماری طفلانہ خواہش اور تنگیٔ داماں دیکھ کر مسکرانے لگے ـــــ "ارے بھئی یہ تو بڑے لمبے سوال ہیں، ان میں سے کسی ایک سوال کے ایک گوشہ پر گفتگو کے لیے بھی یہ پوری رات ناکافی ہے" ـــــ مگر ایک سدا بہار گلشن سے گذرنے والے کسی سراپا شوق کی نظر تو اپنی تنگ دامنی سے زیادہ انواع واقسام کی زیبائش اور رعنائی پر ہوتی ہے، اس کے دامانِ نگاہ میں تو پورا چمن سمیٹ لینے کی چیز ہے کہ پھول ہے تو یہی اور سرسبز و شاداب گوشہ ہے تو بس یہی۔

سب سے پہلا سوال حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے بارہ میں تھا جن کے سر پر خدا نے ظلمت کدۂ ہند میں حفاظتِ دین کا سہرا باندھا اور جن کی مؤمنانہ بصیرت، مجاہدانہ جدّوجہد، حکیمانہ علوم اور جدید علمِ کلام کی وجہ سے خداوندِ کریم نے دورِ غلامی میں اسلام اور اسلامیانِ ہند کے علوم و تہذیب کو محفوظ رکھا۔ بلاشبہ اس امامِ کبیر کی نظیر قرونِ اولیٰ ہی میں مل سکتی ہے۔ علم میں، عمل میں، جہاد اور ریاضت میں، تدبر اور سیاست میں، تصوف اور سلوک میں حضرت حجۃ الاسلام یکتائے روزگار تھے۔ ایک نقادِ عالم نے بالکل صحیح کہا کہ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی ذات ستودہ صفات انیسویں صدی کے نصف آخر میں بے شبہ آیت من آیات اللہ تھی۔ آپ کے علمی، اخلاقی اور روحانی کارنامے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ قدرت نے رازیؒ کا فلسفہ، شعرانیؒ کا علم الکلام، غزالیؒ کا سوز وگداز، ابن تیمیہؒ کا صولتِ بیان، شاہ ولی اللہؒ کی حکمت و دانش، شیخ احمد سرہندیؒ کی غیرت و حمیتِ اسلامی اور ٹیپوؒ کی شجاعت، یہ سب چیزیں کس فیاضی سے ایک شخص میں جمع کر دی تھیں ـــــ اور بقول حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ ہمارے اکابر تو وہ ہیں کہ اگر

ان کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرا دیا جاوے اور بتلایا نہ جاوے تو دیکھنے والے رازیؒ اور غزالیؒ ہی کی سمجھیں گے ـــــــ اور آج حضرت قاری صاحب سے اُسی امام دعوت و عزیمت، سرخیل اربابِ صدق وصفا، علمبردارِ جہادِ حریّت اور نابغہ روزگار شخصیت کے مقامِ دعوت و عزیمت پر کچھ روشنی ڈالنے کے لیے کہا گیا تھا ـــــ اور حجۃ الاسلامؒ کے پوتے فرما رہے تھے کہ ـــــ "حضرت نانوتویؒ نے زندگی میں جو کام انجام دیئے وہ تو بہت زیادہ ہیں لیکن بنیادی طور پر تین بڑے بڑے کام انجام دیئے ـ سب سے پہلا کام دارالعلوم دیوبند کا قیام ہے، یہ اتنا عظیم کام ہے کہ پوری دنیا پر اس نے اثر ڈالا ہے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ خلافتِ اسلامیہ کی تائید میں ہمہ وقت منہمک رہے، سلطان عبدالحمید خان خلیفہ تھے، گو وہ خلافت نام کی رہ گئی تھی مگر حضرت چاہتے تھے کہ وہ نام ہی قائم رہے، اس سے تمام ممالکِ اسلامیہ میں ایک مرکزیت قائم رہے گی۔ اس لیے حضرتؒ نے خود بھی سلطان کی حمایت میں قصیدے لکھے، مولانا محمد یعقوبؒ اور مولانا ذوالفقار علیؒ سارے بزرگ رطب اللسان رہے اور جب بھی ترکوں سے کسی کی جنگ ہوئی یہ حضرات ترکوں کی حمایت میں کھڑے ہوئے۔ کہیں چندہ جمع کر رہے ہیں، کہیں رائے عامہ پیدا کر رہے ہیں۔ غرض ہمہ وقت مصروف رہتے۔ تو مقصد یہی تھا کہ خلافت کا نام قائم رہے تاکہ تمام ممالکِ اسلامیہ میں کچھ نہ کچھ ارتباط تو قائم رہے ــــ اور تیسری چیز یہ انجام دی کہ دیوبند اور نواحِ دیوبند میں نکاحِ بیوگان کو انتہا درجہ کا عیب سمجھا جاتا تھا اور یہ چیز ہندوؤں سے آئی تھی، اگر کسی نے نام بھی لیا تو تلواریں نکل آتی تھیں، حضرتؒ نے نہایت لطیف پیرایہ میں اس کی تحریک شروع کی، جب اندرونی طور پر خواص کو اپنا ہم خیال بنایا تو اس کے بعد جلسۂ عام کیا، ہمارے یہاں دیوان کا دروازہ جو ہے وہ نواب لطف اللہ خان مرحوم کا محل ہے جو اورنگ زیبؒ کے وزیرِ خارجہ تھے اور دیوبند میں عثمانیوں کے مورثِ اعلیٰ تھے، اُس میں حضرتؒ نے وعظ فرمایا، بہت بڑا مجمع تھا۔ درمیان میں ایک شخص اُٹھا اور کہا کہ حضرت مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ فراست سے سمجھ گئے کہ کیا کہنا ہے؟ جواب میں فرمایا کہ ابھی تھوڑی دیر

میں آتا ہوں، ایک ضرورت پیش آئی، لوگوں نے سمجھا کہ استنجا وغیرہ کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔ حضرتؒ گھر میں گئے، حضرتؒ کی بڑی بہن بیوہ تھیں، ۹۵ برس کی عمر میں نہ نکاح کے قابل نہ کچھ، مگر اعتراض کرنے والے کو اس کی کیا ضرورت ہے وہ تو یہ کہتا ہے کہ آپ دُنیا کو نصیحت کرتے ہیں مگر آپ کی بہن تو گھر بیٹھی ہے ۔۔۔ گھر میں گئے تو بڑی بہن کے پیروں پر ہاتھ رکھا، انہوں نے گھبرا کر کہا کہ بھئی تم عالم ہو یہ کیا کر رہے ہو؟ فرمایا میں بہر حال آپ کا چھوٹا بھائی ہوں آج ایک سُنّتِ رسولؐ زندہ ہوتی ہے اگر آپ ہمت کریں تو آپ پر موقوف ہے۔ فرمایا کہ میں ناکارہ اور سُنّتِ رسولؐ کی احیاء میری وجہ سے؟ حضرتؒ نے فرمایا کہ آپ نکاح کر لیجیے۔ فرمایا: کہ بھئی تم میری حالت دیکھ رہے ہو، منہ میں دانت نہیں، کمر جھک گئی، ۹۵ برس میری ہے۔ کہا یہ سب میں جانتا ہوں مگر اعتراض کرنے والے اس چیز کو نہیں دیکھتے۔ تو فرمایا کہ اگر سُنّتِ رسولؐ میری وجہ سے زندہ ہو سکے تو میں جان قربان کرنے کو بھی تیار ہوں ۔۔۔۔ تو ۔۔۔۔ اُن کے دیور کی بیوی کا انتقال ہوا تھا اور ان کے خاندان کا وہاں پر چودہ، پندرہ آدمی تھے خاندان کے انہی افراد کے سامنے نکاح پڑھایا گیا، گواہ بنا دیئے گئے۔ اس میں کچھ دیر لگ گئی۔ پھر حضرت نانوتویؒ باہر آئے اور مجمع میں دوبارہ تقریر شروع کی ۔۔ وہی سائل پھر کھڑا ہوا کہ کچھ عرض کرنا ہے ۔۔۔ فرمایا کہیئے ۔۔۔ اس نے کہا آپ دنیا کو نصیحت کر رہے ہیں اور آپ کی بہن بیوہ بیٹھی ہے تو ہم پر کیا اثر ہو گا؟ فرمایا کون کہتا ہے؟ ان کے نکاح کے تو شاید گواہ بھی یہاں موجود ہوں گے ۔۔۔۔ دو تین آدمی درمیان میں کھڑے ہوئے اور کہا کہ ہمارے سامنے نکاح ہوا ہے ۔۔۔۔ اصلاحِ معاشرت اور رسومات مٹانے کے لیے حضرتؒ نے خود اپنے گھر سے قربانی پیش کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی مجلس میں ستر، اسی نکاح پڑھے گئے اور پھر یہ سنّت ایسی کھلی کہ ہزاروں بیواؤں کا نکاح ہو گیا ۔۔۔۔

تو پہلی چیز تو دارالعلوم کے قیام پر زور دیا، اس کی روح فی الحقیقت یہ تھی کہ علومِ نبوت اگر عام ہوئے اور ایمان سنبھل گئے تو پھر مسلمان سب کچھ کر سکتے ہیں، اور اگر ایمان ہی نہ رہا تو پھر کچھ نہیں کر سکتے، اس لیے کہ جب شوکت اور

حکومت جا چکی تو کم از کم دین تو محفوظ رہ جائے، وہ رہ گیا تو آگے سب کچھ ہو جائے گا۔

اس لیے سفر میں جہاں بھی گئے تو مدارس قائم کرتے چلے گئے۔ مراد آباد میں مدرسہ شاہی امروہہ میں مدرسہ چلہ، بریلی میں مدرسہ اشاعت العلوم، انبیٹھہ اور تھانہ بھون میں دینی مدرسے اور گلاؤٹی میں مدرسہ قاسمیہ قائم کیا، اور جتنے متوسل تھے خطوط لکھتے رہے کہ جہاں ہو مدرسہ قائم کرو۔ اور یہ حضرتؒ کی ایک بڑی سیاست تھی اور اس کا حاصل یہ تھا کہ قوم کو علم کے راستے سے تیار رکھنا کہ وہ مضبوطی سے قائم رہے اور جب دین ہوگا تو آئندہ ممکن ہے کہ ان میں شوکت اور قوت بھی آ جائے ــــــ ادھر معاشرت کو درست کیا، معاشرہ کی سب سے بڑی خرابی نکاح بیوگان کی طرف توجہ دی ــــــ تیسری چیز یہ تھی کہ خلافتِ اسلامیہ کی طرف لوگوں کو مائل کیا، ہر وقت اس کا دھیان جس سے میں نے یہی سمجھا کہ حضرتؒ چاہتے تھے کہ اسلامی نظام کی کڑی نہ کوئی ــــــ باقی رہے، اگر ہندوستان میں اسلامی حکومت نہیں ہے تو کم از کم کسی اسلامی حکومت سے تو مربوط رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کی امیدوں کا مرکز بہت دنوں تک افغانستان رہا اور برطانیہ کو شکایت رہتی کہ یہ جماعت شورش کر رہی ہے اور افغانستان سے مل کر برطانوی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی ہے، مگر ان حضرات کو اس کی کیا پرواہ تھی؟ افغانستان سے برابر اپنا ایک رابطہ قائم رکھا، اور یہی وجہ ہوئی کہ جب امیر نادر خان کا انتقال ہوا اور ظاہر شاہ تختِ سلطنت پر بیٹھ گئے تو دار العلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ نے مجھے نمائندہ بنا کر بھیجا کہ امیر مرحوم کی تعزیت اور امیر موجودہ کی تہنیت کروں میں افغانستان حاضر ہوا اور میں نے یہ تحریر لکھ کر پیش کی کہ ہمارا مقصد کوئی مالیہ یا چندہ لینا نہیں بلکہ ان روابط کو زندہ کرنا ہے جو ہمارے اکابرؒ کے تھے جس پر صدر اعظم نے مجھے بلایا امیر بڑی عنایت و شفقت سے پیش آئے، جب میں قصرِ صدارت میں پہنچا تو ہم لوگ بیٹھ گئے میرا یہ خیال تھا کہ شاید ملاقات کے کمرہ میں بلایا جائے گا، لیکن یکایک دیکھا کہ خود صدرِ اعظم وہیں آ رہے ہیں۔ ہم سب لوگ کھڑے ہوئے آگے بڑھے تو وہی افغانی طریقہ پر معانقہ دایاں بایاں مونڈھا ملا کر پوری محبت کا اظہار انہوں نے کیا اس کے بعد فرمایا "بفرمائید" آپ

آگے چلیں، میں نے کہا "نے خلاف ادب است"۔ فرمایا: نہیں نہیں آپ کو آگے چلنا ہوگا
اور میں اس کی وجہ بتاؤں گا۔ اب ہم اس شان سے چلے کہ میں آگے آگے میرے پیچھے
صدر اعظم صاحب ان کے پیچھے سردار نعیم خان اور ان کے پیچھے مولانا محمد میاں صاحب
(منصور انصاریؒ) اور ان کے پیچھے غازی صاحب، ترتیب سے ہم آگے بڑھے تو وہ جو
رسمی کرسی تھی اُس پر مجھے بٹھلایا اور خود دوسری کرسی کھینچ کر سامنے بیٹھ گئے اور فرمایا کہ اب
میں وجہ بیان کرتا ہوں، اور وجہ مختصر یہ ہے کہ حکومت کابل کی خدمت ہمیں آپ بزرگوں
کی دعاؤں سے ملی ہے اور یہ اشارہ تھا اس طرف کہ امیر نادر خان صاحب کے چچا تایا
سردار محمد یوسف خان اور سردار محمد آصف خان، یہ دونوں بیعت تھے حضرت گنگوہیؒ سے،
اور برطانیہ نے انہیں ڈیرہ دون میں نظر بند رکھا تھا۔ تو یہ حضرات شکار کے حیلے
سے گنگوہ آکر حضرتؒ کی خدمت میں حاضری دیتے تھے اور حضرت کوئی نصیحت فرما
دیتے ـــ آخری دفعہ جب ملاقات ہوئی تو حضرتؒ نے فرمایا کہ: جاؤ کابل کی حکومت
تمہارے خاندان میں آئے گی اور عدل سے کام کرنا ـــ انہیں حیرت ہوئی کہ کابل کی
حکومت سے ہمارا کیا تعلق ـــ امان اللہ کی حکومت تھی، یہ لوگ بنی اعمام میں
سے تھے، تو انہیں عہدے وزارتیں وغیرہ تو ملتی تھیں مگر حکومت کا کوئی سوال نہ تھا۔
وہ سمجھے کہ حضرتؒ نے حوصلہ افزائی کے طور پر ایک کلمہ کہہ دیا ہے۔ اس کے بعد یہ
واقعہ پیش آیا کہ بچہ سقہ کی حکومت آئی، امان اللہ خان معزول ہوئے، کیونکہ اسی نے مظالم
ڈھائے تو قوم متوجہ ہوئی کہ امیر نادر خان کو فرانس سے بلایا جائے، وہ آئے اور حکومت
کی باگ ڈور سنبھالی اور پھر شہید ہوگئے ـــ تو صدر اعظم کا اشارہ اسی طرف تھا ـــ پھر
صدر اعظم نے فرمایا کہ ـــ ہمارے پاس کچھ تبرکات آپ کے بزرگوں کے محفوظ تھے،
مولانا نانوتویؒ کی ایک ٹوپی تھی جو میری والدہ کے پاس تھی اور ہمیں جب کوئی بیماری ہوتی
تو والدہ ہمیں وہ ٹوپی اڑاتی تھیں اور ہمیں شفا ہوجاتی، آج ڈاکٹر رفیقی (یہ جو ترک ہے)
کو ہم چھ ہزار روپے ماہانہ دیتے ہیں مگر اس کے نسخوں سے وہ شفا نہیں جو ان تبرکات
کی وجہ سے ہوتی۔ اور فرمانے لگے کہ بچہ سقہ کے زمانے میں ہمارا گھر لوٹا گیا، لاکھوں کا بیمہ

کا سامان چوری ہو گیا، لیکن ہمیں صدمہ ہوا تو تبرکات کا جس کا آج تک ہمارے اوپر اثر ہے ___ پھر صدر افغانستان نے فرمایا کہ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو آگے بڑھا رہا ہوں ___

یہ تو افغانستان سے روابط تھے اور سلطان عبدالحمید خان کا ترکوں سے تعلق کا حال معلوم ہوا جس سے ان حضرات کے ذہن کا اندازہ ہوتا ہے کہ یوں چاہتے تھے کہ کسی طرح اسلامی حکومت بازیافت ہو جائے، مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو، شیخ الہندؒ کی بھی یہی تحریک تھی وہ چاہتے تھے کہ عالم اسلام متحد ہو کر ترک اور افغانستان سب مل ملا کر ہندوستان پر حملہ آور ہوں، حضرتؒ کی یہ تحریک تھی اور وہ ہوئے بھی حملہ آور، مگر کچھ تو یہ ملک تیار نہ تھا، کچھ مجاہدین نا تربیت یافتہ تھے، نتیجہ شکست کی صورت میں نکلا، اور یہ خواہش انہیں ورثہ میں اپنے استاد حضرت نانوتویؒ سے ملی تھی، ۱۸۵۷ء میں تو گویا حضرت جوشِ جہاد میں غرق تھے اور بس یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح جان دے دوں۔ شاملی میں تلواروں سے مقابلہ بھی کیا۔

الغرض حضرتؒ کی زندگی کے کارناموں میں ایک علمی کارنامہ تو دارالعلوم ہے جس کا فیض اطراف عالم میں پہنچا، دوسرا معاشرتی کارنامہ ہے، اور تیسرا سیاسی اور اجتماعی کارنامہ کہ تہذیب و تعلیم ہی کے سلسلہ میں سہی مگر ممالکِ اسلامیہ میں کوئی نہ کوئی ربط قائم رہے اس سلسلہ میں حضرتؒ نے دارالعلوم دیوبند میں محکمہ قضاء قائم کیا اور مولانا یعقوب کو قاضی بنایا تو ہزاروں مقدمات جو برسہا برس سے الجھے ہوئے تھے، منٹوں میں طے ہوئے، لوگوں کا وقت اور مالیہ بچا، یہ سلسلہ جاری رہا، مگر انگریز نے آخر میں آکر توڑ دیا۔ دیوبند میں ایک تھانیدار کو بھیجا جو بڑا سخت قسم کا آدمی تھا۔ چنانچہ وہ آیا، رمضان شریف کا آخری عشرہ تھا، اس نے آکر حضرت نانوتویؒ سے مصافحہ کیا اور بہت جرأت کے ساتھ کہا کہ کیا آپ ہندوستان میں شرع محمدی کا جھنڈا گاڑنا چاہتے ہیں؟ یہ کیا آپ نے محکمہ قضاء قائم کیا؟ حضرتؒ نے بڑی نرمی سے کہا کہ یہ تو ہم لوگ گورنمنٹ کی مدد کر رہے ہیں جو لاکھوں روپے خرچ کر کے مقدمات فیصل کرتی ہے ہم نے منٹوں میں فیصل کر دیا، مگر اس نے کہا کہ نہیں آپ پورا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، میں رپورٹ کروں گا۔ اس پر حضرتؒ کو غصہ آیا اور کہا کہ کان سے پکڑ کر اسے نکال دو

طالب علموں نے دھکے دے کر اسے نکالا، اور حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ جا ہم تیری رپورٹ کریں گے، نکال دو اس شیطان کو یہاں سے ـــــ بہر حال عید کا دن آیا، تھانیدار کے ہاں دودھ کے بالٹے بھرے، مٹھے، کپڑے تیار، خوشیاں منائی جارہی تھیں کہ اچانک گورنمنٹ کا حکم پہنچا کہ اس کی رشوتوں کی انتہاء ہوگئی ہے، اس کو فوری برخاست کیا جائے، اور بازاریں دکان دکان پر جہاں سے اس نے رشوت لی ہے پیروں میں رسّی ڈال کر اسے پھرایا جائے۔ تو اس حالت میں اسے گھمایا گیا کہ یہ روتے ہوئے کہتا جارہا تھا کہ افسوس میں نے تو رپورٹ نہیں کی مگر مولوی جی نے میری رپورٹ کردی ـــ تو اس کا خمیازہ جلد اس نے بُھگت لیا، اس کی جگہ دُوسرا آیا اس کے بعد ان بزرگوں کی وفات ہوگئی اور وہ محکمہ نہیں چلا۔

ـــــ تو حضرتؒ کا چوتھا منصوبہ یہ تھا کہ اسلامی پرسنل لاء اور مخصوص قانونِ شریعت کے مطابق طے ہو۔ اسی کے تحت دارالعلوم دیوبند کے اکابرؒ نے جب لنڈن سے مسٹر مانٹے وزیر ہند آیا اور جارج کا زمانہ تھا، تو میرے والد صاحب (حافظ محمد احمدؒ) علماء کا ایک وفد لے کر ان سے ملنے کے لیے گئے اور درخواست یہ کی کہ ہندوستان میں محکمۂ قضا قائم کر دیا جائے جس میں شریعتِ اسلام سے مخصوص چیزیں نکاح، طلاق، عدت، میراث، اوقاف وغیرہ طے ہوں۔ اس نے ظاہر میں تو کہا کہ اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کروں گا اور پارلیمنٹ میں بھی۔ لیکن یہ ایک وقتی بات تھی نہ اس نے یہ پیش کیا نہ ایسا ہوا۔

مگر ان بزرگوں کا جذبہ برابر یہی تھا کہ اسلامی اقتدار مسائل کے درجہ میں سہی، قائم ہو جائے۔ تحفظِ خلافت اور روابطِ اسلامیہ کے سلسلہ میں حضرت نانوتویؒ نے ایک کام یہ کیا کہ لوگوں کو بہت زیادہ حج کے لیے مائل کرتے تھے اور فرمایا کہ ــــ اوّل تو عبادت ہے اور عبادت بھی اجتماعی، وہاں جا کر مکہ والوں سے بھی واسطہ پڑے گا، وہاں اسلامی حکومت دیکھیں گے تو ان کے قلوب پر اثر پڑے گا تو شوکتِ اسلامی کے جذبات ابھر آئیں گے تو علم و معاشرت، سیاست اور خلافت یہ چند چیزیں ایسی ہیں جو حضرتؒ

کی تمام خدمات کی محور ہیں۔

ــــــ رات آدھی گذر چکی تھی مگر شرکا مجلس ذکر قاسمیؒ میں ایسے محو کہ گویا ایک حسین خواب دیکھ رہے ہوں اور زمانہ پیچھے کی طرف پلٹ گیا ہو کہ یکایک حضرت قاری صاحب نے بساط لپیٹنی چاہی، سننے والے چونک پڑے اور حضرت کے ضعف و نقاہت کے باوجود ان کی توجہ حضرت نانوتویؒ کی ایک مخصوص شان علمی کمالات کی طرف مبذول کرنا چاہی کہ ابھی ذکر محبوب کچھ دیر اور چلتا رہے کہ اصحاب غرض کو تو اپنی مطلب برآری سے ہی کام ہوتا ہے ورنہ عقل اور ادب دونوں حضرت کو مزید تکلیف دینے سے روک رہے تھے، مگر دل چاہتا تھا کہ ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

حضرت نانوتویؒ کی علمی شانِ تجدید کا ذکر آیا تو حضرت قاری صاحب گویا یکدم تازہ دم ہوئے اور فرطِ نشاط میں محو ہو کر فرمانے لگے کہ علوم و معارف میں بھی حضرتؒ کا بالکل مجددانہ انداز ہے۔ حضرتؒ کی جو تصانیف ہیں، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی نگاہ بہت تھی تصانیف پر، اور یہ جملہ فرمایا کرتے تھے کہ سو برس تک فلسفہ کتنے روپ بدل کر آئے لیکن حضرتؒ کی حکمت اس کی قلعی کھولنے کے لیے کافی ہوگی، سو برس تک کوئی اسلام کا مقابلہ اور اسلام پر حملہ حجت سے نہیں کر سکتا، ایسی حجتیں جمع فرمادیں تو گویا ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈال دی جس سے اسلامی حقائق اور دقائق پورے واضح ہوتے ــــــ اور مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نظر کے لحاظ سے کہتا ہوں کہ سلف میں بھی بہت کم لوگ ملیں گے جنہوں نے اس قسم کی حکمت جمع کی ہو، یہ حضرت ہی کا حصہ ہے، اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ حضرت کی ہر چیز بیچ کی نہ بھی تھی بلکہ آخری کنارے پر لگی ہوئی۔

علم کے بارہ میں ایک بات مجھے اور یاد آئی کہ مولانا یعقوب صاحب کشف و کرامات بزرگوں میں سے تھے اور ان کے ہاں اخفاء تھا نہیں، جو واردات ہوتی صبح طالبعلموں

کے سامنے پیش کر دیتے کہ یہ رات کو کشف ہؤا، یہ الہام ہؤا، یہ عادت تھی۔ تو ایک دن فرمایا بھئی آج صبح کی نماز پڑھنے کھڑا ہؤا تو بال بال بچ گیا، میرے مرنے میں کسر نہیں تھی طلبہ نے عرض کیا کہ کیا پیش آئی، فرمایا کہ قرآن کریم کے علم کا ایک اتنا بڑا دریا میرے قلب کے اوپر گذرا اور غنیمت یہ ہے کہ وہ گذرتے ہی نکل گیا، ورنہ میں تحمل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بعد خود فرمایا کہ میں پریشان ہؤا کہ یہ کیا چیز تھی تو منکشف یہ ہؤا کہ میرے بھائی حضرت نانوتویؒ میرٹھ میں میری طرف متوجہ ہوئے، اُن کی توجہ کا یہ اثر ہؤا کہ علم کا ایک عظیم دریا میرے قلب پر گذرا اور اس کے بعد خود فرمایا جس شخص کی توجہ کا اتنا اثر ہے کہ اتنا بڑا علم گذر جائے کہ برداشت نہ ہوسکے تو وہ شخص خود اتنا بڑا علم کس طرح اٹھائے پھر رہا ہے — اس میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ مولانا یعقوبؒ اور تمام اساتذہ دارالعلوم نے جن میں اساتذہ بھی ائمہ فنون تھے — مولانا سید احمد صاحب امام معقولات سمجھے جاتے تھے — ان سب نے مل کر حضرت نانوتویؒ سے درخواست کی کہ تفسیر کی کوئی کتاب پڑھا دیں تاکہ قرآنی علوم ہم بھی سیکھیں۔ حالانکہ یہ سب ائمہ علوم تھے، مولانا یعقوبؒ تو صدر مدرس تھے — تو حضرت نے منظور فرمایا، چھتہ کی مسجد میں حضرتؒ نے درس شروع کر دیا۔ الٓمٓ سے شروع فرمایا تو حروف مقطعات پر کوئی دو اڑھائی گھنٹے تقریر فرمائی اور عجیب وغریب علوم و معارف ارشاد فرمائے اور یہ عجیب بےنفسی کا دور تھا کہ یہ سارے اساتذہ سبق پڑھ کر باہم کہنے لگے کہ بغیر تکرار کے یہ علوم محفوظ نہ ہوں گے لہٰذا تکرار کیا جاوے۔ نودرہ میں بیٹھ کر تکرار شروع ہو گیا۔ مولانا یعقوبؒ نے تقریر شروع کی، بیچ میں ایک جگہ رُکے، بات یاد نہیں رہی کسی اور کو بھی یاد نہ آئی، تو کہا میں مولانا سے پوچھ کر یہ تقریر کروں گا — تو صبح کی نماز پڑھ کر حضرت جب اپنے حجرہ میں آرہے تھے تو مولانا یعقوبؒ نے عرض کیا کہ حضرت تقریر کا فلاں حصہ یاد نہیں رہا، تو کھڑے کھڑے حضرتؒ نے تقریر شروع کی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ نہ لفظ اس عالم کے تھے نہ معنی اس عالم کے، ایک حرف بھی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا فرما رہے ہیں، تو عرض کیا کہ حضرت ذرا نازل ہو کر فرمایئے کہ کچھ سمجھ جاؤں، اب دوبارہ تقریر

شروع کی تو الفاظ سب سمجھ میں آئے مگر معانی نہیں، تو پھر عرض کیا کہ حضرت کچھ اور نازل فرمائیے، ہم وہاں تک نہیں پہنچے، تو فرمایا مولانا دوسرے وقت آیئے گا تو اس وقت کہوں گا ــــــ تو علوم میں اس وقت کتنا عروج ہوگا کہ ادھر کہہ رہے ہیں اور اُدھر سمجھ میں نہیں آرہا، تو علم کا یہ حال تھا اور عمل تو ظاہر ہے کہ...... !

راقم نے عرض کیا کہ حضرت ایسے علوم و معارف کی تسہیل اگر ہوجائے تو اس میں بہت سے فتنوں کا علاج ہے ــــــ فرمایا: "ہاں ہم نے مجلس معارف القرآن سے اسے شروع کیا اور ایک آدھ رسالہ چھاپا بھی، تسہیل بھی کی، لیکن یہ سلسلہ چلا نہیں، اسلئے کہ علماء کی توجہ نہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ مغلق مضامین ہیں، میں نے کہا کہ بھئی حمداللہ اور ملاحسن اور قاضی سمجھ لو تو ان علوم میں کیا دقت ہے، تو ارادہ نہیں سمجھنے کا ــــــ عرض کیا گیا کاش! مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے سوانح قاسمی میں علومِ قاسمی کا جو منصوبہ پیش کیا اُس کے مطابق کام کرنے کی کوئی صورت نکل آئے ــــــ حضرت قاری صاحب فرمانے لگے کہ وہ منصوبہ میں نے ہی مولانا گیلانی مرحوم کے سامنے رکھا تھا کہ آپ نے تین جلدوں میں سوانح لکھی مگر اصل سوانح تو حضرتؒ کے علوم ہیں، آپ اس پر تبصرہ کریں مگر افسوس کہ اس کام سے پہلے مولانا گیلانیؒ کی وفات ہوگئی، پانچ ہی صفحات مقدمہ کی شکل میں لکھ پائے تھے ــــــ الغرض بڑے عجیب وغریب علوم و حقائق ہیں۔

حضرت قاسم العلوم کی سراپا نور زندگی کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالنے کے بعد اب کا سوال خود حضرت حکیم الاسلام کی زندگی کے بارہ میں تھا، اور ڈرتے ڈرتے حضرت سے کچھ اپنی زندگی کے بارہ میں ارشاد فرمانے کی جرأت کی گئی۔

حضرت مسکرا کر فرمانے لگے ــــــ میری زندگی کیا جو میں بیان کروں، ہاں ایک تو پیدائش کا قصہ ہے جو مجھے یاد آیا اور جسے اپنے بڑوں سے میں نے سنا وہ یہ کہ میرے والد صاحب (مولانا حافظ محمد احمد مرحوم) کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی، جو شادی خود حضرت نانوتویؒ نے کرائی تھی۔ تو سارے بزرگوں بالخصوص حضرت شیخ الہندؒ کی یہ تمنا تھی کہ حضرت نانوتویؒ کی نسل چلے، تو دوسری شادی دیوبند میں کرائی

اس سے میرے تین بھائی مجھ سے پہلے پیدا ہوئے لیکن وہ کمسنی میں پیدا ہوتے ہی مر گئے۔ تو حضرت شیخ الہندؒ کو بڑی تڑپ تھی کہ کوئی زندگی کی اولاد ہو ــــ تو فتحپور ہسوہ میں ایک بزرگ تھے جو اولاد کے بارہ میں مستجاب الدعوات تھے۔ تو حضرت مولانا عبد السمیع صاحبؒ کو حضرت شیخ الہندؒ نے بھیجا کہ وہاں جا کر دعا کراؤ کہ مولانا حافظ احمد صاحب صاحب اولاد ہوں، وہ سفر کر کے گئے، جا کر عرض کیا کہ حضرت شیخ الہندؒ کا بھیجا ہوا ہوں اور یہ درخواست ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ رات بیچ میں ہے کل صبح اس کا جواب دوں گا۔ مولانا ان کے مکان میں ٹھہر گئے، صبح کو آئے اور خوش ہوئے، فرمایا کہ میں نے دعا کی اور جب تک منظور نہ کرائی سجدہ سے سر نہیں اٹھایا، اور مجھے وعدہ دیا گیا کہ حافظ صاحب کا لڑکا ہو گا جو حافظ اور قاری بھی ہو گا، مولوی بھی ہو گا اور حاجی بھی ہو گا ــــ مجھے یہ واقعہ اُس وقت معلوم ہُوا جب پہلا حج ہُوا، میں جا رہا تھا تو طلبہ، اساتذہ سب اسٹیشن تک گئے، اُس ٹانگے میں مولانا عبد السمیع صاحبؒ تھے اور میں تھا۔ مولاناؒ نے کہا کہ بھئی میں تجھے ایک واقعہ سُنانا چاہتا ہوں، اور یہ واقعہ سُناتے ہوئے فرمایا کہ جب تُو حافظِ قرآن ہو گیا تو میں نے کہا ایک جُز تو الحمد للہ قبول ہو گیا، پھر تُو نے قرأت کی تکمیل کی تو میں نے کہا دُوسرا جُز پورا ہُوا، پھر تُو نے فراغتِ تحصیل کی تکمیل کی تو میں نے کہا الحمد للہ اس بزرگ کے کشف کا تیسرا جُز بھی مکمل ہُوا، آج تُو حج کو جا رہا ہے تو فرمایا کہ خدا کا شکر ہے چوتھا جُز بھی پورا ہو رہا ہے۔

آگے چل کر حضرت قاری صاحب نے فرمایا ــــ میری پیدائش کے بعد کان میں اذان دینے کے لیے حضرت حاجی محمد عابد صاحب کو بلایا گیا جو اکابر دیوبند اور مشائخ میں سے تھے اُس وقت حیات تھے اور میری عمر کے آٹھ نو برس تک حیات رہے، ان کی صورت مجھے یاد ہے اور میں خدمت میں حاضر ہُوا کرتا تھا، اُنہوں نے کان میں اذان دی ــــ حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ کے صاحبزادے حافظ محمد یوسف صاحبؒ بھی اکابر بزرگوں میں سے تھے وہ دیوبند تشریف لائے، اُس وقت میری عمر مہینہ ڈیڑھ مہینہ تھی، تو میری دادی صاحبہ مرحومہ نے مجھے ان کے پاس بھیجا کہ اس کے لیے

دعا کریں۔ انہوں نے ہاتھ میں لے کر کہا کہ اسے میں لے چکا ہوں، دعا کیا کروں؟ قبول کر چکا ہوں۔ اب اللہ جانے اس کا کیا مطلب تھا۔ ظاہری صورت تو یہ پیش آئی کہ میری شادی رامپور میں ان کے خاندان میں ہوئی، اُن کی عزیز میرے گھر میں آئی۔ ممکن ہے یہ مطلب ہو یا کوئی اور ——— اس کے بعد جب مجھے الف، با، تا پڑھنے کے لیے بٹھلایا گیا تو بہت بڑا جلسہ دارالعلوم میں منعقد کیا گیا، دور دور سے مہمان آئے، تو مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ حضرت شیخ الہندؒ کے والد نے بسم اللہ کرائی اور مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے والد مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ نے ایک قصیدہ پڑھا جو بہت بڑے شاعر تھے۔ اس قصیدہ کا مجھے ایک مطلع یاد رہا، اور ایک مقطع ——— مطلع تو یہ تھا ؎

حبذا مکتب طیب کی مبارک تقریب
کچھ عجب طرح کا جلسہ کچھ عجب طرح کی سیر

اور مقطع یہ تھا جو تاریخ کو بھی سمیٹے تھا ؎

ربِّ یسّر جو کہا اس نے تو بے روئے ایاء
فضل تاریخ میں بول اٹھا کہ "تمم بالخیر"

تو بہر حال ان اکابر کے توجہات تھے۔ میں نے اپنی زندگی ایسی گذاری جیسے شہزادے ہوتے ہیں۔ ہر طرف حضرت نانوتویؒ کے نام لیوا، بڑے بڑے اکابر، حضرت شیخ الہندؒ وغیرہ حضرات بس اس طرح ناز برداری کرتے تھے جیسے کوئی بادشاہ زادہ ہو، اب بھی جو یہ حضرات کچھ لحاظ پاس کرتے ہیں، غلط فہمی میں نہیں کہ میرے اندر کوئی قابلیت ہے، اصل میں نسبت ہے ان بزرگوں کی، جس کی وجہ سے یہ سارا اکرام ہے ———

یہاں تک حضرت کہہ گئے تھے کہ رفیقِ مجلس قاری سعید الرحمٰن صاحب (راولپنڈی) نے ایک تلخ موضوع چھیڑ دیا ——— "مسلمانوں کے تنزل کے اسباب" ——— ایک ایسا موضوع جس پر بحث و فکر تو مدتوں سے ہو رہی ہے، مگر مرض کا علاج صرف نایاب اور بیش قیمت نسخوں کے معلوم کرنے سے کب ہو سکتا ہے جب تک مرض کے ازالہ کے لیے

عملی قدم نہ اٹھایا جائے۔ آج مسلمانوں کے تنزل کے اسباب و محرکات پر بلا مبالغہ ضخیم سے ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں مسلمانوں کی کوئی اہم دینی یا سماجی تقریب ان اسباب پر زورِ بیان صرف کرنے سے خالی نہیں جاتی منبر و محراب کو لیجئے یا میدانِ صحافت و انشاء وہ کون سا انداز ہے جو مسلمانوں کے جگانے اور مرض کی تلافی کرنے کے لیے اختیار نہیں کیا گیا ہے مگر جمود اور تعطل کی تہیں جمتی ہی جا رہی ہیں، اور اب جب سقوطِ بیت المقدس کے واقعہ ہائلہ اور قیامتِ صغریٰ نے ہماری خوابِ غفلت کو نہ جھنجھوڑا تو شاید صورِ اسرافیل ہی ہم غفلت شعاروں کو بیدار کر سکے ــــــ مگر ہائے وہ بیداری جو سوائے افسوس اور کفِ ندامت ملنے کے کسی کام کی ثابت نہ ہو سکے۔

یہی تصویر حضرت قاری صاحب مدظلہ کے سامنے آچکی ہوگی کہ جب انھوں نے سوال سنا تو ایک دلگداز سانس بھر کر خود ہی سوال دہرایا ــــــ "مسلمانوں کے تنزل کے اسباب ــــــ" اور پھر اہلِ سیاست پر ایک بھرپور نشتر چبھوتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"اس میں تو سیاسی لوگوں کی رائے معتبر ہے، ایک ملّا نے کی رائے کیا معتبر ہوگی ــــــ وہ سیاست جو مسلمانوں کے عروج و زوال کے خدائی قوانین سے بے خبر ہو کر بھی صرف مادیت کے گھمنڈ میں تاریخ کے ہر واقعہ پر رائے زنی اپنا ہی حق سمجھتی ہے حضرت قاری صاحب کے اس مختصر سے جملہ میں واقعی اس سیاست پر ایک بھرپور وار تھا ــــــ تنزل کے اسباب کا ذکر شروع کرتے ہوئے قاری صاحب نے اصول اور کلیات پر گفتگو کی بجائے اپنے معاشرہ کے چند جزئیات سے اس پر روشنی ڈالنا چاہی۔ ایک صاحبِ بصیرت شخصیت اور صاحبِ نظر کا یہی کام ہے کہ علمی اور نظری چیزوں کی بجائے وہ جزئیات اور عملی مثالیں سامنے رکھ دے جن سے نظریات اور کلیات تشکیل پذیر ہوتے ہیں، مگر انسانی فہم ہمیشہ عملی مثال اور نمونوں ہی سے زیادہ اثر پذیر ہوتا ہے۔ تنزل کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے حضرت نے نہ تو فلسفیانہ موشگافیوں کی آڑ میں پناہ لینا چاہی اور نہ پیچیدہ عقلی اور نظری طول و طویل محرکات کی فہرست مرتب فرمائی بلکہ موجودہ معاشرہ کی ایک ایسی دھندلی سی تصویر نگاہوں میں رکھ دی جس کے ساتھ ہم سب یہ موازنہ کر سکیں اور پھر خود

ہی سوچیں کہ اس سارے تنزل اور بربادی کے ذمہ دار اگر ہم خود نہیں تو وہ کون ہے ــــ؟
افسوس ان لوگوں کی بےبصیرتی پر جن کی نظر اسباب تنزل سے بحث کرتے ہوئے موجودہ مسلم معاشرہ کی بے اعتدالیوں پر تو نہیں جاتی، مگر رہ سہہ کر ان کی ساری غور و فکر، یورپی تہذیب اور مغرب کے سسکتے ہوئے فلسفۂ حیات کے گرد گھومنے لگتی ہے۔

حضرت حکیم الاسلام نے تنزل کے اسباب بیان کرتے ہوئے فرمایا ــــ کہ دو تین برس کا واقعہ ہے، میرٹھ کے ہندو کمشنر تھے، سانوال دارالعلوم آئے اور بہت متاثر ہوئے ــــ یہ جنگ ستمبر (۱۹۶۵ء) شروع ہونے سے ایک مہینہ پہلے کی بات ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ مولانا ملک کے حالات بہت نازک اور خراب ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں اخبارات سے تو ہم بھی یہی محسوس کرتے ہیں، کہا کوئی سبب بھی ہے اس پستی اور پریشانی کا؟ میں نے کہا ہاں سبب ہے۔ کہا کیا سبب ہے؟ میں نے کہا بالکل غیر ضروری ہے اس کا بتلانا، اس واسطے کہ میں ایک مذہبی آدمی ہوں، تو ہر حادثے کو مذہب کے نقطۂ نگاہ سے سوچتا ہوں ــــ آپ ہیں سیاسی اور برسر اقتدار انسان، آپ ہر چیز کو سیاسی نقطۂ نظر سے سوچتے ہیں۔ تو میرا نقطۂ نظر آپ پر اثر انداز نہیں ہوگا اس لیے بتانا غیر ضروری ہے۔ اس نے اصرار کیا کہ کچھ تو کہیئے گا! اور میرا منشا بھی یہی تھا کہ یہ زور دے تو بتاؤں ــــ تو میں نے کہا سن لیجئے میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتی نہ دولت سے چاہے ارب پتی بن جائے اور نہ کوئی قوم عددی اکثریت سے ترقی کر سکتی ہے کہ افراد اس کے پاس زیادہ ہوں اور نہ کوئی قوم محض سیاسی جوڑ توڑ سے ترقی کر سکتی ہے۔ دُنیا کی اقوام کردار اور اخلاق سے ترقی کرتی ہیں تو اس وقت ہمارے ملک کی اخلاقی گراوٹ انتہا کو پہنچ چکی ہے، اس لیے حالات نازک نہ ہوں گے تو کیا ہوگا؟ کہنے لگے بالکل صحیح بات ہے لیکن یہ تو ایک اصول بیان کیا آپ نے، اس کی مثال بھی ہے؟ میں نے کہا مثال کے طور پر پہلی بات یہ کہ آج سے چالیس پچاس برس پہلے جب ایک ہندو عورت باہر پھرتی تھی تو گز بھر کا گھونگھٹ اس کے منہ پر ہوتا اور حیاء کی وجہ سے بچتی ہوئی چلتی تھی، اس وقت عورت نہ صرف گھونگھٹ سے باہر ہے بلکہ

لباس سے بھی، اور اس سے بھی ایک قدم بڑھ کر آپے سے باہر ہو گئی ہے، سو چتا ہوں کہ ایسی عورتوں کی کوکھ سے جو اولاد پیدا ہو گی کیا اُس میں کوئی حیا اور شرم و غیرت ہو گی؟ ــــــ

دوسری بات یہ ہے کہ ریلوں میں ہمیں سفر کرنے کی نوبت آتی ہے، تو سکولوں اور کالجوں کے نوجوان لڑکے کسی ڈبہ میں اگر آجاتے ہیں تو ہمیں یہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ آدمی ہے یا جانور۔ اس قدر بیہودہ اور رکیک حرکتیں کرتے ہیں کہ کوئی بھلا آدمی نہ کر سکے، اگر ان لوگوں کے کندھوں پر ملک کا بار آگیا تو سوائے بد اخلاقی کے یہ اور کیا پھیلائیں گے؟ ــــــ

تیسری چیز یہ ہے کہ ریلوں میں سفر کرتے دیکھا کہ جہاں کہیں شوگر ملز آیا، گاڑیاں گنوں سے بھری کھڑی ہیں، سو پچاس مسافر اُترے کسی نے سو گنے، کسی نے دو سو گنے، کسی نے پچاس، کسی نے گٹھڑی باندھ لی اور قطعاً انہیں احساس نہیں کہ یہ چیز ہماری ہے یا غیر کی، تو اگر ملک کا بار ان کندھوں پر آیا تو سوائے لوٹ کھسوٹ کے یہ کیا کریں گے؟ ــــــ

چوتھی بات یہ ہے کہ تاجروں کا طبقہ ہے اور تجارت پر ملک کا دارومدار ہے، اس طبقہ میں بلیک الگ ہے، نفع خوری الگ ہے، ذخیرہ اندوزی الگ، تو جب تاجروں میں خیانت آجائے تو ملک کی برقراری کیسے ہو سکتی ہے؟ ــــــ

پانچویں بات یہ ہے کہ جب حُکام کو دیکھا جائے تو رشوت ستانی، جانبداری، اقربا پروری، یہ ایک عام چیز بن گئی ہے، اور رشوت تو ایسا ہے جیسا حق ہو گیا، تو جب حُکام میں خیانت آجائے تو بھلا وہ ملک کیسے برقرار رہے گا؟ ــــــ

میں نے کہا یہ حالات ہیں ــــــ کہنے لگا بالکل بجا ہے ــــــ تو میں نے کہا کہ پھر گورنمنٹ کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے ملک کی اخلاقی حالت درست کرے، آپ دولت اور بیرونی کرنسی جمع کرنے کی فکر میں رہتے ہیں لیکن اس کی فکر کسی کو نہیں، کہنے لگا کہ یہ ناممکن ہے کہ اخلاقی حالت درست ہو سکے۔ میں نے کہا کیوں؟ کہا حکومت

یہ نہیں چاہے گی، کیونکہ اخلاق درست ہوتے ہیں مذہبی تعلیم سے، اور حکومت سیکولر یعنی لامذہب ہے، وہ آ نہیں سکتی بیچ میں ——— تو میں نے کہا کہ میرے اور آپ کے نقطۂ نظر میں یہاں سے فرق ہو گیا، آپ کے نزدیک سیکولر کا معنٰی لامذہبیت ہے اور میرے نزدیک سیکولر کا معنٰی ہمہ مذہبی حکومت ہے کہ ہر مذہب حکمران ہو، اور گورنمنٹ کا فرض ہے کہ ہر طبقے کو مجبور کرے کہ وہ اپنی مذہبی تعلیم پائے تا کہ اس کا اخلاق صحیح ہو، کہنے لگا یہ ہو نہیں سکتا، میں نے کہا آپ خود چاہتے ہیں کہ اس ملک میں چور اور ڈاکو پیدا ہوں ——— کہنے لگا آپ جو چاہیں مطلب نکال دیں، باقی یہ ہو گا نہیں۔ میں نے کہا ایک تدبیر میں بتلا دوں، کہا کیا؟ میں نے کہا ملک ہمارے سپرد کر دیجئے، سب حالات درست کر دیں گے ——— اس پر وہ بہت ہنسا ——— تو بہر حال ملک اور قوم کی ترقی ہوتی ہے اخلاق و کردار سے، جب یہ ختم ہو جائے تو سب سے بڑا تنزّل کا سبب یہی ہے ———

راقم السطور نے کہا حضرت! ہمارے تنزّل میں مغربیت کا بھی حصہ ہے؟ فرمایا اس سے بھی وہی بات نکلتی ہے کہ مغربی اخلاق اختیار کیے جائیں، اسلامی اخلاق چھوڑ دیں تعلیم مغربی غالب ہو اور دینی تعلیم مغلوب۔ دینی افراد مغلوب ہوں اور بے دین افراد غالب ہوں، بنیاد سب کی ایک ہی ہے کہ مذہب سے رشتہ توڑ دو ———

اب اس کے بعد اصلاح کی کیا صورت ہو؟ تو حضرت نے اپنے تجربہ اور بصیرت کی بناء پر فرمایا کہ آپ حضرات بحمد اللہ مذہب کی خدمت کر رہے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ لاکھوں کروڑوں آدمی جو اس لپیٹ میں آ گئے اُن کا دین درست ہو رہا ہے لیکن برسر اقتدار طبقہ بالکل دوسرے رنگ میں ہے مگر اس میں بھی میری ایک رائے ہے کہ کسی سے تقابل کی ٹھان کر کسی کی اصلاح نہیں ہو سکتی، آپ چاہیں تو ایجی ٹیشن کریں یا مقابل بن کر اصلاح کرنا چاہیں، یہ ہو نہیں سکتا۔ اس کی صورت تو یہ ہے کہ مستغنیانہ طریق سے ان لوگوں کے دلوں میں کچھ چیزیں ڈالی جائیں اور اپنا غرض مطلب کچھ نہ رکھا جائے، نہ عہدہ نہ دولت، بلکہ انہیں آپ یقین دلا دیں کہ اقتدار تمہارا رہے گا

اور ہم بھی اس کے ساتھ تعاون کریں گے، ہم اقتدار نہیں چاہتے مگر اتنی بات کرو اور ایسا کرنا ملک اور قوم دونوں کے لیے نافع، ورنہ اس سے ملک اور قوم اور تمہارے اقتدار سب کو خطرہ ہے، اس انداز سے کام کرنا چاہیئے۔ سیاسی رنگ کے لوگ سیاسی انداز سے اور دینی رنگ کے لوگ دینی انداز سے جب تک خواص کو متوجہ نہیں کریں گے کام نہیں چلے گا۔ اب عوام کی طرف توجہ کی جاتی ہے اور ایجی ٹیشن کی صورت اختیار ہو، جس کا مطلب یہ ہے کہ اشتعال میں آجائے حکومت، تو وہ بھی پھر چڑھ پر آتی ہے۔ تو نہ صرف یہ کہ وہ آپ کی نہیں مانے گی بلکہ گرانے کی کوشش کرے گی۔ تو اصلاحی رنگ میں چند افراد اپنی زندگی اس مقصد کے لیے وقف کر دیں اور جو اُوپر کا طبقہ ہے ان میں رسوخ حاصل کر کے اس کے کانوں میں یہ باتیں ڈالی جائیں اور اس انداز سے کہ فلاں بات تیرے مفاد کے خلاف ہے۔

حضرت! پاکستان کے علماء کے لیے کوئی مخصوص پیغام؟

پیغام کا مجھے حق بھی نہیں، غیر ملک کا آدمی کیا پیغام دے، مگر یہ میں نے صبح کی مجلس میں بھی تفصیل سے عرض کیا تھا کہ جو مفکر قسم کے چند علماء ہیں اور با اثر بھی ہیں وہ ایک یادداشت کے طور پر کچھ بنیادی چیزیں حکومت کو پیش کریں اور اس پر یہ ظاہر کر دیں کہ ہم آپ کی حکومت کو اپنی حکومت سمجھتے ہیں، ہمارا پورا تعاون رہے گا، تقویت اور نصرت کریں گے، مگر اتنی چیز ہے کہ دین کے لیے اور ملک کے بقاء کی خاطر فلاں فلاں کام کرو، اگر یہ نہیں ہوگا تو ملک و قوم میں خرابی ہوگی اور آپ کی بنیاد بھی اسی سے قائم ہے ——— اس یادداشت اور ملاقاتوں میں جزئیات کو پہلے نہ چھیڑا جائے بلکہ اصولی اور کُلّی رنگ میں، یہ لوگ کچھ مانوس ہو جائیں تو پھر آہستہ آہستہ جزئیات سُود وغیرہ جیسے مسائل کان میں ڈال دیئے جائیں، مگر پہلے اربابِ اقتدار کے ذہن کو اصول میں لے آیا جائے ——— میں تو واقعی اگر یہاں کا باشندہ ہوتا اور باریابی کا موقع مل جاتا تو صدر ایوب سے کہتا کہ مجھے آپ اپنا خادم اور خیرخواہ سمجھیں، مگر دو باتیں ہیں، ایک تو یہ کہ تعلیم قرآن اور دینی علوم کو عام قرار دیں، اور یہ کام مستند علماء سے کرائیے، ہر اُس عالم کو عالم نہ سمجھیں جو علم کا لبادہ

پہن کر آئے اور علم اس کا محض مطالعہ یا اخبار بینی کا ہو، نہ اس کے پاس سند ہو نہ استناد، نہ بزرگوں کے پاس رہ کر اس نے علم حاصل کیا ہو، ایسے علماء کو اختیار کر کے ان سے ہر کام میں مشورہ نہ کریں، ہر مُدعی علم کو عالم نہ سمجھیں بلکہ اس کی تلاش کر کے کام کریں۔

کوئی طبیب بھی اگر ہوتا ہے تو یہی نہیں کہ مریض ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں جا کر ہاتھ دے دے گا اور نبض دکھلا دے گا۔ بلکہ وہ پہلے ڈھونڈھتا ہے کہ طبیب طبیہ کالج کا فارغ ہے یا کہاں کا؟ اس کا بورڈ یا سند دیکھتے ہیں، اُس کے پاس آنے والے مریضوں کی اکثریت کو دیکھتے ہیں کہ شفایاب ہو کر جاتے ہیں یا نہیں۔ تو جان بچانے کے لیے تو آپ انتخاب کریں تو ایمان بچانے کے لیے کیا ضروری نہیں ہے کہ صالحین، روحانی اطباء، صحیح علماء کا انتخاب کیا جائے۔

اور دُوسری بات اُن سے یہ عرض کرتا کہ آپ معروفات کو یکدم جاری نہیں کرتے تو نہ سہی مگر کم از کم منکرات کا راستہ تو بند کر دیں، اس سے اخلاق میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مقدم چیز ہے دفع مضرت اور جلبِ منفعت موٴخر ہے۔ اور دفع مضرت میں یہ ہے کہ کم از کم پہلے وہ منکرات تو ختم کر دیں جو عقلی منکرات ہیں، اور دُنیا کی ہر قوم اسے بُرا سمجھتی ہے۔ اس کے بعد منکراتِ شرعیہ کو لیں، جب اس سے فارغ ہوں تو معروفاتِ شرعیہ کو لیں مگر کم از کم منکرات تو ختم کر دیں، اور یہ بھی تدریجاً سہی، رفتہ رفتہ، اس لیے کہ آپ کی مجبوریاں ہیں، آپ کے روابط اور مراسم سیاسی اُن اقوام سے ہیں کہ جن کے ہاں یہ منکرات جزوِ تمدن ہیں۔ تو اگر یکدم آپ کامیاب نہ ہوں تو راستہ تو منکرات مٹانے کا ڈال دیں ـــــ دُوسری چیز یہ عرض کرتا کہ خلفاء راشدین یا سلاطینِ عادل جو گنے چنے ہیں اُن کے علاوہ عامۃً وہی سلاطین ہیں جنہیں اپنے اقتدار کی فکر ہے۔ لیکن تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ جس بادشاہ کے ساتھ کوئی عالمِ ربانی لگ گیا اُس کی حکومت نہایت اعلیٰ گذری، حالانکہ وہ عالم عہدہ دار نہیں تھا ـــــ ہارون الرشید کے ساتھ امام ابو یوسفؒ لگے ہوئے تھے ـــــ اورنگزیب عالمگیر علماء سے مشورہ لیتا رہا ـــــ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے بارہ میں مرحوم نوابزادہ لیاقت علی خان نے مجھ سے کہا کہ جب ہم

کسی مسئلہ میں اُلجھ جاتے ہیں تو مولانا عثمانی سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔
تو جب آپ اسلام کے نام پر حکومت کر رہے ہیں اور ملک اسلام کا ہے تو اسلام کے حاملین سے کب صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے۔ تو جو قدم اٹھائیں تو کم از کم دو چار علماء کی بات تو سُن لیا کریں، آپ انہیں نہ جاگیر دیں، نہ عُہدہ، نہ وہ طلب کریں گے ــــــ"

حضرت حکیم الاسلام اصلاحِ احوال کی تجویز پر اپنی بصیرت اور فراستِ ایمانی کی روشنی میں گفتگو فرما رہے تھے، اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر عصرِ حاضر کی اسلامی قیادت مصطفیٰ کمال کے نقشِ قدم پر اسلام کو فرسودہ اور زمانہ کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہونے کا عقیدہ دل و دماغ میں راسخ کر چکی ہو، دین کی ترجمانی کے لیے کسی صلاحیت اور استحقاق کو اجارہ داری سمجھا جا رہا ہو اور جب رعایا کی اکثریت بھی اعجاب رائی (اپنی رائے اور گھمنڈ پر غرور) میں مبتلا ہو چکی ہو، پھر جب خوشامدی، خود غرض اور لالچی قسم کے علماء نے حکام کے ساتھ روابط کو رعیت کی نگاہ میں دین فروشی کے ہم معنی سمجھ لیا ہو اور خالص مصلحانہ کوششوں پر بھی سیاست کا رنگ چڑھ گیا ہو تو حکام اور اہلِ دین کے درمیان خلیج دور ہونے کے لیے اور دینی اقدار کی خاطر اس خلاء کو پاٹنے میں حضرت قاری صاحب مدظلہ کی یہ خیر خواہانہ تجویز کس حد تک مفید ثابت ہو سکتی ہے؟ ــــ
اس راہ کی مشکلات کو ایک خاص رُخ سے پیش کرتے ہوئے میں نے عرض کیا، حضرت! جب حکام یہ سمجھ بیٹھے ہوں کہ اسلام عصرِ حاضر کے ساتھ چل ہی نہیں سکتا تو انہیں حاملینِ اسلام کی اہمیت اور ضرورت کا احساس ہو جانا کب ممکن ہے؟

حضرت نے فرمایا ــــ ان کی یہ غلط فہمی دور کر دینی چاہیئے کہ اسلام موجودہ دور کی ترقیات میں حارج ہے بلکہ ان کے دل میں یہ ڈال دینا چاہیئے کہ زمانہ کی کوئی چیز بھی جو کسی درجہ میں واقعی صحیح اور کار آمد ہو، اسلام اُس کا مخالف نہیں مگر وہ منکرات جو دُنیا کی ہر قوم میں منکراتِ عقلی ہیں، (مثلاً) زنا کاری، جوا، سُود، شراب نوشی قسم کی چیزیں جن کی قباحت مسلماتِ عقلیہ میں سے ہے، ان چیزوں کو ترقی کا معیار بنا کر اسے اسلام

کے ساتھ نہیں جوڑا جاسکتا۔ البتہ جو چیزیں منکر نہیں ہیں اور اخلاق و معاشرت پر اثر انداز نہیں ہوتیں، اسلام کبھی بھی اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ سیاسی اور ملکی تدابیر میں ہمیشہ توسع سے کام لیا گیا ہے، اور جو اجتہادی امور ہیں اس کی اسلام میں گنجائش ہے اور اُن کی اچھائی بُرائی کو جانچنے کے لیے ایسے لوگوں کو مشیر بنائیں جنھیں فقہ اور شریعت پر عبور ہو —— پھر قاری صاحب نے فرمایا: مقصد اصلاحِ حال ہے اور یہ کہ حالات سُدھر جائیں، اخلاص اور جذبۂ خیر خواہی کے ساتھ ایسا راستہ اختیار کیا جائے جو ایک دُوسرے کو دور کرنے کی بجائے نزدیک کر دے ——

—— رات ڈھل رہی تھی، وقت تیزی کے ساتھ دل و دماغ پر اپنے حسین نقوش ثبت کرتے ہوئے گذر رہا تھا۔ ایسے نقوش جو مجلس میں چلنے والے ٹیپ ریکاڈر کے فیتہ پر ثبت ہونے والے ارتعاشی اور صوتی اثرات سے کہیں زیادہ پائیدار اور دیرپا تھے۔ وقت بجائے خود ایک ایسی ریکارڈنگ مشین ہے جو ایک ایسے نامۂ اعمال کے اوراق میں سب کچھ محفوظ کر رہی ہے جس کی پنہائیوں اور گہرائیوں پر "الساعۃ" اور "زلزلۃ الساعۃ" کی ہلاکت انگیزیاں بھی اثر انداز نہ ہوسکیں گی۔ اور جب کرتا دھرتا سب کچھ مجسّم بن کر سامنے آجائے تو پکارنے والا پکار اٹھے گا: مالھذا الکتٰب لایغادر صغیرۃً ولا کبیرۃً الا احصٰھا۔

ایسی صحبتیں کب بار بار نصیب ہوتی ہیں۔ حضرت کو مزید تکلیف دینا دل و دماغ پر کتنا ہی گراں گذر رہا تھا مگر بے اختیار جی چاہا کہ اس مجلسِ سعید میں کچھ ذکر الحق اور دارالعلوم حقانیہ کا بھی آجائے — اور پوچھ بیٹھا کہ الحق کے لیے کون سا طریقۂ کار پسندیدہ ہے؟

فرمایا "وہی پالیسی جو میں نے عرض کر دی، توافق سے کام چلے گا تقابل سے نہیں، تعمیری انداز میں اصلاح کی سعی، تقابل کے انداز سے آپ کی باتیں کسی مخالف پر اثر انداز نہیں ہو سکیں گی ——"

حضرت! جب الحاد اور بے دینی بالکل غالب ہو چکی ہے، پھر کیسی موافقت؟

برجستہ فرمایا —— "اسی کی اصلاح کے لیے تو توافق کی ضرورت ہے اور یہ توافق الحاد اور

بے دینی سے نہیں ہو گا اُن افراد سے تو افق ہو گا تاکہ ان لوگوں کو الحاد سے ہٹا دیا جائے ــــ"

حضرت! کچھ لوگوں پر تو مایوسی کی فضا چھا گئی ہے، اصلاح کے مساعی بار آور معلوم نہیں ہو رہے ــــ؟ حضرت قاری صاحب مدظلہٗ نے فرمایا ــــ "کام کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ مایوس نہ ہو جائیے، آپ تو ورثۃ انبیاء ہیں، انبیاء کبھی مایوس نہ ہوئے، جب اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ مجھے اس قوم کو عذاب دینا ہے، جب حضرت نوح علیہ السلام نے بددعا کی کہ کسی کافر کو بھی زندہ نہ چھوڑنا، ورنہ ــــ ساڑھے نو سو برس تک نصیحت فرماتے رہے، تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ــــ"

ــــ دیگر بلادِ اسلامیہ تو دہریت، مغربیت اور بے دینی کی لپیٹ میں آ ہی گئے اور مغلوب ہو گئے تو ایسے حالات میں اہلِ دین کب تک شکستہ خاطر نہ ہوں گے ــــ؟

حضرت نے جواب دیا کہ ــــ "ایسی چیزوں کو تو ملک کے سامنے بطور نظیر پیش کیا جانا چاہیئے کہ آج بلادِ اسلامیہ باوجود قوت کے تباہ ہو رہے ہیں، اس لیے کہ انہوں نے اسلامی اخوت اور مسلمانوں کے عام اتحاد کو خیرباد کہہ دیا، وطنیت کو آگے رکھا، اسلامیت کو پیچھے رکھا، تو اتنی نظیروں کے ہوتے ہوئے بھی تمہاری آنکھ نہ کھلے تو تباہی سے کیسے بچ سکو گے ــــ؟"

حضرت! قوم اور ملک کی اصلاح تو اربابِ عزیمت اور اولوالعزم لوگوں کا کام ہے ہم جیسے عامیوں کے لیے بھی کچھ ارشاد ہو ــــ فرمایا ــــ "حضورؐ نے ورثہ چھوڑا ہے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کا۔ فرمایا تم جب تک انہیں پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو سکو گے۔ ترکت فیکم الثقلین لن تضلوا بعدی ابداً ان تمسکتم بھا ــــ"

حضرت! اس مدرسہ دارالعلوم حقانیہ کے بارہ میں کوئی نصیحت ــــ؟

فرمایا ــــ "آپ لوگ اختیار کیے ہوئے ہیں، بحمداللہ مدرسہ چل رہا ہے، غالب ہو رہا ہے، مولانا موجود ہیں، ہر وقت قال اللہ اور قال الرسولؐ ہے، اس سے زیادہ کیا روحانیت اور معنویت ہو گی، خدا نے مدرسہ کو ایسے بزرگ اور اساتذہ دیئے ہیں جو بحمداللہ دینِ مجسم ہیں ــــ"

حضرت! مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کی رفتارِ ترقی کیا ہے ، اور بجٹ ـــــ ؟

فرمایا ـــــ ”انقلاب کے وقت سوا لاکھ تھا اور اب ساڑھے دس لاکھ ہے، انقلاب کے بعد کچھ فکر بھی تھا کہ کیسے چلے گا۔ مگر اللہ نے بڑھایا اور تمام شعبے بڑھتے ہی گئے، پہلے آٹھ شعبے تھے اب چوبیس ۲۴ شعبے ہیں، اسی طرح پہلے اساتذہ ۳۸ تھے اب ۷۰ کے قریب ہیں۔ اسی طرح عمارات دگنی تگنی ہو گئی ہیں، اللہ تعالیٰ کام کر رہا ہے، طلبہ ڈیڑھ ہزار کے قریب ہیں ـــ“

آخری سوال تھا کہ حضرت! نئی پود سے مستقبل میں دارالعلوم دیوبند کے لیے کیسی توقعات ہیں ـــ؟ فرمایا ـــ ”اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ اس دور کی سب سے بڑی مشکل قحط الرجال کی ہے، مگر ہمیں توقع ہے کہ اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے والے نئی پود میں بھی ہیں، چاہے گنے چنے ہی ہوں، مگر اب بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں ـــــ“

دورانِ گفتگو ایک دفعہ حضرت نے موجودہ زمانہ کی سیاست پر بھی اپنی رائے ظاہر کی اور کہا کہ میرا تجربہ یہ ہے کہ اس زمانہ کی سیاست اور دین میں بیر ہے، اس سیاست اور ڈپلومیسی کا بنیادی پتھر ہے نفاق گندم نما جو فروشی، اس میں دین باقی نہیں رہ سکتا، وہ تو صرف اسلامی سیاست ہے جو دین کے ساتھ چلتی ہے' اور وہ تو جوہر ہے اسلام کا ـــ اور ایک ہے عصری سیاست' یہ بالکل تقابل پر ہے دین کے ـــــ جو چیزیں دین میں حرام ہیں اس کے ہاں واجب ہیں ـــ جو یہاں محمود ہیں وہ وہاں مذموم ـــ اور یہ صرف میرا مقولہ نہیں بلکہ مولانا اصغر حسین صاحب مرحوم نے بھی یہی الفاظ ارشاد فرمائے کہ ـــــ

”مولوی صاحب آج کی سیاست اور دیانت میں بیر ہے ـــ“

ـــــ اب رات کا ایک بج چکا تھا اور بادلِ نخواستہ اس پُر لطف محفل کی بساط لپیٹنی ہی پڑی ـــــ

الحق

شوال / ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ

◎

علامہ شمس الحق افغانی رحمہ اللہ

وادریغا۔ کہ ابھی ہم حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیّب صاحب قاسمیؒ کے ماتم سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ ۱۶ اگست منگل کی شام کو عین غروبِ آفتاب کے ساتھ ہم نے علم و معرفت کا ایک اور آفتاب بھی سپردِ خاک کر دیا۔ ایک کے غروب سے کائناتِ رنگ و بو پر تاریکی چھا گئی تو دوسرے کے پنہاں ہونے سے کائناتِ علم و فضل میں ظلمت آگئی ——— علامۂ یگانہ، محقق زمانہ، متکلم اسلام شمس العلوم والمعارف مولانا شمس الحق افغانی قدس اللہ سرہ العزیز واصل بحق ہوئے جو پچھلے دو ایک سال سے صاحب فراش تھے۔ ۱۶ اگست صبح نو بجے سانحۂ ارتحال پیش آیا، نماز جنازہ اسی دن ۶ بجے شام ان کے گاؤں ترنگ زئی تحصیل چارسدہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ نے پڑھائی، اور نماز کے بعد حاضرین سے جس میں بڑی تعداد علماء و صلحاء کی کی تھی علامہ مرحوم کے فضائل و مناقب پر مختصر خطاب فرمایا۔ دارالعلوم حقانیہ سے بڑی تعداد میں اساتذہ و طلباء نے بھی خصوصی بسوں کا انتظام کر کے جنازہ میں شرکت کی سعادت حاصل کی۔ غروبِ آفتاب کے وقت اس علامۂ دوران کی تدفین عمل میں آئی، شام کی ڈھلنے والی تاریکیوں میں لوگ واپس ہو رہے تھے تو اربابِ صدق و صفا اور اصحابِ علم و فضل کے اس قدر تیزی سے رخصتِ سفر باندھنے پر کتنے اصحاب درد تھے جن کے دل ڈوبتے جا رہے تھے اور زبانِ حال سے کوئی کہہ رہا تھا ؎

اٹھے جاتے ہیں اب اس بزم سے اربابِ نظر گھٹتے جاتے ہیں میرے دل کے بڑھانے والے

مولانا کی ولادت[1]، ۲ رمضان المبارک ۱۳۱۸ھ مطابق ۵ ستمبر ۱۹۰۱ء ایک علمی خاندان میں ہوئی

~~[1] مقام پیدائش ترنگ زئی تحصیل چارسدہ ضلع پشاور~~

[1] مقام پیدائش ترنگ زئی تحصیل چارسدہ ضلع پشاور۔ (مرتب)

نام شمس القمر رکھا گیا جو بعد میں شمس الحق سے تبدیل ہوا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد سرحد و افغانستان کے مشاہیر علم و فضل سے علوم و فنون کی تکمیل کی، ۱۹۲۰ء میں دار العلوم دیوبند پہنچکر ۱۹۲۱ء میں علامۃ العصر سید انور شاہ کشمیریؒ سے دورہ حدیث پڑھ کر سندِ فراغ حاصل کی۔ پھر دار العلوم دیوبند کی طرف سے ہندوستان کے ارتدادی فتنوں کی سرکوبی میں لگ گئے اور شدھی تحریک کی روک تھام میں بھرپور حصہ لیا۔ وہ ابتداء سے ہی علمی میدان کے شہسوار تھے علم و فضل کے ہتھیار سے آریہ سماج کے مشہور مناظرین کو بڑے بڑے اجتماعات میں عبرتناک شکست دی اس کامیابی پر ان کے اکابر اساتذہ نے دلی مسرتوں کا اظہار کیا اور دل کھول کر دعائیں دیں۔

اس کے بعد برِ صغیر کے تقریباً ایک درجن علمی اداروں، مدارس اور جامعات[1] میں اسلامی علوم و فنون کی تدریس میں منہمک رہے جن میں سرِ فہرست دار العلوم دیوبند ہے جہاں آپ نے تفسیر کی اعلیٰ کتابیں پڑھائیں ۱۹۳۹ء میں آپ کو ریاست ہائے متحدہ بلوچستان قلات کی وزارتِ معارف کی پیشکش کی گئی اور اکابر کے مشورہ پر قضا و تعلیم کی وزارت کا قلمدان سنبھالا۔ پورے گیارہ سال آپ اس منصب پر فائز رہے۔ اس دور کے نظام عدل و قضا اور عدالتی قوانین سے متعلق آپ کی وابستگی کے نتیجہ میں دنیائے علم کو "معین القضاۃ والمفتیین" کی شکل میں قضاء و افتاء سے متعلق فقہ اسلامی کے پیچیدہ اصول و قواعد کا مجموعہ ملا جس نے اہلِ علم سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ اسلام کے ضابطۂ دیوانی و فوجداری پر بھی آپ نے گرانمایہ کام کیا۔ انگریز

---

[1] ۱۳۴۱ھ میں مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی میں صدر مدرس مقرر ہوئے، ۱۳۴۲ھ میں مدرسہ ارشاد العلوم لاڑکانہ سندھ، اسی طرح ۱۳۴۴ھ میں مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ لاہور، ۱۳۵۰ھ میں دار الفیوض ہاشمیہ سجاول سندھ میں صدارتِ تدریس کے اہم عہدہ پر فائز رہے، ۱۳۵۷ھ میں دار العلوم دیوبند کے درجہ علیا کے استاذ و شیخ التفسیر رہے ۱۹۴۴ء میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے صدر مدرس رہے ۱۹۶۲ء میں شیخ الحدیث والتفسیر اکیڈمی علوم اسلامیہ کوئٹہ کے منصب پر قائم کیا۔ ۱۹۶۳ء میں جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں شیخ التفسیر مقرر ہوئے آپکی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف کی تعداد تقریباً ۲۱ ہے سلسلہ قادریہ میں آپ اپنے والد سے بیعت ہوئے اور مولانا غلام محمد دین پوری سے کسبِ فیض کرتے رہے حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت ہوئے اور مفتی محمد حسنؒ سے تکمیل کر کے خلافت حاصل کی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "مشاہیر علماء دیوبند" وغیرہ (مرتب)

کے چھوڑے ہوئے عدالتی نظام کے سائے سمٹنے کی بجائے پھیلتے چلے گئے اور ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ کے قیام کے ساتھ ان کے زیرِ نظم علاقے پر بھی اس نظام کے منحوس سائے چھاگئے اور شرعی قوانین کی بالادستی قائم نہ رہ سکی تو آپ نے استعفاء دے دیا کہ کسی شرعی عدالت پر رائج الوقت عدالتوں کی برتری کو شریعت کے وقار اور شان کے خلاف سمجھتے تھے۔

تقسیمِ ہند کے بعد جب دیوبند کے راستے مسدود ہوگئے اور بانی دارالعلوم حقانیہ حضرۃ شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہٗ کو بامرِ مجبوری گھر ٹھہرنا پڑا تو حضرت مرحوم نے اپنے ریاستی فرائض قضا و تعلیم میں شریک کرانے کے لیے مولانا موصوف کو باصرار بلوچستان بلانا چاہا، بات چل رہی تھی، اُدھر حق تعالیٰ نے مولانا مدظلہٗ سے دارالعلوم حقانیہ کی شکل میں ایک عظیم کام لینا تھا شاید اس لیے یہ دعوت قبول نہ ہو سکی۔ ناچیز کے علاوہ بہت سے حضرات کو یہ حسرت رہی کہ کاش علامہ مرحوم بھی (بلوچستان کی مصروفیت کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو) درس و تدریس کا روائتی سلسلہ اپنے مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند اور اس کے بعد ایسے ہی اہم دینی مدارس میں جاری رکھے ہوتے اور ریاستوں اور عصری جامعات کے اعلیٰ سے اعلیٰ مناصب کے دینی خدمات کی بجائے کسی مدرسہ کے دارالحدیث یا خانقاہ کی مسندِ ارشاد ہی پر متمکن رہتے تو ان کے تعداد افادہ کا حلقہ اور فیض و استفادہ کا دائرہ بہت ہمہ گیر اور عالمگیر ہوتا اور وہ تلامذہ اور مستفیدین کے اعتبار سے اپنے وقت کے علامہ کشمیری اور علامہ عثمانی بن کر دنیا سے اُٹھتے کہ ان کی عبقری شخصیت اور علوم کی جامعیت کے شایانِ شان یہی تھا۔

بلوچستان اور بہاولپور کے دورافتادہ اور تنگ بندھی ذمہ داریوں اور محدود فرائض نے ان کے علم و فضل کے بحرِ ذخار کو ایک گونہ بند لگا دیا مگر پھر بھی تقریر و خطابت تصنیف و تالیف بالخصوص عصرِ حاضر کے جدید مسائل پر قومی اور عصری کمیٹیوں اور مجالس مذاکرہ کی شکل میں آپ نے علم اور دین کی عظیم الشان خدمات سرانجام دیں۔ شاید اس میں بھی اللہ کی یہی حکمت تھی کہ آپ مدارس کے شبانہ روز تدریسی بندھنوں سے آزاد رہ کر ان دائروں میں اسلام کی ترجمانی کر سکیں، جو ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی اور اس لحاظ سے آپ کا مقام عصرِ حاضر کے علماء میں بہت ممتاز تھا کہ اسلامی مباحث و علوم کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے آپ عصرِ حاضر کے

اٹھائے گئے شبہات پر سیر حاصل روشنی ڈالتے اور عہد جدید کے اذہان اور اس دور کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے۔ ہر تحریر و تقریر کا محور اور مرکزی نقطہ اسلامی مباحث وعقائد کی حقانیت کو کلامی انداز میں اجاگر کرنا اور دلنشین کرانا ہوتا، وہ شریعت اسلامیہ کے لازوال عقائد و اصول کو نہایت معقول اور محققانہ انداز میں پیش فرماتے مغرب اور مغربیت پر ان کی نشتر زنی بڑی جاندار ہوتی۔ وہ اس ضمن میں جب مسٹر اور مُلا کا موازنہ کرتے تو عجیب نکتہ آفرینی فرماتے کہ مجمع متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا۔ ان کا اندازِ درس بھی محاضرات اور لیکچرز کا ہوتا جسے ان کے تلامذہ نوٹ کرتے، وہ کسی بھی مشکل اور اہم موضوع کے عجیب عجیب عنوانات قائم کر کے تحلیل و تجزیہ کرتے۔

الحق کو سب سے زیادہ یہ شرف حاصل ہوا کہ اس نے اپنے آغاز ہی سے علامہ مرحوم کے علوم و مقالات کو پہلی بار شائع کیا۔ حضرت علامہؒ کے کثیر تصانیف و رسائل کا اکثر حصہ اولاً الحق میں شائع ہوتا رہا، اور اس طرح مولانا کے علمی فیوضات سے بیرونی دُنیا کو استفادہ و تعارف کا موقع ملا۔ اُن کی مادری زبان پشتو تھی مگر اُردو میں نہایت شُستہ تقریر فرماتے تحریر کے ساتھ تقریر کا ایسا ملکہ کم ہی پشتون علماء کو حاصل ہوا۔ وہ کسی علمی موضوع پر گفتگو کرتے تو ساری مجلس پر اسلامی عظمت و حقانیت کا رنگ چھا جاتا۔ وہ اسلام کی حقانیت کے ترجمان اور علمی دُنیا کا سرمایۂ افتخار تھے اور جب چلے گئے تو اپنا بدل اور نظیر نہیں چھوڑ سکے کہ اس دور میں ایسے وسیع النظر علماء تو کیا ان سے بہت کم درجے کے اصحابِ علم و دانش کا وجود عنقا بنتا جا رہا ہے۔ حق تعالیٰ مولانا مرحوم کو ان کی علمی عظمتوں کی طرح وہاں بھی بلند وارفع درجات سے نوازے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل نصیب ہو۔ اللّٰھم افض علیہ من شابیب رحمتک وعفوک وادخلہ الجنۃ واستقبنا من علومہ وبرکاتہ۔ آمین

الحق

اگست ۱۹۸۳ء

مولانا سیّد نور الحسن شاہ بخاریؒ

صدر تنظیم اہلسنّت پاکستان

دوسرے بزرگ ناموسِ صحابہؓ کے منادی اور مسلک اہلسنّت والجماعت کے ترجمان مولانا سید نور الحسن شاہ بخاریؒ تھے جن کا ۵ جنوری ۱۹۸۴ء کو ملتان میں انتقال ہوگیا۔ عمر بھر کا مشغلہ شانِ صحابہؓ کا دفاع اور شاتمین صحابہؓ کا تعاقب رہا۔ وہ تنظیم اہلسنّت والجماعۃ کے بانی حضرات میں سے تھے۔ ایک عرصہ تک تنظیم کے جریدہ "ہفت روزہ دعوت" کے ذریعہ اور عمر بھر منبر و محراب سے اہلِ رفض کے جواب میں صحابہ کرامؓ اور اہلِ سنّت کی ترجمانی کرتے رہے۔ تقریر و خطابت کا خاص انداز تھا۔

دارالعلوم حقانیہ کے ابتدائی دور کے سالانہ جلسوں میں شرکت فرماتے۔ اس وقت میری عمر بہت کم تھی مگر ان کی خطابت کا انفرادی انداز پھر خاص سٹائل کا طرح دار عمامہ اور مجاہدانہ شان، دل پر کچھ عجیب سا نقش ثبت کر گئی تھی ــــ حق تعالٰے اس مردِ حق کو حمیّتِ حق کے بدلے عظیم درجات سے نوازے۔ (آمین)

الحق

دسمبر ۱۹۸۳ء

مولانا قاضی عبدالسلام صاحبؒ

نئے سال ۱۹۸۴ء کا پہلا ہفتہ اپنے ساتھ دو جید اور بزرگ علماء کی جدائی کا صدمہ لیکر آیا۔ اوّلاً حضرت مولانا قاضی عبدالسلام صاحب مرحوم، جو دیوبند کے جید فضلاء اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ارشد خلفاء میں سے تھے۔ مرحوم کا تعلق علم و عرفان کی بستی زیارت کا کا صاحب سے تھا۔ عمر بھر دین کی خدمت و اشاعت ان کا شیوہ رہا، جس بات کو حق سمجھتے ڈنکے کی چوٹ اس کا اظہار کرتے، گو اس کی زد اپنوں پر کیوں نہ پڑتی۔ نوشہرہ صدر کی جامع مسجد ان کی دعوتی جولانیوں کا میدان اور خطابت کی رزم گاہ بنی رہی۔ اب عرصہ سے صاحبِ فراش تھے۔ یکم جنوری ۱۹۸۴ء کو آبائی گاؤں زیارت کا کا صاحب میں سپردِ خاک ہوئے۔ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے ضعف و علالت کے باوجود جنازہ میں شرکت کی اور نماز جنازہ پڑھائی۔ مولانا مرحوم اپنی سادگی، وارفتگی اور بزرگانہ اداؤں میں اسلاف کا نمونہ تھے۔ حق تعالیٰ (مولانا مرحوم کو) مقاماتِ قرب و رضا سے نوازے۔

الحق

دسمبر ۱۹۸۳ء

◎

---

[1] تفصیلی حالات کے لیے "بزمِ اشرف کے چراغ" ملاحظہ ہو۔ (مرتب)

مولانا تاج محمود صاحبؒ

پچھلے دنوں فیصل آباد کے حضرت مولانا تاج محمود صاحب مرحوم مدیر ہفت روزہ "لولاک" کا سانحۂ وفات پیش آیا۔ مولانا مرحوم اُن مجاہد علماء میں سے تھے جن کی ساری زندگی ملتِ مسلمہ کی سرخروئی آزادی مظلوموں کی حمایت، حق کے فروغ اور اہلِ باطل کے تعاقب میں بسر ہوئی[1]
مولانا مرحوم جہادِ آزادی میں اپنے اکابر کے سپاہی رہے۔ پھر زندگی کا اہم مشن تاجدارِ ختم نبوت خاتم الرسل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تاج و تختِ ختم نبوت کا دفاع بنائے رکھا۔ وہ مرزائیوں کا بڑے تدبر، تحمل اور ٹھوس منصوبوں سے مقابلہ کرتے رہے، یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔

پچھلے دنوں اسلام آباد کے علماء کنونشن میں ان سے آخری ملاقاتیں رہیں۔ وہ ایک طرف قادیانیوں کے بارہ میں فکرمند رہتے تو دوسری طرف اتحاد بین المسلمین کے لیے بے چین اور مضطرب، مندوبین کے ہجوم میں سرِراہ جب بھی ملے انہی امور پر گفتگو کرنے لگتے۔ چائے کے وقفہ میں کچھ لوگوں کو صدرِ پاکستان سے مصافحہ اور مختصر ملاقات کا موقع مل جاتا۔ مولانا مرحوم کو بھی ڈائس پر جا کر صدر سے گفتگو کی نوبت آئی۔ میں اتفاقاً اس وقت پاس ہی کھڑا تھا اُن کی صدرِ پاکستان سے جو بات ہوئی تو وہ بھی قادیانیت کے بارہ میں تھی، وہ بڑے درد و سوز سے صدرِ پاکستان کو مولانا اسلم قریشی کے اغواء کے مسئلہ پر توجہ دلا رہے تھے اور صدرِ پاکستان اس سلسلہ میں ہر طرح کی تحقیقات کا ذکر کرتے رہے مگر مولانا مرحوم کا آخری مصافحہ تک یہی تقاضا تھا کہ اصل ملزم مرزا طاہر کو شامل تفتیش کیے بغیر نتائج بر آمد نہیں ہو سکیں گے۔ یہی گویا اُن کی آخری وصیت تھی اور آخری نصیحت بھی کہ دین نصیحت ہی کا نام ہے۔

---

[1] تفصیلی حالات کیلئے ملاحظہ ہو" لولاک" مولانا تاج محمودؒ نمبر"۔ (مرتب)

اور ان لوگوں کا ارباب اقتدار سے قُرب وبُعد اور دوستی اور عداوت صرف اور صرف اللہ کی رضا کے لیے ہوتی ہے۔

مولانا تو چلے گئے مگر یقین ہے کہ داورِ محشر کی خوشنودی اور شافع محشر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شفاعت کی زادِ راہ ساتھ لے کر گئے ہوں گے اور خلعت ختم نبوت کی حفاظت کے صلہ میں ان لوگوں کو خلعتِ رضا سے نوازنا رب کریم کی غیرت کا تقاضا ہے کہ وہ سب سے بڑھ کر غیور ہے۔

الحق

جنوری ۱۹۸۴ء

مولانا محمد شریف جالندھری رح

پچھلے چند ہفتوں میں کئی علمی و دینی شخصیتوں نے ملت کو داغِ مفارقت دی۔ تحفظِ ختمِ نبوت کے ایک نڈر اور انتھک "سپاہی"، جو درحقیقت اپنے کاروان کے جرنیل تھے مگر اخلاص وللّٰہیت اور اپنے مشن میں انہماک اور محویت کی وجہ سے اپنے آپ کو سپاہی کے طور پر رکھتے ——— حضرت مولانا محمد شریف جالندھری ——— انتقال فرماگئے۔ وہ تحریکِ ختمِ نبوت کے صفِ اوّل کے مجاہد تھے، ان کی ذات ناموسِ ختمِ نبوت کیلئے تگ و دو، سوز و ساز اور فکر و عمل میں فنا ہو چکی تھی، یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ تحریکِ ختمِ نبوت کی بنیادوں میں ان کی زندگی تحلیل ہو چکی تھی جس پر شوکت و سطوت کی بلڈنگیں تعمیر ہوگئیں، ظاہر بین نظریں عمارت کی رعنائی پر لوجاتی ہیں اور مضبوط و مستحکم بنیادوں پر کم ہی نگاہ پڑتی ہے مگر انہوں نے خود ہی ایسا کرنا چاہا کہ اجر و صلہ کی ساری متاع تاجدارِ ختمِ نبوت ﷺ سے شفاعتِ عظمٰی کی شکل میں اس جہاں میں پاسکیں جہاں کی ہر چیز لافانی ہوگی ——— ختمِ نبوتؐ کی اشاعت، قادیانی دجل و تلبیس کا تعاقب اور مجلس تحفظِ ختمِ نبوت کیلئے وسائل کی فراہمی، قادیانی شرانگیزیوں کا تدارک، مقدماتِ ختمِ نبوت کی پیروی، آئینی و قانونی تحفظات کیلئے تگ و دو، اس راہ میں علماء کی منت سماجت، مشائخ و زعماء کی قدم بوسی، حکام کی خوشامد، سیاستدانوں کی منت پذیری، ان تمام باتوں کو عار نہیں بلکہ شمعِ رسالت کا یہ پروانہ یہ سب کچھ اپنے لیے فخر و سعادت سمجھتا رہا۔ ان کی جدائی سے بلاشبہ مجلس تحفظ ختمِ نبوت کے کاموں کو ایک عظیم دھچکا لگ گیا ہے۔ خداوند قدوس ختمِ نبوت کے اس جان نثار کی قربانیاں قبول فرما کر انہیں شافعِ محشر حضور خاتم النبیینؐ کی خوشنودی سے مالا مال فرماوے اور پیدا ہونے والا خلاء بہتر سے بہتر صورت میں پُر ہو۔

الحق ——— جنوری ۱۹۸۶ء

مولانا مفتی محمد عبد اللہ صاحب رحمہ اللہ

حضرت مولانا مفتی محمد عبد اللہ صاحب مرحوم بھی ملتان میں واصل بحق ہوئے۔ وہ دار العلوم دیوبند کے جید فاضل، عالم باعمل اور زندگی بھر مسندِ تدریس و افتاء کی زینت رہے۔ ملتان کے ممتاز مدارس خیر المدارس اور قاسم العلوم میں حدیث کی اہم کتابیں پڑھاتے رہے۔ ملک کے چند اہم مفتیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ قیام پاکستان کے اوائل میں علمی و ادبی حلقوں کی پیاس بجھانے کے لیے آپ نے اردو اور عربی میں ایک علمی مجلہ "الصدیق" کے نام سے جاری کیا اور عربی حصہ کی وجہ سے اس کا ایک منفرد مقام تھا۔ دینی و علمی ذخائر کی عمدہ اشاعت کے لیے آپ نے ملتان میں کتب خانہ صدیقیہ قائم فرمایا، آخری چند سالوں میں آپ کا قیام کراچی رہا، اور اب اہل وعیال کے ساتھ حرمین الشریفین ہجرت کرنے کے سارے انتظامات مکمل فرما چکے تھے۔ وہاں مستقل قیام یا ہجرت ہی کے سلسلہ میں اہل وعیال کو لینے آئے تھے کہ داعئ اجل نے بلایا اور آپ نے لبیک کہہ کر علمی و دینی حلقوں کو داغ مفارقت دیا۔ کئی اہم مواقع ایسے آئے کہ آپ نے فتویٰ و تحقیق کو وقتی سیاسی لہروں سے متاثر نہ ہونے دیا اور جادۂ حق پر ڈٹے رہے۔

حق تعالیٰ مرحوم کو درجاتِ عالیہ سے نوازے اور مختلف شکلوں میں ان کے علمی و دینی فیضانات ان کے لیے صدقاتِ جاریہ بنی رہیں۔

الحق

جنوری ۱۹۸۵ء

بزمِ دارُالعلوم حقانیہ
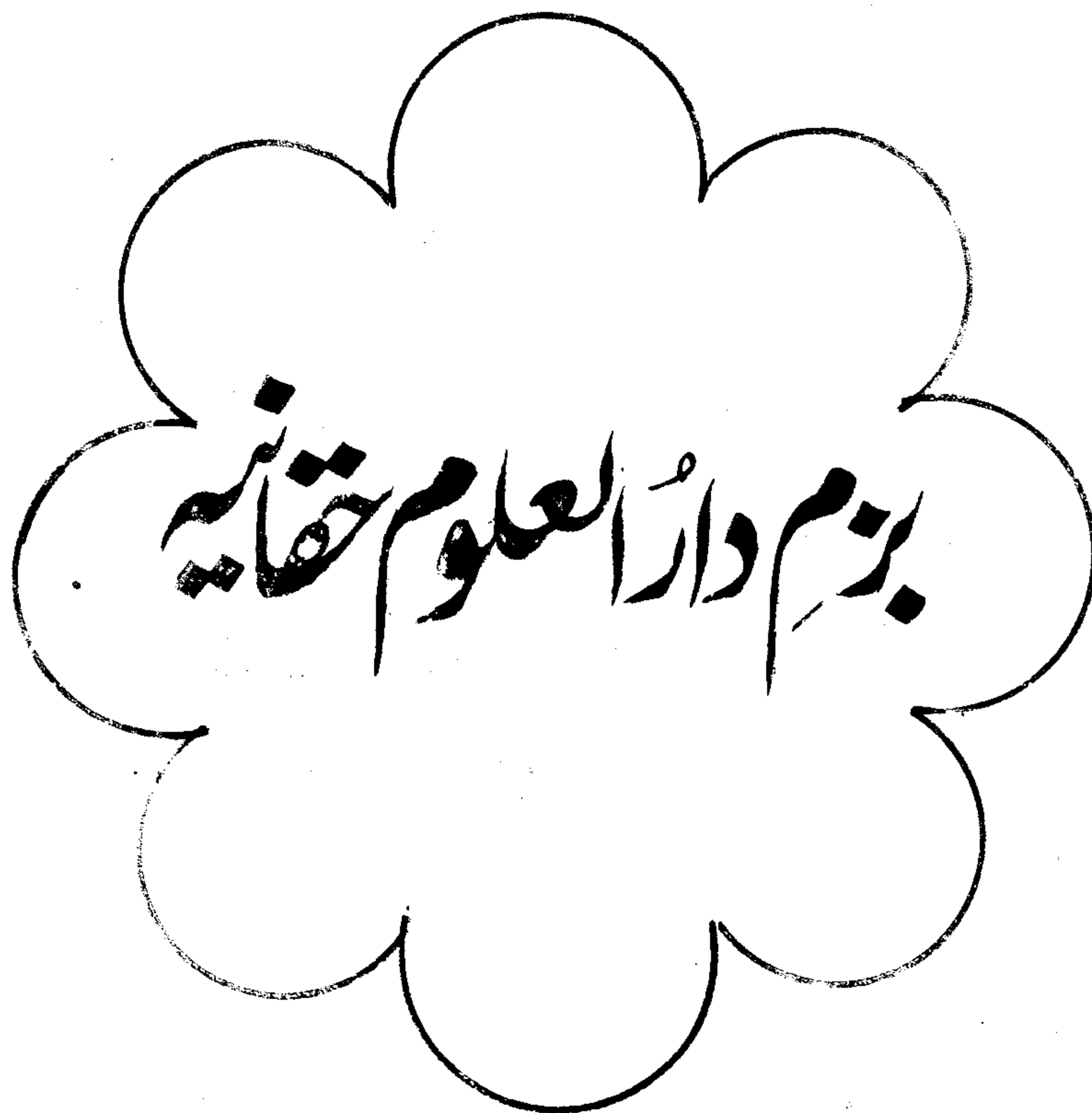
انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اُٹھ گئے
ساقیا محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا!

تھا جنہیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے
لے کے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا؟

اقبالؒ

خانِ اعلیٰ محمّد زمان خان خٹک

خاندانِ خٹک کے باکمال بزرگ اور خانوادۂ خان محمد خوشحال خان خٹک مرحوم کے گلِ سرسبد، کمالاتِ ظاہری و معنوی کی ایک دلآویز تصویر خان بہادر محمد زمان خان خٹک رئیس اکوڑہ خٹک کی ۷ جنوری ۱۹۶۰ء مطابق ۷ رجب ۱۳۷۹ھ کو وفات پائی۔ پشتو ادب سے ذوق اور مہارت ورثہ میں ملی تھی، اردو اور فارسی ادب میں بھی دسترس رکھتے تھے، کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ حضرت شیخ الحدیث[1] صاحب مدظلہ کے ساتھ نہایت درجہ

---

[1] خانِ اعلیٰ کا یہ مکتوب حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے کسی تعزیتی مکتوب کے جواب میں ہے جو آپ نے [illegible] دیوبند میں اکوڑہ خٹک سے بھیجا گیا ہے جو کہ آپ کے علمی ذوق کا آئینہ دار ہے۔ (مرتب)

اکوڑہ

۳۰ مارچ ۱۹۴۵ء

ہمہ نقدِ حیاتم رفتہ برباد — کہ جنسِ کاسدِ عصیاں خریدہ

محترم مولانا! السلام علیکم! تعزیت نامہ سے قلبِ حزیں کو تسکین حاصل ہوئی۔ یہ کہن ویرانہ جس کا دوسرا نام محسن سرائے دنیا ہے۔ مصائب و نوائب کا گھر غموم و ہموم کا مسکن ہے، اس کا مایہ خمیر اشک و خون سے اٹھایا گیا ہے۔ ایک بصیر آدمی کیلئے تو خاصا ماتم کدہ ہے۔ گوناگوں ابتلاؤں سے پُر اور مختلف آزمائشوں سے معمور ہے۔ کسی کو مال و دولت، عزت و جاہ، تندرستی و اولاد کے دامِ زرّین میں پھنسایا گیا ہے۔ اور کسی کو درد و کرب، فقر و افلاس، امورِ دنیا میں ناکامی و نامرادی، بیکسی و بے دلاوری کی جانگسل و حوصلہ فرسا پریشانیوں کا شکار بنایا گیا ہے۔ دونوں حالتوں میں تائیدِ الٰہی کے بغیر انسان ظلوم و جہول شیوۂ شکر و صبر سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ جس کے پہلو میں درد آشنا دل رکھا گیا ہے اس کو لذت کی چاشنی ملتی ہے۔ قاسی القلب، غفلت شعار مردہ دل انسان اس وجدانی لذت و سرور سے بہرہ اندوز سعادت نہیں ہو سکتا۔ ایک قانع [illegible] اپنے حق آگاہ قلب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۸ پر)

شفقت تھی جو بالآخر بحد عقیدت سے بدل گئی اور ان کی تربیت سے یہ چیز اُن کے پورے خاندان میں منتقل ہو گئی۔ دار العلوم حقانیہ کے اجلاسِ دستار بندی کے موقع پر مولانا عبد الحنان ہزاروی مرحوم نے ان کا زبان زدِ عوام لقب "خان بہادر صاحب" خانِ اعلیٰ سے تبدیل فرمایا! اور اِسی لقب سے بعد میں یاد کیے جاتے رہے۔ علماء اور اہلِ علم سے تعلق اور محبت شیفتگی کی حد تک پہنچ گئی تھی۔

الحق ـــــ فروری ۱۹۷۱ء

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۷ سے)

میں محسوس کرتا ہے، اس سے جاہ پرست شخص کا دل یکسر خالی ہوتا ہے۔ ابنِ آدم کو سفرِ حیات میں قدم بقدم پُرآشوب دشواریاں اور ہمت شکن مشکلات پیش آتی رہتی ہیں جن کا مقابلہ مردِ عارف ہی روحانی طاقت سے کر سکتا ہے۔ ہم جیسے لفاظی کے شیدا اور محض قال کے دلدادہ جن کے دل ذوقِ عمل سے عاری اور ضمیر دنیاوی کدورتوں سے مکدر ہو چکے ہوں۔ روحانی سرور اور طمانیت کا سرمایہ کھو چکے ہوں وہ تو بارِ زمین اور ننگِ انسانیت ہی کہلانے کے مستحق ہیں۔

مولانا! میں تو اعرابی کا عقیدۂ توحید چاہتا ہوں نہ کہ فلسفی کا استدلالی ایمان جو تزلزل اور تذبذب سے خالی نہیں ہوتا۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ کی سی راسخ الایمانی حضرت بلالؓ کی سی فدویت مطلوب ہے اور بغیر کسی توشۂ آخرت مجاناً عفو و بخشش کا امیدوار ہوں ـــ مولانا اشہنواز مرحوم ایسے اوصافِ حمیدہ کا علمبردار رہا جو معلوم عوام نہیں، وہ سیر چشم و قانع تھا، غیور و خود دار تھا، پابندِ صوم و صلوٰۃ شب زندہ دار تھا۔ اس کے فقدان سے ہمارے لیے ایسی خلا پیدا ہو گئی ہے جس کا پُر ہو جانا اگر ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے ـــــ آئیے کہ آپ اور ہم خلوصِ دل سے مرحوم کے واسطے دعائے مغفرت طلب کریں۔
بحمد اللہ آپ کے قائم کردہ مدرسہ اسلامیہ کا سالانہ امتحان ہو چکا۔ عربی جماعت خصوصیت سے لائق ستائش ثابت ہوئی جس پر آپ کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں ـــ والسلام مع الاکرام

عزیز نثار الحق سے بعد از سلام کہہ دیجیے کہ تعزیت نامہ پہنچا تھا۔

آپ کا نیاز مند

محمد زمان خٹک

حضرت مولانا عبد الحنان صاحب ہزارویؒ

افسوس کہ بزمِ قاسمیؒ اور محفلِ شیخ الہندؒ کی ایک ایک شمع خاموش ہوتی جا رہی ہے۔ برطانوی سامراج کے استیصال اور مسلمانوں کی دینی و فکری قیادت کے لیے دار العلوم دیوبند نے جو لشکرِ جرار تیار کیا اس کا ایک ایک اولو العزم سپاہی اٹھتا جا رہا ہے، کچھ خال خال نظر آ رہے ہیں، وہ بھی آمادۂ رحیل ہیں۔ ان جاں نثارانِ ملک و ملت اور موجودہ نسلوں کے درمیان بیچ کی یہ کڑیاں بھی نکل جائیں گی مگر آنے والوں کے لیے ان لوگوں کی قربانیوں سے بھرپور اور تابناک زندگی روشنی کے مینار کا کام دے سکے گی۔

حضرت مولانا عبد الحنان صاحب ہزاروی مرحوم کا وجود بھی انہی اربابِ عزیمت اور علمبردارانِ علمائے حق میں سے تھا جن کا پچھلے ماہ بالاکوٹ (ہزارہ) میں انتقال ہوا۔ تدفین بھی اس پاکیزہ سرزمین میں ہوئی جو سیدین شہیدین (امیر المومنین سید احمد شہیدؒ اور سیدنا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ) کے خونِ شہادت سے لالہ زار بنی تھی۔ مولانا عبد الحنان صاحب ہزارویؒ جید عالمِ دین، بہترین و بے بدل خطیب تھے۔ زندگی بھر ہر دینی و ملی تحریک میں نمایاں حصہ لیا، خواہ استخلاصِ وطن کی تحریک ہو یا ختمِ نبوت کا مسئلہ۔ تقسیم سے پہلے جمعیۃ العلماء ہند اور تقسیم کے بعد جمعیۃ العلماء اسلام میں نمایاں کام کیا۔ کیسی ہی نازک گھڑی ہو حق کہنے سے کبھی دریغ نہ کیا۔ لایخافون فی اللہ لومۃ لائم[1] ان کا شیوہ رہا۔ وہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے جاں نثار خادم اور حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے نہ صرف تلمیذ بلکہ منظورِ نظر رہے۔ مولانا کے قیامِ لاہور کے دوران حضرت شاہ صاحب مرحوم

---

[1] اللہ کی راہ میں کسی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے ـــ القرآن ـــ (مرتب)

نے بارہا انہیں میزبانی اور اسفار میں رفاقت کا شرف بخشا ـــــ دار العلوم حقانیہ کے لیے تو مولانا کی وفات ایک مخلص اور سرگرم رکن کی جدائی ہے۔ ابتداء سے تاسیس ہی سے دار العلوم کی ترقی میں ہر طرح حصہ لیتے رہے، ذاتی وجاہت کے استعمال سے بھی گریز نہ کیا۔ ان کی زندگی کے یہ مختلف ادوار اس حقیقت کے غماز ہیں کہ ان کا دل دینی تڑپ اور قوم و ملک کی حقیقی اصلاح اور ملی جذبات سے معمور تھا۔ ایسے حضرات کا ایسے دور میں اٹھ جانا ایک المناک سانحہ ہے۔ حق تعالیٰ امتِ مرحومہ کو مرحوم کا نعم البدل اور مرحوم کو درجاتِ عالیہ سے نوازے۔ (آمین)

الحق
اکتوبر ۱۹۶۶ء

الحاج محمد اعظم خان خٹک

۲۴ جنوری بروز ہفتہ دارالعلوم کے ایک، نہایت مخلص اور ہمدرد رکن شوریٰ جناب الحاج خان محمد اعظم خان خٹک، رئیس اکوڑہ خٹک کا انتقال ہوا، مدت سے کینسر کی تکلیف تھی، دارالعلوم کے تاسیس سے لیکر اب تک آپ نے اپنے والد بزرگوار جناب خان اعلیٰ محمد زمان خان خٹک مرحوم کی طرح پوری جانفشانی اور تندہی سے دارالعلوم کی ترقی و استحکام میں حصہ لیا۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ کیساتھ غایۃ درجہ کا نیازمندانہ اور خادمانہ تعلق رہا اور کسی حال میں دارالعلوم کا ساتھ نہ چھوڑا۔ تعمیرات کی نگرانی، چندہ کی فراہمی الغرض ہر مرحلہ پر پیش پیش رہتے، اس لحاظ سے موصوف کی جدائی دارالعلوم اور حضرۃ شیخ الحدیث مدظلہ کیلئے ذاتی صدمہ کا باعث ہے۔

مرحوم کی عمر ۱، سال تھی، نہایت ملنسار خوش خلق اور قومی و ملی خدمت کے جذبات سے معمور انسان تھے۔ تحریک پاکستان میں اہم کردار ادا کیا۔ جنگ کشمیر کا موقعہ ہو یا جنگ ستمبر کے مہاجرین کی آبادکاری کا سوال ہو یا علاقہ کی تعلیمی اور طبی ضروریات اور بلدیہ کی نظامت، ہر موقع پر بساط سے بڑھ چڑھ کر خدمات بجالاتے، تقسیم سے قبل آنریری مجسٹریٹ رہے۔ پھر نواب امیر محمد خان مرحوم کالاباغ (گورنر مغربی پاکستان) کے زمانہ میں صوبائی ایڈوائزری کونسل کے رکن نامزد ہوئے، مسلم لیگ کی عاملہ کے ممبر بھی رہے اور ریفرنڈم میں بھی اہم حصہ لیا۔

۱۹۵۰ء میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، پچھلے کئی سال سے قومی و ملی خدمات کا زیادہ تر حصہ دارالعلوم کے بناؤ سنوار میں لگایا۔ دنیا سے جاتے جاتے اپنے پڑوس میں ایک شاندار مسجد تعمیر کروائی، شدید بیماری کی وجہ سے دن بھر اس کے کام کی نگرانی خود کرتے رہے، دارالعلوم کے شعبۂ تعلیم القرآن کو نہ صرف زمین وقف کی بلکہ تعمیر کے وسائل اور نگرانی کا کام بھی خود انجام دیا۔

مرحوم کی جدائی پر نہ صرف دارالعلوم بلکہ پورا علاقہ سوگوار ہے۔ اللہ تعا[illegible] اور خامیوں سے درگذر فرما دے۔

الحق :- ذی الحجہ ۱۳۸۹ھ

فروری ۱۹۷۰ء

الحاج میاں کرم الٰہی صاحب رحمہ اللہ

۲ مارچ ۱۹۷۰ء بروز پیر پشاور شہر کے ممتاز علم دوست، مخیر شخصیت جناب الحاج میاں کرم الٰہی صاحب تاجر چائے، چوک یادگار پشاور وفات پا گئے۔ عمر ستر برس کے قریب تھی۔ عرصہ سے شوگر جیسی موذی مرض کا شکار تھے۔ وفات سے چند دن قبل دل کے دورے پڑنے لگے جو جان لیوا ثابت ہوئے۔

دارالعلوم حقانیہ کے قیام سے لے کر اب تک اس کی ترقی و استحکام میں بھرپور حصہ لیا اور مالی و جانی مدد کرتے رہے۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب مدظلہ اور دیگر اکابر علم و فضل سے نہایت گرویدگی تھی۔ عمر بھر رفاہِ عامہ اور فقراء و اہلِ علم کی مدد میں کوشاں رہے۔ پشاور کے ایک ممتاز قدیمی خاندان کے بزرگوں میں سے تھے۔

نمازِ جنازہ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے پڑھایا اور قبیل مغرب مشہور ولی اللہ شیخ جنید بابا کے جوار میں سپردِ خاک کیے گئے۔ موصوف دارالعلوم کے دیرینہ مخلص خادم ہونے کے علاوہ ناچیز کے خسر بھی تھے۔ اس مناسبت سے دارالعلوم کے تمام فضلاء اور متعلقین سے بھی مرحوم کے لیے دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کی اپیل ہے۔ دارالعلوم حقانیہ اور ادارۃ الحق مرحوم کے تمام لواحقین کے ساتھ شریکِ تعزیت ہے۔

الحق

مارچ ۱۹۷۰ء

مولانا الحاج حکیم نور الحق صاحب رحمہ اللہ

رکن شوریٰ دار العلوم حقانیہ

ہفتہ ۲۹ محرم ۱۳۹۱ھ کی شب کو علاقہ چارسدہ کی ایک بزرگ شخصیت مولانا الحاج حکیم نور الحق صاحب سکنہ تنگی نصرت زئی (چارسدہ) تقریباً ، برس کی عمر میں انتقال فرما گئے۔

مرحوم حسنِ اخلاق، تواضع، تقویٰ، للٰہیت اور جذبہ خدمتِ خلق، علمی وطبی مہارت، حرمین الشریفین سے والہانہ عشق اور بہت سی دیگر اعلیٰ صفات کے حامل تھے۔

دار العلوم حقانیہ کی مجلسِ شوریٰ کے رکن تھے مرحوم کی نمازِ جنازہ حضرت شیخ الحدیث نے پڑھائی۔ اور جنازہ میں علاقہ بھر کے ہزاروں افراد، علماء، صلحاء اور مسلمانوں نے شرکت کی۔

ادارہ الحق اور دار العلوم حقانیہ اس صدمہ میں مرحوم کے خاندان و لواحقین بالخصوص ان کے ذاہل فاضل صاحبزادہ مولانا حکیم حبیب اللہ جان فاضل حقانیہ کے ساتھ برابر کا شریک ہے۔ قارئین سے حضرۃ مرحوم کے رفع درجات کے لیے دعا کی درخواست ہے۔

الحق

اپریل ۱۹۷۱ء

مولوی محمدؐ شاہ عالم وزیرستانی

دارالعلوم کے جواں سال، ذہین، محنتی طالب علم مولوی محمد شاہ عالم وزیرستانی اکوڑہ خٹک کے متصل دریائے کابل (لنڈا) میں ڈوب کر شہادت پا گئے۔ یہ واقعہ بھی اس ماہ دارالعلوم کے طلبہ، اساتذہ اور انتظامیہ کے لیے شدید صدمے کا باعث بنا۔ ہفتہ عشرہ تک دریا سے لاش کی بازیابی کی کوششوں کے باوجود اللہ کو منظور نہ ہوا ـــــــ علومِ دینیہ کی طالب علمی، مسافرت، پھر دریا کی موت اور جمعہ کا دن، شہادت در شہادت کی حکمی علامتیں اور ان کے عنداللہ مقبولیت کی دلیلیں ہیں۔ حق تعالیٰ تمام پسماندگان کو صبر و اجر اور مرحوم کو درجاتِ عالیہ عطا فرماوے۔ (آمین)

الحق

جمادی الاولیٰ ۱۳۹۳ھ

جون ۱۹۷۳ء
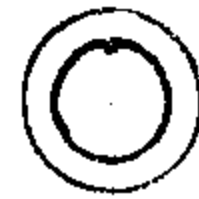
مولانا میاں مسرت شاہ کاکاخیل رحمۃ اللہ علیہ

حضرت علامہ مولانا عبدالحق صاحب نافع گل مرحوم و مغفور جیسے جید اور ممتاز علامۂ یگانہ کے وصال کے علاوہ کئی اور علمی و دینی حادثے بھی پیش آتے۔ ان داغ مفارقت دینے والے بزرگوں میں حضرت مولانا الحاج میاں مسرت شاہ صاحب کاکاخیلؒ بھی شامل ہیں۔ موصوف نہ صرف جید عالم تھے بلکہ اپنی خداداد وجاہت، عزت و ثروت اور اثر و رسوخ کو بھی عمر بھر دین اور علوم دینیہ کی اشاعت و فروغ میں صرف کرتے رہے وہ اپنی حیاتِ مستعار کو علمی اداروں اور دینی کاموں میں لگا کر انشاء اللہ حیاتِ جاودانی حاصل کر چکے ہوں گے مگر علمی و دینی حلقے ان کی جیتی جاگتی اور پُروقار شخصیت کو مدتوں روتے رہیں گے۔

دارالعلوم حقانیہ سے تو ان کا تعلق جسم و روح جیسا تھا۔ دارالعلوم کے تمام تنظیمی کاموں میں پیش پیش رہتے اور شوریٰ کے اجلاس کی تو جان تھے۔ عموماً صدارتِ شوریٰ بھی آپ ہی فرماتے اور اپنی میٹھی حکیمانہ اور مشفقانہ باتوں سے ارکان کو نیا جوش اور ولولہ بخش دیتے۔ سیاسی مخالفتوں کے باوجود بھی علماء اور اہل علم کے قلوب میں ان کا وقار قائم رہا۔ کیونکہ ان کا کوئی فیصلہ گو بظاہر عام مزاج کے خلاف بھی ہوتا مگر خلوص اور للّٰہیت پر مبنی ہوتا۔ صوبہ سرحد کے علمی و دینی حلقے عموماً اور دارالعلوم حقانیہ میں خاص طور پر ان کی خلاء مدتوں محسوس ہوتی رہے گی۔ حق تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ سے اعلیٰ مقاماتِ قرب سے نوازے اور ان کے گرامی قدر صاحبزادگان اور تمام خاندان کو صبر جمیل اور انکی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی توفیق سے نوازے۔ مولانا مرحوم کا مختصر سوانحی خاکہ یہ ہے:

ولادت ۱۸۹۸ء حکمت آباد نزد سرڈھیری تحصیل چارسدہ میں ہوئی، جہاں ان

کے والد بزرگوار مولانا میاں حکمت شاہ کی جائداد تھی۔ آبائی قصبہ زیارت کاکا صاحب اور سلسلۂ نسب مشہور بزرگ شیخ رحمکار مرحوم سے جا ملتا ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر شیخاں ملّا مرحوم سے پائی اور درسِ نظامی کی ابتدائی کتب ۱۹۱۱ء میں حضرت جی صاحب ترنگ زئی مرحوم کے قائم کردہ مدرسہ عربیہ گدر میں پڑھیں۔ کچھ کتابیں طورو مردان کے علامہ مولانا عبدالجمیل مرحوم[1] سے اور معانی و بیان کی کتابیں علامہ عبداللہ میاں صاحب سے زیارت کاکا صاحب میں پڑھیں۔ مولانا عبداللہ میاں صاحبؒ نے مطول کا حاشیہ بھی لکھا تھا جسے اس وقت کابل کے امیر عبدالرحمان مرحوم نے شائع بھی کروایا۔ معقولات کی کتابیں اپنے گاؤں میں مولانا صاحب حسن[2] زئی اور مولانا صاحب ڈنڈوفہ[3] سے پڑھیں یہ دونوں منطق و فلسفہ کے جیّد اساتذہ میں سے تھے اور مرحوم کے والد بزرگوار نے اپنے سعادتمند بیٹے گھر میں تعلیم دینے کیلئے ان کی خدمات حاصل کی تھیں۔ تفسیر و حدیث کی اجازت وقت کے مشہور عالم صاحب حق صاحب رجڑ چارسدہ سے حاصل کی ۱۹۱۷ء میں اپنے گھر پر ان کے والد مرحوم نے اپنے اخراجات سے مدرسہ قائم کیا کہ آپ اس میں تدریس کا مشغلہ جاری رکھ سکیں۔ یہاں اور کچھ عرصہ مدرسہ عربیہ رجڑ تحصیل چارسدہ میں حسبۃً للہ تدریس دیتے رہے۔

۱۹۲۶ء میں بسلسلۂ تجارت چوب افغانستان گئے۔ آخر وقت تک عمارتی لکڑی

---

[1] آپ ضلع مردان کے مشہور علمی گھرانے اور علمی قصبہ طورو میں ۱۸۵۹ء میں مولانا سید حفیظ اللہ کے گھر پیدا ہوئے۔ علوم سے فراغت کے بعد ریاست جوناگڑھ اور فتحپور میں عرصہ تک مدرس رہے۔ آپ حضرۃ علامہ محدث عصر انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت استاذنا المکرم شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ کے استاذ رہ چکے ہیں ۱۹۴۶ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

[2]، [3] یہ دونوں مقامات ہیں۔ اوّلاً تحصیل چارسدہ ضلع پشاور اور دوسرا ضلع مردان میں واقع ہے۔ (مرتب)

کی تجارت ہی آپ کا ذریعہ معاش رہی۔ ۱۹۳۲ء میں اپنے فرزند مولانا ولایت شاہ صاحب[1] کو بغرض تعلیم دیوبند لے گئے۔ تو علم کے حصول اور اولاد کی علمی تربیت کا جذبہ اتنا تھا کہ والد بھی بیٹے کے ساتھ طلب علم میں دوبارہ مشغول ہوگئے۔ اور شیخ الاسلام مولانا مدنی مرحوم کی بخاری و ترمذی اور مولانا رسول خانؒ کی ابوداؤد۔ اور مولانا محمد ابراہیمؒ کی مسلم شریف میں شرکت فرمائی اس زمانہ میں دارالعلوم کے مہمان خانہ میں رہے۔

مولانا ولایت شاہ صاحب کی روایت ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی مرحوم کی آپ پر خاص توجہ تھی اور خصوصی طور پر بعد از نماز مغرب بھی اپنی قیام گاہ پر عربی زبان میں تقریر فرماتے ہوئے حضرت مدنی مرحوم انہیں ترمذی شریف پڑھاتے رہے جسے آپ نوٹ کرتے رہے۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ گھریلو مجبوریوں کی وجہ سے انہیں حضرت مدنیؒ کے مشورہ اور اجازت سے با دلِ ناخواستہ دیوبند سے واپس آنا پڑا۔ ۱۹۴۱ء میں ان کے والد بزرگوار کا انتقال ہوا تو ان کے کاروبار کا سارا بوجھ بھی انہیں اٹھانا پڑا۔ مگر پھر بھی قومی و دینی کاموں میں برابر حصہ لیتے رہے۔

پہلی دفعہ ۱۹۳۰ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۶۱ء میں اپنے اہل وعیال واعزہ کے ساتھ زیارت حرمین شریفین کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ عمر کافی تھی مگر قویٰ و اعصاب کے لحاظ سے نہایت قوی بہادر اور جفاکش تھے۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۷۳ء کو مرض نے آلیا جو بظاہر بہت معمولی تھا۔ مگر بالآخر مرض وفات ثابت ہوا گھر پر اور پھر پشاور کے ہسپتالوں میں اور اعلیٰ ڈاکٹروں سے علاج کرایا گیا مگر علاج مرگ کس کے پاس تھا۔؟ مرض میں فالج کا بھی اضافہ ہوا جو بڑھتا ہی چلا گیا۔ اور بالآخر جمعہ کی رات اپنی جان جان آفرین جل جلالہ کے سپرد کردی۔ دوسرے دن جمعہ کی نماز کے بعد جو عام طور پر ۹ ذی الحجہ کا دن تھا۔ مگر ان کے علاقہ میں عید الاضحیٰ کا مبارک دن، نمازِ جنازہ ہوئی اور محبوبِ حقیقی کی رضا کے یہ طلبگار

---

[1] متواضع، باخلاق علمی ودینی کاموں میں سرگرم اپنے والد کے بعد دارالعلوم حقانیہ کی مجلس شوریٰ کے رکن بنے، افسوس کہ جوانی میں مرض قلب سے ۲۴ فروری ۱۹۸۱ء کو انتقال کر گئے (۳)

. اپنے محبوب سے جا ملے، جمعۃ المبارک کے ساتھ عید اور پھر وصالِ حقیقی، کئی سعادتیں تھیں جو جمع ہوگئیں۔ اور شاید شاعر نے انہی کے لئے کہا تھا کہ ؎

عیدٌ وعیدٌ وعیدٌانِ اجتمعا

وجہ الحبیب ویوم العید والجمعا

علماء، طلباء، امراء اور دردمند مسلمان بڑی کثرت سے جنازہ میں شریک ہوئے اور اسلاف کے اس نمونہ پر جی بھر کر روئے جو اپنی ذات میں دنیادی امارت و ثروت کیساتھ علماء کے فقر و زہد اور وقار و تمکنت، صوفیا کا سوز و گداز، شرفاء کا رکھ رکھاؤ اور اپنی قوم پٹھانوں کے روایتی طور طریقے غیرت وحمیت سب کچھ سمیٹے ہوئے تھے۔ جنازہ ان کے فرزند مولانا ولایت شاہ نے پڑھایا اور تدفین کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق نے اپنے اس دیرینہ محبّ قدیم کی ذات کو دل کھول کر خراجِ تحسین پیش کیا۔ علامہ شمس الحق افغانی اور دیگر علماء نے بھی تقریریں کیں اور رفع درجات کی دعائیں ہوئیں۔

فرحمۃ اللہ وارضاہ ورضی عنہٗ۔

الحق

فروری - مارچ ۱۹۷۴ء

مولوی غلام محمدؒ

استاذ شعبہ تعلیم القرآن دار العلوم حقانیہ

۲۷ دسمبر ۱۹۷۷ء کو دار العلوم کے شعبہ تعلیم القرآن (مڈل سکول) کے استاذ جناب مولوی غلام محمد صاحب نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم نے عمرِ عزیز کے ۳۴ سال دار العلوم کے اس شعبہ میں مذہبی اور عصری مضامین پڑھانے میں خرچ کر دیئے۔ یہ زندگی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس لحاظ سے ان کا شمار اس درسگاہ کے محسن معماروں میں کیا جائے گا۔ دار العلوم کے اس شعبہ کی یہ طویل ملازمت بھی اس انداز میں کہ معمولی تنخواہ، زہد و قناعت بلکہ فقر و فاقہ کو ہنسی خوشی گوارا کیا۔ اور ایک آدھ مرتبہ محکمہ تعلیم کی اس سے اعلیٰ ملازمت کو بھی یہ شعر کہتے ہوئے ٹھکرا دیا کہ ؎

ان دنوں ہے گرچہ دکن میں بہت قدرِ سخن ۔۔۔ کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

دار العلوم حقانیہ کو اس کے موجودہ ترقیات اور علمی و دینی بلند مقام تک پہنچانے میں ایسے ہی مخلص ہست الست، اساتذہ، عملہ اور اراکین کا بنیادی حصہ ہے۔ اخلاص و قناعت، ایثار اور جذبہ خدمت کے ایسے مظاہروں نے دار العلوم کے نونہال پودے کو اصلھا ثابتٌ وفرعھا فی السماء بنا دیا، اب یہی چیز ان کے حق میں صدقۂ جاریہ ثابت ہوگی۔ انشاء اللہ

اس طویل مدتِ تدریس میں اکوڑہ اور گرد و نواح کے بلاشبہ ہزاروں افراد نے آپ سے اکتسابِ فیض کیا ہوگا۔ ان کی وفات دار العلوم کے اس شعبہ (سکول) کے لیے ایک خلاء ہے۔ ان کے بعد ان کی شرافت اور شفقت و محبت کے اوصاف نے سکول کے بچوں کو رُلایا۔ جنازہ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے پڑھایا، اور دار العلوم کے تمام شعبوں اور پورے سکول نے شرکت کی، اور ایصالِ ثواب کیا ۔۔۔ قارئین سے ان کے رفعِ درجات کیلئے دعا کی امید کی جاتی ہے۔

الحق ۔۔۔ جنوری ۱۹۷۸ء

حکیم عبدالخالق خلیق رحمۃ اللہ علیہ

۲۵ جنوری ۱۹۷۸ء کی شام کو جناب حکیم عبدالخالق[1] خلیق صاحب واصل بحق ہو گئے۔ عمر تریاسی کے لگ بھگ تھی۔ ۲۶ جنوری بعد از نمازِ جمعہ پشاور میں ان کی تدفین ہوئی۔ اربابِ علم و فضل اور مشاہیر نے جنازہ میں شمولیت کی ــــــ موصوف کی وفات سے پشتو ادب کو بڑا سانحہ پیش آیا۔ پشتو زبان اور ادب سے آپ کو اتنا لگاؤ تھا کہ دارالعلوم حقانیہ کی مجلس شوریٰ کے ہر جلسہ میں کوئی سنتا یا نہ سنتا مگر آپ کا اصرار ہوتا کہ بحث تقریر بھی پشتو میں ہو۔ پشتو کی ترویج و فروغ کا ولولہ آخر دم تک تازہ رہا۔ کئی پشتو کتابوں کے مصنف تھے۔ پشتو شاعری میں بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔ ایک عرصہ تک سرحد کے پشتو ماہنامہ "پشتون" کے مدیر رہے۔ اس لحاظ سے آپ بابائے پشتو کہلانے کے مستحق ہیں ــــــ جدوجہدِ آزادی میں خان عبدالغفار خان صاحب کے سرگرم ساتھی تھے۔ سنجیدگی، وقار و متانت، صلابت و سلامت رائے آپ کی خاص صفات تھیں۔ دارالعلوم حقانیہ اور اس کے بانی کے ساتھ آپ کا تعلق نہایت مستحکم اور دیرینہ رہا۔ اس تعلق کی راہ میں اپنے سیاسی موقف کو بھی آڑے نہ آنے دیا۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں یہ تعلق نہایت نازک موڑ پر آیا تو آپ نے اپنے پختہ سیاسی جذبات کی قربانی دے کر دارالعلوم اور اس کے بانی کو ترجیح دی۔ مجلس شوریٰ دارالعلوم کے اولین ارکان میں سے تھے۔ ۲۵، ۳۰ سال کے اس طویل عرصہ میں آپ سے صرف ایک میٹنگ مس ہوئی تو نہایت افسوس کرتے رہے کہ میرے تسلسل کی جو زنجیر تھی اس کی ایک کڑی کیوں ٹوٹ گئی۔ شوریٰ کے جلسوں میں اپنے پختہ

---

[1] تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو مرحوم کی خود نوشت پشتو تالیف "زہ او زما زمانہ"۔ (مرتب)

اور مفید مشوروں سے راہنمائی کرتے رہے ـــــ ادبی اور علمی ذوق کی وجہ سے آپ کا ادارہ "اشاعتِ سرحد"[1] ایک عرصہ تک قدیم وجدید کا سنگھم بنا رہا۔ بلاشبہ آپ سرحد کے علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی معماروں میں گنے جائیں گے ـــــ حق تعالیٰ ان کی وفات سے پیدا ہونے والے خلا کو پُر فرماوے اور ان کے پسماندگان کو صبرِ جمیل نصیب ہو۔

الحق

جنوری ۱۹۷۸ء

---

[1] پشتو زبان کے ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں کو متعارف کرانے میں اس ادارہ نے بہت کام کیا۔ (مرتب)

مولانا میاں محمد فیاض صاحب

اُستاذ دار العلوم حقانیہ

۱۹، ۲۰ محرم الحرام ۱۳۹۸ھ کی درمیانی شب ۳ بجے سحری کے وقت حیات آباد ہسپتال پشاور میں دار العلوم حقانیہ کے ایک ایسے سابق مدرس انتقال فرما گئے جنہوں نے نہایت خاموشی سے ساری عمر عزیز اسلامی علوم و فنون کی تعلیم و تعلم اور پھر درس و تدریس میں بسر کر دی۔ ان کا نام نامی حضرت مولانا میاں محمد[1] فیاض تھا۔ اور اس وقت وہ دار العلوم سرحد پشاور میں مدرس اور پشاور پشاور کی ایک مسجد میں خطابت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

وہ دار العلوم حقانیہ کے اولین مدرسین میں سے تھے۔ دار العلوم کے قیام کے ابتدائی سال تو حضرت شیخ الحدیث مدظلہ ہی دورۂ حدیث شریف کے علاوہ کچھ موقوف علیہ کتابیں بھی اکیلے ہی پڑھاتے رہے۔ دوسرے سال یعنی یکم ذیقعدہ ۱۳۶۷ھ سے حضرت مدظلہ کے ایک تلمیذ رشید مولانا محمد شفیق صاحب فاضل دیوبند کو بھی تدریسی ذمہ داری سونپی گئی، جو وفات ۳ محرم الحرام ۱۳۷۰ھ تک پڑھاتے رہے۔ اور دار العلوم کے تیسرے سال یعنی یکم محرم ۱۳۶۸ھ سے ہمارے مولانا محمد فیاض صاحب مرحوم بھی زمرۂ مدرسین میں شامل ہوئے۔ ان ابتدائی سالوں میں دار العلوم کا یہی کل اثاثہ تھا۔ مولانا مرحوم کی تقرری بھی ۱۵ روپے مشاہرہ پر ہوئی، یہی دیگر مدرسین کا حال تھا کہ حسبۃً للہ یا برائے نام تنخواہ پر زہد و قناعت اور جانفشانی و یکسوئی کے ساتھ دار العلوم کے شجرۂ طوبیٰ کی آبیاری کرتے رہے۔

مولانا محمد فیاض مرحوم بعض ذاتی عوارض کی بناء پر شوال ۱۳۷۰ھ میں دار العلوم سے مستعفی

---

[1] مرحوم استاذ محترم حضرت مولانا سید شبیر علی شاہ صاحب کے بہنوئی تھے۔ (م)

ہو کر پشاور چلے گئے اور تادم واپسیں وہیں مصروفِ درس و تدریس رہے۔

دورۂ حدیث آپ نے قیام پاکستان کے متصل بعد کے ہنگامی سال دارالعلوم دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ سے پڑھا۔ اور دیوبند جانے سے قبل آپ نے اکوڑہ خٹک میں حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ سے معقول و منقول کی کتابیں پڑھیں۔ وطن اصلی ریاست دیر تھا۔ نمازِ جنازہ ۲۰ محرم ۱۳۹۸ھ کو بعد از نمازِ عصر پشاور میں پڑھی گئی اور قبرستان ستار شاہؒ میں سپردِ خاک کیے گئے۔

ایک خاموش، عابد و زاہد عالم اور جید مدرس کی وفات عمومی صدمہ ہونے کے علاوہ دارالعلوم کے لیے تو خصوصی طور پر موجبِ رنج ہے کہ وہ دارالعلوم کے قدیم اوّلین اساتذہ میں سے تھے، اور ذاتی طور پر احقر کے لیے بھی کہ کئی ایک کتابوں میں مجھے بھی ان سے تلمذ نصیب ہوا۔ حق تعالیٰ مرحوم کو درجاتِ عالیہ عطا فرماوے اور ان کے معصوم بچوں کا کفیل و کارساز ہو۔ آمین

الحق

جنوری ۱۹۷۸ء

مولینا سیّد قدرت شاہ رحمہ اللہ

عُرف غازی مُلاّ

۲۵/۲۴ مئی کی درمیانی شب کے دس بجے دارالعلوم کے ایک دیرینہ مخلص کارکن اور حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے ایک جان نثار خادم اور سفر وحضر کے رفیق مولانا سید قدرت شاہ صاحب[1] اکوڑہ خٹک کا ایک سو برس سے زائد عمر میں وصال ہوگیا۔ دارالعلوم حقانیہ کے فضلاء اور طلباءٔ و مُتعلقین میں آپ جانے پہچانے ہوں گے۔ مرحوم دارالعلوم کے سابق مدرس مولانا شیر علی شاہ صاحب حال جامعہ اسلامیہ مدینہ منوّرہ کے والدِ محترم تھے۔ نہ صرف تاسیس دارالعلوم سے لے کر اب تک آپ دارالعلوم کے بے لوث سرگرم کارکنوں میں سے تھے بلکہ اس سے بہت قبل میرے جدِّ امجد مرحوم کے ساتھ رفاقت کا رشتہ استوار کیا اور آخر تک نبھایا۔ قومی و ملّی کاموں میں یہ لوگ باہم دست و بازو تھے۔ خاکسار کا فتنہ حد سے بڑھنے لگا تو سب سے پہلے اکوڑہ خٹک میں اسے بھرپور لگام دینے کی کوشش کی گئی۔ یہ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ کا واقعہ ہے۔ اکوڑہ خٹک میں مولانا قدرت شاہ مرحوم کی مسجد سے اس ہنگامہ رستخیز کا آغاز ہوا جس[2] سے خاکساروں کو عبرتناک سبق ملا اور پورے برِّصغیر کے پریس میں اس کا چرچا رہا۔ اس کے بعد مرحوم کو "غازی ملاّ" کا

---

[1] مولانا قدرت شاہ بن مولانا عنبر شاہ ابن مولانا میر دیس شاہ۔ آپ کے اجداد شاہانِ مغلیہ کے دور میں بخارا سے باجوڑ اور باجوڑ سے ہشتنگر آئے۔ حضرت مولانا میر دیس شاہ بہت بڑے فقیہ گذرے ہیں۔ کنز اوّل و اخیر کے حافظ تھے۔ سکھوں کی جابرانہ حکومت میں مسلمانوں کی امداد فرماتے، اسی پاداش میں آپ کے گھر کو نذرِ آتش کیا گیا اور آپ کو شہر بدری کی سزا ملی (الحق)۔ (م)

[2] اسی اثناء میں خاکساروں اور مولانا غلام غوث ہزاروی رحمہ اللہ کے درمیان مناظرہ بھی ہوا تھا۔ خاکساروں کی طرف سے مولانا عبدالقہار مروت مناظر تھے جبکہ حکَم کے فرائض شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ نے انجام دیئے۔ (مرتب)

خطاب ملا اور عرفِ عام میں اسی لقب سے یاد کیے جانے لگے۔

آخر عمر میں مرحوم کو اپنے سعادتمند بیٹے کی بدولت نہ صرف حج و زیارت کی سعادت نصیب ہوئی بلکہ دو سال تک مدینہ منورہ کے قیام کی دولت سے نوازے گئے۔

دارالعلوم کی تاسیس اور نشاۃِ اولیٰ میں جس جماعت نے تن من دھن کو قربان کیا مرحوم کا نام بھی اس جماعت میں شامل رہے گا۔ انشاءاللہ

حق تعالے جانے والے تمام مرحومین کو درجاتِ قرب سے نوازے۔ آمین

الحق

نومبر ۱۹۷۸ء

◎

مولانا محمد شفیع اللہ صاحب

استاذ دار العلوم حقانیہ

سہ شنبہ ۵ صفر ۱۴۰۰ھ کو دار العلوم حقانیہ کے ایک سابق ممتاز مدرس حضرت مولانا محمد شفیع اللہ صاحب فاضل دیوبند اپنے آبائی گاؤں بام خیل ضلع مردان میں انتقال فرما گئے۔ تدفین بھی وہیں عمل میں آئی۔ جنازہ میں سینکڑوں مسلمانوں اور علماء و صلحاء نے شرکت کی۔

مولانا مرحوم دیوبند کے جید فضلاء میں سے تھے۔ شوال ۱۳۷۹ھ سے رمضان ۱۳۹۰ھ تک یعنی تقریباً گیارہ برس تک دار العلوم حقانیہ میں اعلیٰ علوم و فنون کی تدریس دیتے رہے۔ وجاہت و ظرافت، اخلاق و کردار، علم و عمل ہر لحاظ سے ایک برگزیدہ استاذ تھے۔ ان کی وفات علمی حلقوں کے لیے عموماً اور دار العلوم حقانیہ کے لیے خصوصاً باعثِ غم ہے۔

حق تعالیٰ مرحوم کو بہترین اور اعلیٰ درجات سے نوازے اور ان کے متعلقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

الحق

دسمبر ۱۹۷۹ء

آہ ! مولانا محمد علی

استاذ دارالعلوم حقانیہ

۱۱ محرم الحرام ۱۴۰۱ھ کا دن دارالعلوم کے لئے ماتم وشیون کا دن بنا کہ دارالعلوم کے ایک قدیم جید اور متبحر بزرگ استاذ حضرت العلامہ الحاج استاذنا المحترم مولانا محمد علی صاحب سواتیؒ صبح دس بجے یکایک اس دارِ فانی سے منہ موڑ کر واصل بحق ہوئے۔ وصال کا سانحہ بھی عجیب قابلِ غبطہ اور لائق صد رشک شکل میں پیش آیا، فقہ حنفی کی مستند ترین کتاب ہدایہ آخرین کی درس سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ اچانک دل کا دورہ پڑا، چارپائی پر لٹا دئے گئے جسم اتنا ملائم نرم اور ساتھ ہی گرم بھی تھا کہ ہم سب لوگوں کو کافی دیر گذرنے کے باوجود وفات کا یقین نہیں آرہا تھا، اساتذہ اور حضرت شیخ الحدیث مدظلہ گریہ سے بے قابو تھے اور دعا فرماتے ہوئے مولانا کو شہیدِ علم قرار دیا۔

ابھی چند لمحے وہ قرآن وحدیث پر مبنی احکامِ شرعیہ کی تشریح وتوضیح فرمارہے تھے، کراماً کاتبین نے دفتر اعمال کا آخری صفحہ درسِ ہدایہ کی شکل میں قلمبند کیا۔ عالم نزع کی حالت میں اور موت کی دہلیز میں قدم رکھتے ہوئے بھی علمی مسائل ومباحث اور کتابوں کی درس و تدریس کی ایسی مثالیں سلف میں بھی موجود ہیں، مگر بہت خال خال۔ ابھی چند اور قبل ہمارے حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ بھی اسی تعلیم وتعلّم کی کیفیت میں من المھد الی اللحد کا جیتا جاگتا مصداق بن گئے تھے۔ مرحوم حضرت مولانا محمد علی پچھلے دو تین سال سے متعدد امراض کی بناء پر درسگاہ تک جانے سے قاصر ہوگئے مگر ہدایہ آخرین اور طحاوی شریف کے طلبہ کو اپنی قیام گاہ میں آکر پڑھنے پر مامور کیا تھا۔ چنانچہ وفات سے قبل ہدایہ کا درس حسب معمول دیا۔ نویں اور دسویں محرم کو عاشورہ کے روزے رکھے تھے۔ اغلب یہ ہے کہ آج بھی اسی ضعف

نقاہت اور عوارض کے باوجود روزہ سے تھے ۔ اور بحالت صوم فرحت لقاء رب ، سے
مالا مال ہوئے ۔ مولانا مرحوم کی خواہش تھی کہ ان کی تدفین بھی دار العلوم ہی کے قبرستان (جس
کیلئے عیدگاہ کے جنوبی دروازہ سے باہر جگہ مخصوص کی گئی ہے) میں ہو ، مگر حضرت کے
صاحبزادگان اور پسماندگان کی خواہش پر ان کے آبائی گاؤں شالفین ضلع سوات لاش لے جانے
کا فیصلہ کیا گیا ۔ اطراف میں فون پر اطلاع دی گئی ، ریڈیو پاکستان نے بھی شام تک دو ایک
بار خبر نشر کی غسل اور تجہیز و تکفین کے انتظامات بڑی تیزی سے ہوئے اور پونے ایک بجے
دوپہر دار العلوم کے صحن میں سینکڑوں علماء و صلحاء اساتذہ و طلبہ نے باچشم پرنم دار العلوم
کے اس دیرینہ اور مخلص ترین خادم علوم کتاب و سنت ، اور مشفق استاذ کا جنازہ حضرت
شیخ الحدیث مولانا عبد الحق مدظلہ کی امامت میں پڑھا ۔ عام دیدار کے بعد نعش مبارک سوات
روانہ ہوئی ، اساتذہ و طلبہ کی ایک بڑی تعداد ساتھ تھی ، خود احقر بھی سوات میں تدفین اور
اس کے بعد تک سارے مراحل میں ساتھ رہا ، شام کے بعد نعش ان کی قیام گاہ خوازہ خیلہ پہنچی ،
دوسرے دن بروز جمعہ صبح نو بجے سوات میں دوبارہ نماز جنازہ پڑھی گئی علماء صلحاء اور آپ
کے معتقدین تلامذہ اور عام مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت اس میں شریک ہوئی ۔ تدفین یہاں
سے تین چار میل دور آبائی قصبہ شالفین میں ہوئی ۔

حضرت کے پسماندگان اور مقامی علماء اور مسلمانوں کے اصرار پر بعد از تدفین
احقر نے موت العالم پر اپنے تاثرات پیش کئے اور اس طرح نماز جمعہ سے کچھ قبل ہم دار العلوم
کے ایک مثالی استاذ علم و عمل کی جامع شخصیت اخلاص و سادگی کے پیکر طلبہ سے شفقت
اور دار العلوم سے گرویدگی کی ایک زندہ جاوید نشانی علوم نبویہ کے ایک عاشق زار ۔ الغرض
ایک گنج گرانمایہ کو وادی سوات کی پرسکون اور خاموش وادی میں سپرد خاک کر کے اپنے
دل میں مولانا مرحوم کے تقریباً تیس سالہ تعلق و محبت کی انمٹ یادوں کا سرمایہ لئے واپس
ہوئے ۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون ۔

مولانا مرحوم ۱۹۱۹ء میں بمقام شالفین ضلع سوات ایک علمی گھرانہ میں پیدا ہوئے
والد ماجد کا نام مولانا عنایت اللہ صاحب تھا ۔ اسی خاندان کے حضرت مولانا سید احمد

صاحب عرف شالفین صاحبحق المتوفی مکہ معظمہ سابق مدرس دارالعلوم حقانیہ آپ کے ماموں تھے۔ ان کی وفات کے بعد آپ نے تقریباً تیس برس قبل دارالعلوم حقانیہ کی تدریس کے فرائض سنبھالے اور بہت جلد طبقۂ علیا کے ممتاز اساتذہ میں شمار ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ کے علماء سے حاصل کی پھر ۱۹۴۳ء میں آپ نے مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لیا۔ تین سال رہ کر وہاں کے اساتذہ سے تکمیل علوم کی کچھ عرصہ سہارنپور کے ایک دارالعلوم میں تدریس کی۔ آٹھ سال تک حکمت آباد کے مولانا میاں مسرت شاہ صاحب مرحوم کے ہاں تدریس میں مشغول رہے اس کے بعد دارالعلوم حقانیہ ہی کے ہو کر رہ گئے آپ کی طلباء سے بے تکلفی اور شفقت مثالی تھی مگر اس کے ساتھ ضبط و ڈسپلن اور امتحانات میں سخت گیری اور طلبہ کے احتساب کی بھی مثال نہیں۔ ان کی وفات سے نہ صرف دارالعلوم بلکہ پورا ملک عہدِ سلف کے ایک معیاری نمونہ اور مثالی شخصیت سے محروم ہوگیا[1]

پسماندگان میں بڑے صاحبزادے دارالعلوم کے فارغ التحصیل ہیں۔ دو فرزند اس وقت دارالعلوم ہی میں زیرِ تعلیم ہیں۔ اللھم ارحمہ واکرم مثواہ وبرّد مضجعہٗ

الحق

اکتوبر، نومبر ۱۹۸۰ء

---

[1] راقم سطور نے آپ سے کافیہ، ھدایہ اخیرین اور مختصر المعانی میں درس لیا ہے۔ امتحان اور پرچوں میں سخت گیری کا یہ عالم تھا کہ مختصر المعانی کے پرچہ میں بندہ کو نوے ۹۰ نمبر دیئے، حالانکہ میں نے تمام سوالات صحیح طور سے حل کیے تھے۔ بعد میں میرے استفسار پر فرمایا کہ "یہ دس نمبر میں نے آپ سے اس لیے کاٹ دیئے ہیں کہ آپ نے قریب بیٹھے ہوئے طالبعلم کو ایک لفظ کا معنیٰ بتایا تھا" (حالانکہ وہ میرے ساتھ پرچہ میں شریک نہیں تھا) اسی طرح اپنے صاحبزادے برادرم مولانا عبدالصمد کو غالباً مختصر المعانی میں صرف تین ۳ نمبر دیئے تھے۔ کبھی کبھی انتہائی کمزور اور نالائق طالبعلم کو (صفر) نمبر بھی دیتے تھے۔ لفظ ضؔ کے تلفظ میں ظوادیہ سختی سے کاربند رہے اور دوآد کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے۔ دورانِ درس کسی ضعیف مذہب کے لیے بطور تمثیل دوآد استعمال کرتے۔ (مرتب)

الحاج شیر افضل خان بدرشی

۱۰رجنوری ۱۹۸۰ء کو دارالعلوم حقانیہ کے ایک دیرینہ اور بے لوث خادم اور بنیادی رکن جناب الحاج شیر افضل خان صاحب آف بدرشی داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ عمر ستر سال کے لگ بھگ تھی سعی و عمل جوش اور ہمت کے لحاظ سے قابلِ رشک صحت تھی کہ یکایک سال قبل مرض نے آگھیرا۔ ڈاکٹروں نے سرطان کی تشخیص کی اور یوں پہاڑ کی طرح ایک فولادی شخص دنوں اور گھنٹوں میں پگھل کر مشت استخوان بن گیا۔ وقت موعود آپہنچا اور واصل بحق ہوئے۔

دوسرے دن حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے نماز جنازہ پڑھائی جس میں علاقہ بھر کے معززین شرفاء کے علاوہ دارالعلوم حقانیہ کے اکثر طلباء اور اساتذہ نے بھی شرکت کی اور نمناک آنکھوں کے ساتھ دین، علم اور دارالعلوم کے اس مخلص خادم کو سپرد خاک کیا۔

حاجی شیر افضل خان مرحوم کا تعلق جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے رہا۔ اسلامیہ کالج پشاور میں انہوں نے تعلیم حاصل کی۔ پھر دنیاوی کاروبار میں مشغول ہو گئے اور بلند مقام حاصل کیا۔ دنیوی وجاہت، کاروباری زندگی، جدید سوسائٹی کے باوجود وہ ابتدا ہی سے اکابر علماء حق سے وابستہ ہوئے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی، شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی عقیدت و محبت طبیعت میں رچی بسی ہوئی تھی۔ جمعیۃ العلماء اسلام کے گرویدہ تھے۔ اور اس کے قائد حضرت مولانا عبداللہ درخواستی مدظلہ اور حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدظلہ سے آخر تک گہرے مراسم رہے۔ ان حضرات اکابر کے مسلک و مشرب اور مطلقاً طبقہ علماء

مشائخ کی ترجمانی اور ان کی پر زور وکالت کا کوئی موقعہ وہ جانے نہیں دیتے تھے چند سال قبل تک وہ ماڈرن لباس میں رہے۔ کہا کرتے کہ اس طرح میں علماء کے استخفاف کرنے والی اونچی سوسائٹی میں جارحانہ تعاقب کرسکتا ہوں۔ باطن کی یہ نجابت و طہارت بالآخر انکی صورت اور حلیہ پر بھی غالب آگئی۔

دارالعلوم حقانیہ کو حق تعالی نے ابتداء سے تاسیس میں جن مخلص ترین گنے چنے ارکان اور تعلق سے نوازا ان میں حاجی صاحب مرحوم کا بھی ایک نمایاں مقام تھا۔ دارالعلوم کی نئی تعمیر کے لئے اس جماعت نے بایں ہمہ وجاہت اہل خیر کی خدمت میں جاکر اور جھولی پھیلا کر مانگنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ وہ آخر تک تعمیری کمیٹی کے صدر اور مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ ان مخلص خدّام دین کی خدمات کو اللہ تعالی نے قبول فرمایا۔ ایک چھوٹی سی مسجد میں قائم ہونے والا مدرسہ دارالعلوم حقانیہ کی شکل میں شجرۂ طوبیٰ بن چکا ہے۔ اصلہا ثابتٌ وفرعہا فی السماء۔

یقیناً حق تعالی ان عظیم خدمات کو ان حضرات کے لئے اب ذخیرۂ عقبیٰ اور زادِ آخرت کی شکل میں ظاہر فرماویں گے۔ خدا تعالی حاجی شیر افضل خان مرحوم کو اپنے قرب و رضا کے بہترین مقامات سے نوازے اور ان کے تمام پسماندگان میں مرحوم کی دینی حمیّت و غیرت کے جذبات کو جاری و ساری رکھے۔

الحق
جنوری ۱۹۸۱ء

◎
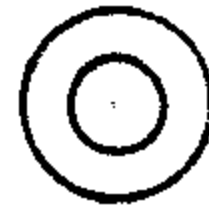
آہ استاذنا المکرم

مولانا عبد الحلیم[1] رحمۃ اللہ علیہ

ے تو آگہی کہ مرا از غروب ایں خورشید
چہ گنجہائے فراواں زبانِ جاں آمد

آہ کہ چمنستانِ علم و فضل اور گلستانِ قرآن و سنّت کا سدا بہار گل سرسبد مُرجھا گیا اور گلشن دین متین کا چہکتا ہوا عندلیب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ دار العلوم حقانیہ کے دار الحدیث کے در و دیوار ان کی صدائے قال اللہ اور قال الرّسول کے لیے ترستے رہ گئے یعنی حضرت علامہ جامع المعقول والمنقول متکلم اسلام، شارح قرآن، ترجمان حدیث، بقیۃ السلف حضرت الاستاذ مولانا عبد الحلیم صاحب صدر المدرسین دار العلوم حقانیہ انتقال فرما گئے۔

اور ۲۰ ربیع الاوّل ۱۴۰۳ھ مطابق ۶ جنوری ۱۹۸۳ء بروز جمعرات غروب شمس سے قبل (ساڑھے چار بجے) آسمانِ علم و ہدایت کا یہ درخشندہ آفتاب غروب ہو گیا۔ مولانا مرحوم کی زندگی اکثر حصہ گوناگوں جسمانی عوارض، علالت اور ضعف و نقاہت میں گذرا، مگر طالبعلمی سے لے کر آخر دم تک یہ زار و نزار اور نحیف خادم اسلام اشاعتِ قرآن و سنت اور درس و تدریس علوم و فنون میں تندرست و توانا انسانوں سے بڑھ چڑھ کر مشغول و منہمک رہا، اور یہ ساری کلفتیں اور صعوبتیں اس کی راہ میں رکاوٹیں نہ بن سکیں۔ پچھلے دو سال سے ضعف اور علالت کا سلسلہ بڑھ گیا تھا۔ اس سال تعلیمی سال کا آغاز ہوا تو بیماری نے شدت اختیار کر لی مگر ذیقعدہ کا سارا مہینہ تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ احقر کے

---

[1] بندہ کے والد محترم قدس سرہ العزیز (مرتب)

مشورہ پر ذی الحجہ کے آغاز میں کراچی کے جناح ہسپتال میں بغرض علاج داخلہ لیا اور دو اڑھائی مہینہ چند مخلص ڈاکٹروں کے زیرِ علاج رہے۔ واپسی میں بوجہ ضعف وعلالت دارالعلوم آنے کے بجائے سیدھے آبائی گاؤں زروبی تحصیل صوابی تشریف لے گئے اور اجلِ موعود تک وہیں صاحبِ فراش رہے۔ وفات سے کچھ روز قبل مولانا مفتی محمد فرید مدظلہٗ مدرس دارالعلوم حقانیہ کی والدہ محترمہ کے جنازہ میں شرکت کے لیے حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ دیگر اساتذہ اور طلبار کے ساتھ ان کے گاؤں زروبی تشریف لے گئے تو ان کی عیادت کے لیے سب حضرات گئے، کافی افاقہ ہو گیا تھا اور ہشاش بشاش تھے، یہ حضرت الاستاذ سے سب کی آخری ملاقات تھی۔ وفات کے دن نماز ظہر ادا فرمائی، تشویش کے خاص آثار نہ تھے، گھر میں ختم خواجگان کرانے کی فرمائش کی، سعادتمند اہلبیت نے تعمیل حکم کی اور مولانا کو اطلاع دی تو بڑے خوش ہوئے اور کہا یہ تو کئی افراد مل کر پڑھتے ہیں آپ لوگوں نے بڑی ہمت کی۔ پھر فرمایا کہ ختم خواجگان سے زیادہ زوداثر سورۃ التغابن ہے اور اس کے بارہ میں اپنے تجربات سُنائے، پھر ایک پیالی چائے نوش فرمائی اور طبیعت یکایک خراب ہو۔ اہلیہ محترمہ کو فرمایا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری دُعا کا وِرد کریں، انہوں نے کہا کہ میں تو اضطراب کی وجہ سے بھول گئی ہوں، فرمایا حزب البحر میں بھی وہ دعا موجود ہے، پھر خود ہی زبان مبارک سے اس کا ورد شروع فرمایا: اللّٰھم اغفر لی وارحمنی والحقنی بالرفیق الاعلیٰ آخر تک زبان مبارک ہلتی رہی، کچھ کلمات سمجھ میں نہیں آرہے تھے کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔[1] یہ اندوہناک اطلاع عشاء کے وقت دارالعلوم

---

[1] عبید الغفور سے بندہ نے مادۂ سن وفات نکالا ہے:۔

سینہ میں اضطراب ہے دل چور چور ہے — یہ کس کے غم سے عقل وخرد میں فتور ہے

ہر دل تڑپ رہا ہے ان کی یاد و ہجر سے — ہر لب پہ ہر زباں پہ ذکر حضور ہے

تربت پہ تیری آکے تو محسوس یہ ہوا — اللہ یہ مرقد ہے کہ جھلائے نور ہے

فانیؔ اِنہ کیوں مقام ہو خُلد شیخ وقت کا

جب سالِ انتقال عبید الغفور ہے (مرتب)

۱۴۰۳ھ

پہنچی تو ہر طرف رنج وغم کی گھٹائیں ظلمتِ شب میں اضافہ کر گئیں ؎

الٰہی سنسان کبھی پہلے نہ تھی ہجر کی رات
دُور تک قافلۂ صبح کے آثار نہیں

دُوسرے دن جمعہ کا مبارک دن تھا، دار العلوم سے حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ اساتذہ اور طلبہ بڑی تعداد میں نماز جنازہ میں شرکت کے لیے ان کے گاؤں زروبی گئے، ۲ بجے بعد از نماز جمعۃ المبارک حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ نے نماز جنازہ پڑھایا، علماء وصلحاء اہل علم وفضل کا ایک سیلاب تھا جو چاروں طرف سے اُمڈ کر اہل اللہ کی مقبولیت کا ایک روشن ثبوت بنا ہُوا تھا۔
نماز جنازہ کے بعد حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ نے گلوگیر آواز سے حضرت مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا اور دعائے رفع درجات کروائی۔

حضرت مولانا مرحوم کا دیدار عام ہُوا۔ چہرۂ انور پر نور وطمانیت اور سکون کا عجب سماں تھا اور ہمہ گریاں تو خنداں کا منظر سامنے تھا، قبر کی پہلی رات بہت سے لوگوں نے دیکھا کہ قبر مبارک اور جہاں جہاں دن کو جنازہ رکھا گیا تھا، وہاں نور کے شعلے اُٹھ رہے تھے۔ دوسرے دن دار العلوم کے تمام شعبوں میں تعطیل رہی، دار الحدیث میں قرآن خوانی ہوئی حضرت شیخ الحدیث اور دیگر اساتذہ وطلبہ نے مولانا مرحومؒ کی علمی خدمات پر روشنی ڈالی اور ایصالِ ثواب کیا۔

دار العلوم کا یہ جلیل القدر اُستاذ اور وقت کا ایک جید عالم اور علومِ کتاب وسنت کا یہ بے لوث خادم ۱۹۰۸ء میں مولانا خلیل الرحمٰن بن مولوی شاہ غریب بن مولانا سعد الدین کے گھر زروبی تحصیل صوابی ضلع مردان میں پیدا ہوئے۔ پرائمری تک تعلیم کے بعد گھر پر آس پاس کے علمی مراکز کے جید علماء سے تحصیلِ علم کیا۔ علاقہ چھچھ اور صوبہ سرحد کے جامع العلوم اساتذہ سے علوم وفنون حاصل کرتے رہے۔ تکمیل کے لیے ۱۳۵۱ھ میں دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۵۳ھ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ اور دیگر اساتذہ سے دورۂ حدیث شریف پڑھا۔ فراغت کے بعد مدرسہ رحیمیہ دہلی میں تین سال پڑھاتے رہے، وہاں سے مدرسہ رحمانیہ دہلی منتقل ہونے کے بعد دس سال تک تدریس کی خدمات انجام دیں تقسیم ہند کے بعد دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا قیام عمل میں آیا تو دار العلوم میں تدریس شروع کی مگر خرابی صحت

کی وجہ سے یہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا اور تقریباً ۲ سال گھر پر رہے مگر درس کا شغل کچھ نہ کچھ جاری رہا۔ ایک سال بغرض علاج کراچی بھی رہے اور مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی میں اعلیٰ کتابوں کی تدریس جاری رکھی۔ بالآخر ۱۹۵۸ء میں دوبارہ دار العلوم حقانیہ سے وابستہ ہو گئے اور اس وابستگی کو آخر دم تک ایسا نبھایا کہ بڑے بڑے محرکات اور دواعی سے بھی ٹکرا کر دار العلوم کی قوت لایموت اور کفاف پر قانع رہے اور تفسیر و حدیث اور فنون کی اعلیٰ کتابیں مثالی صلاحیت اور عبقری انداز میں پڑھاتے رہے اور ہزاروں تلامذہ کو مستفید کیا۔ آخر میں مسلم شریف، بیضاوی شریف اور تلویح جیسی اہم کتابوں کی تدریس آپ کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔ علمی مزاج متکلمانہ اور فلسفیانہ تھا۔ ہر مسئلہ زیر بحث کی عجیب تنقیح فرماتے اور جچے تلے انداز میں موضوع کا تحلیل اور تجزیہ کرتے کہ گویا کوئی لکھا ہوا مقالہ سنا رہے ہیں، کلام حشو و زوائد اور تکرار سے پاک رہتا۔

قرآن و سنت اور دیگر علوم و فنون کے علاوہ شعر و شاعری کا بھی اعلیٰ ادبی ذوق تھا۔ عربی اور فارسی میں کئی عمدہ قصائد اور مراثی زمانہ طالب علمی سے لکھتے رہے۔ طبیعت میں جمال کے ساتھ ساتھ جلال بھی بھرپور تھا، حمیتِ حق کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ کسی نے اضمحلالِ دین کا کوئی نقشہ پیش کر دیا تو بے حد بے چین ہو جاتے، منکرات پر برملا رد کرتے۔ بارہا ایسے امور میں اہلِ قصبہ اور اپنے محلہ کے سامنے ڈٹ گئے اور جم کر مقابلہ کیا۔

عوامی زندگی سے گریزاں اور اپنے علمی مشاغل میں منہمک رہتے۔ موجودہ علمی زوال اور طلبہ کے علمی انحطاط پر بے حد کڑھتے تھے اور طلبہ کے ساتھ اس بارہ میں مدارس کے تسامح اور رواداری پر ناراض ہوتے تھے، درس میں بھی طلبہ کو ہر لحاظ سے ٹوکتے۔ عبارت میں اعراب کی غلطی پر سخت گرفت فرماتے، داخلہ کے امتحانات کے وقت بھی چاہتے تھے کہ صرف اہل اور محنتی طلبہ کو ترقی دی جائے۔ ختم بخاری شریف کی تقریب میں جب وہ اپنی مقروءہ کتابوں کی اجازتِ حدیث دیتے تو اسے کڑی شرائط اور اہلیت و صلاحیت کے ساتھ مشروط فرماتے۔

الغرض زہد و تقویٰ، سادگی، للہیت، ایثار، حمیتِ دینی، علمی شغف و انہماک ہر ہر وصف میں اپنے اسلاف کا نمونہ تھے۔ صفحات کی تنگی دامن کو کھینچ کھینچ کر نہ بھی روکتی تب بھی جاننے والے مرحوم استاذ کے کمالات[1] کی مکمل تصویر کشی کہاں ممکن ہے

قلم بشکن، سیاہی ریز، کاغذ سوز، دم درکش
حمیدؔ ایں قصۂ عشق ست در دفتر نمی گنجد

تدمع العین ویحزن القلب ولا نقول الا ما یرضی ربنا وانا بفراقك یا شیخنا لمحزنون تغمدك اللہ بنعمائہ واسکنك فسیح جنانہ۔ (آمین)

---

[1] آپ کی مفصل سوانح حیات پر مشتمل کتاب زیرِ طبع ہے۔ (مرتب)

مولانا مصطفےٰ احسن صاحب رحمہ اللہ

استاذ دار العلوم حقانیہ

ماہ رواں جمادی الاول ۱۴۰۳ھ کی تیرہ تاریخ کو دار العلوم حقانیہ ایک اور بڑے صدمہ سے دوچار ہوا، ابھی حضرت علامہ مولانا عبدالحلیم مردانی قدس سرہٗ کا غم تازہ تھا کہ دار العلوم کے ایک جید اور ممتاز استاذ حضرت مولانا مصطفےٰ احسن نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ مولانا مرحوم ابھی کہولت کی سرحد کو پار نہیں کرنے پائے تھے کہ خالق حقیقی کا بلاوا آیا اور وہ علم ودین کی محفلوں کو افسردہ چھوڑ کر چلے گئے پاکستان میں دینی علوم کی تکمیل کے بعد وہ جامعہ اسلامیہ مدینہ طیبہ گئے اور وہاں سے فراغتِ علوم کی ڈگری پائی۔ فراغت کے بعد سعودی عرب کے ادارۂ افتاء وارشاد نے شوال ۱۴۰۰ھ میں آپ کی تقرری دار العلوم حقانیہ میں کرائی اور اسی ادارہ کی طرف سے آپ بطور مبعوث استاذ کے فرائضِ تدریس انجام دیتے رہے پچھلے سال اچانک معدہ کی بیماری نے آپ کو گھیر لیا۔ بہت علاج کیا گیا لیکن صحت نہ ملی اور ۱۳ جمادی الاول کو رحلت فرما گئے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ نے نماز جنازہ پڑھائی آبائی گاؤں حمید ضلع اٹک میں سپرد خاک کیا گیا۔

فرحمہ اللہ وارضاہ۔

الحق

فروری ۱۹۸۳ء

مولانا سلطان محمود صاحبؒ

ناظم دار العلوم حقانیہ

حیف صد حیف کہ ۸-۹ مئی ۱۹۸۴ء مطابق ۶-۷ شعبان ۱۴۰۴ھ کی درمیانی شب کو ایک ایسے خادمِ دینِ متین نے ہم حرماں نصیبوں کو داغِ جدائی دیا کہ جس کی زندگی کا دو تہائی حصہ گلشنِ علومِ نبوت دار العلوم حقانیہ کی آبیاری اور اس چمنستانِ قرآن و سنت کی آرائش و زیبائش میں صرف ہوا۔ دار العلوم کے تقریباً ۴۰ سالہ زندگی کے ہزاروں فضلاء اور طلباء کے آرام و راحت، تعلیم و تربیت اور خدمت میں جن کے جسم کا رواں رواں مصروفِ لیل و نہار رہا، اور جو اس شجرِ طوبیٰ کے اولین مالی اور اس کارگاہِ علم و فضل کے اساسی ناظم تھے۔

خادمِ علم و دین ناظمِ اعلیٰ دار العلوم حضرت مولانا الحاج سلطان محمود صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے ان فضائل و کمالات کا دار العلوم سے معمولی تعلق رکھنے والا ہر فرد بھی نہ صرف معترف رہے گا بلکہ انشاء اللہ یوم الاشہاد میں بارگاہِ احکم الحاکمین میں شہادت سے بھی دریغ نہیں کرے گا، کہ اے اللہ تیرے اس زار و نزار نحیف و ناتواں بندہ نے تیرے دین کے اس خادم ادارہ کی تعمیر و ترقی میں زندگی کی ساری قوتیں اور توانائیاں بے دریغ لٹا دیں، تیری رحمتِ لامتناہی سے کیا بعید ہے کہ اس "شہیدِ دار العلوم" کو آج شہداء و صدیقین کے لیے مخصوص انعامات سے نوازا جائے۔

مولانا سلطان محمود صاحبؒ کی عمر تقریباً ساٹھ برس تھی، وہ اکوڑہ خٹک کے ایک مضافاتی گاؤں مغلکی کے ایک غیر معروف گمنام اور غریب گھرانے میں پیدا ہوئے جو دینی علوم سے وابستہ نہیں تھا، مگر اللہ نے آگے چل کر ان سے علومِ دینیہ کی خدمت لینا تھی تو اللہ نے انہیں تحصیلِ علم میں لگا دیا۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کے مختلف علماء سے حاصل کرتے رہے۔

حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے تدریس دیوبند سے قبل بھی انہیں ان سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔ تقسیم سے دو سال قبل ہندوستان جاکر مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لیا۔ وہاں شرح جامی مختصر المعانی، ہدایہ اولین، مقامات سلم، ملاحسن وغیرہ پڑھیں اور سالانہ امتحانات دیئے۔ اس دوران دیگر اکابر اساتذہ کے علاوہ اُس وقت کے صدر المدرسین شیخ الحدیث مولانا عبدالرحمٰن کاملپوری ؒ سے "ملاحسن" پڑھنے کی سعادت بھی پائی۔

تعطیلِ رمضان میں گھر آئے تو ملک تقسیم ہوگیا اور حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایسے وابستہ ہوئے کہ حیاتِ مستعار کی دمِ آخرین تک انہی کے ہوکر رہ گئے۔ ادھر دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا تو آپ اس کے گنے چُنے اولین طلبہ میں شامل تھے۔ ان سالوں میں دورہ حدیث کے علاوہ مشکوٰۃ شریف، ہدایہ اخیرین وغیرہ بھی حضرت مدظلہ خود ہی پڑھاتے تھے، تو پہلے سال موقوف علیہ کتابیں بھی حضرت ہی سے پڑھیں۔ دوسرے سال ۱۳۶۸ھ میں پورا دورہ حدیث شریف بھی حضرت سے پڑھ لیا، بعد فراغت تکمیل علم کے شوق میں بیضاوی شریف تلویح توضیح میں داخلہ لیا۔ اساتذہ وعملہ سے متعلق فائلوں میں جسے وہ خود مرتب کرتے تھے اپنے متعلق فائل ۸ میں تحریر فرماتے ہیں کہ :-

——"مہینہ ڈیڑھ بعد حضرت الشیخ مدظلہم العالی نے از راہ شفقت وکرم نوازی دارالعلوم کے دفتر میں خدمت کرنے کا حکم فرمایا۔ چنانچہ ۱۳۶۸ھ کے آخر میں ناظم دفتر اہتمام کی حیثیت سے مبلغ آٹھ روپے مشاہرہ پر تقرر ہوا"——

یہاں سے خدمتِ دارالعلوم کا دور شروع ہوا جو ابتدائی دور تھا اور ہر لحاظ سے بے سروسامانی کا عالم، دو چار کاپیوں پر مشتمل چھوٹا سا بستہ دارالعلوم کے حساب کتاب اور انتظامی امور کا سارا ریکارڈ تھا جسے ناظم صاحب بغل میں لیے پھرتے تھے اور فارغ ہوجاتے تو مسجد قدیم کے ایک بوسیدہ طاقچہ میں رکھ دیتے۔ اکاؤنٹ اور آڈٹ ان کا فن نہیں تھا مگر قدرت نے کام لینا تھا تو از خود حساب کتاب کے ایسے طریقے اور گُر نکالتے رہے کہ آڈٹ والے بھی دیکھ کر حیران رہ جاتے۔ رفتہ رفتہ وہ ملکہ حاصل ہوا کہ بڑے بڑے گوشواروں پر ایک نظر ڈالنی کافی ہوجاتی اور جمع تفریق کر لیتے۔ اس بیماری کے آغاز میں دماغی امراض کے ایک دو ڈاکٹروں کو دکھاتے

ہوتے ہیں نے اُن کے اِس وصف کا ذکر کیا تو انہوں نے تشخیصِ مرض کے طور پر لمبے چوڑے اعداد و شمار پر مبنی سوالات کیے، اور فی البدیہہ جواب سُن کر یہ کہتے ہوئے دنگ رہ گئے کہ واقعی یہ تو کمپیوٹر ہیں۔ دارالعلوم کے لاکھوں روپے کا نہایت باضابطہ اور صاف ستھرا حساب کتاب رکھنے میں ان کا نمایاں اور اہم وصف دیانت اور امانت تھا، جسے ایمانی زندگی کی روح کہنا چاہیئے۔ گویا وہ مجسمۂ دیانت اور پیکرِ امانت تھے۔ چالیس سال کے ان لمبے چوڑے حسابات میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ ایک حبّہ یا ایک پائی بھی دانستہ ان سے ضائع ہوئی ہو۔ وہ تمام مصارف اور بلوں پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ اور جب قویٰ مضبوط تھے تو راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر دارالعلوم کے احاطوں میں گھومتے کہ کہیں بے جا بلب یا پنکھا تو نہیں چل رہا یا کوئی اور چیز غلط مصرف میں خرچ نہ ہو، اِس لحاظ سے وہ طلبہ میں سخت گیر سمجھے جاتے تھے، وہ طلبہ کی حرکات و سکنات پر کڑی نگاہ رکھتے، کوئی نامناسب بات دیکھتے تو سرزنش کرتے یہ نہ ہو سکتا تو دل ہی دل میں کُڑھتے اور بہت حسّاس ہونے کی وجہ سے تڑپتے ہوئے دکھائی دیتے۔ تیسرا نمایاں وصف ان کی تواضع اور انکساری تھی، وہ ایک مُستند عالم اور ایک عظیم ادارہ کے ناظمِ اعلیٰ تھے۔ بیشمار طلبہ اور فضلاء کے منظورِ نظر بننے کے باوجود کسی ادنیٰ سے ادنیٰ خدمت کے لیے بھی خود دوڑتے ضرورت پڑتی تو دفتر میں اپنی سیٹ چھوڑ کر مہمانوں کے سامنے برتن رکھتے اُٹھاتے اور موقع ملتا تو ہاتھ دُھلوانے میں بھی سبقت لے جاتے۔ کہیں بھی کسی خدمت کی ضرورت پڑتی اور کوئی نہ ملتا تو خود کمر باندھ لیتے۔ ابتدائی دور میں تو مجھے خوب یاد ہے کہ گاؤں سے دو تین میل پیدل پہنچتے ہی بازار سے مطبخ کا سودا سلف کا ٹوکرا سر پر اُٹھائے ہوئے گھر کے دروازہ پر دستک میں لگے رہتے (کہ اوّلین سالوں میں طلبہ کے لیے ہمارے گھر ہی میں کھانا پکلنے کا نظم تھا) یہ سب کچھ اس وجہ سے کہ وہ دارالعلوم میں اپنی ذات کو فنا کر چکے تھے اور ان کے رگ و ریشہ میں دارالعلوم ہی رچا بسا تھا۔ شاید اللہ تعالیٰ کو اسی وجہ سے ان کا لاولد رہنا منظور تھا کہ دُنیا کے سارے علائق سے الگ تھلگ رہ کر اس مہمان خانۂ علومِ نبوت علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ کے بناؤ سنگھار میں مصروف رہیں۔

انہیں اس بات کا افسوس رہتا کہ خود دینی علوم کی درس و تدریس سے محروم رہے، مگر یہ

اطمینان تھا کہ ان کی ساری جسمانی اور ذہنی توانائیاں مدرسین، علماء و مبلغین کی خدمت میں خرچ ہو رہی ہیں۔ آج کون کہہ سکتا ہے کہ دارالعلوم کے تین ساڑھے تین ہزار فضلاء کی ہمہ گیر دینی خدمت میں ناظم صاحب مرحوم کا حصّہ نہیں ہوگا، یہ سب کچھ انشاء اللہ تعالیٰ ان کے نامۂ حسنات میں بھی شامل ہوگا۔

مرحوم ناظم صاحب نرے انتظامی اُمور کے ناظم اور حسابات کے منشی نہیں تھے بلکہ اس خشک مشغلہ کے باوجود دلِ پُرسوز رکھتے تھے۔ عبادات میں شب و روز منہمک، زہد و تقویٰ کا ایک نمونہ تھے، وہ نیکیوں کے کسی میدان میں بھی پیچھے نہیں رہنا چاہتے تھے۔ گرمی اور دن بھر کی تھکاوٹ کے باوجود رمضان کی راتیں شب خیزی میں گذرتیں۔ پچھلے رمضان میں بھی آخری رات تک کہیں نہ کہیں ختمِ تراویح کا معلوم کر کے پہنچتے اور قیام اللیل کی سعادت پاتے۔ کہیں کسی مردِ کامل کی صحبت میسر آئی تو اسے نعمتِ عظمیٰ سمجھ کر اس کے قدموں کی خاک بننے کی کوشش کرتے۔ قیامِ حرمین شریفین کے دو چار ماہ کا موقع ملا تو شیخ مدینہ طیبہ مولانا عبدالغفور عباسی قدس سرہٗ العزیز کے دامنِ فیض سے وابستہ رہے، اُن کے مہمانوں کے مطبخ اور کمروں کی صفائی وغیرہ کا ایسا ذمہ لیا کہ آخر تک شیخ مدینہ انہیں پیار و محبت اور دعاؤں سے یاد کرتے رہے۔ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے تو وہ دست و بازو تھے اور کتنے عظیم امور اور ذمہ داریاں ہونگی جنہیں وہ ناتواں کندھوں پر اٹھائے ہوئے حضرت مدظلہ کا سہارا بنے رہتے۔

مگر دُنیا فانی ہے، دین کا کام کسی فردِ واحد سے اللہ تعالیٰ نے وابستہ نہیں رکھا۔ اللہ کریم کو اتنی ہی خدمت لینی منظور تھی۔ گذشتہ عیدالاضحیٰ کو حسبِ معمول حضرت شیخ الحدیث مدظلہ اور ان کے خدام و اراکین کو عیدگاہ سے واپسی پر اپنے گھر میں "دعوتِ شیراز" پیش کی۔ دوسرے دن بھی طلبہ کی قربانیوں اور گوشت وغیرہ کا انتظام خود کیا۔ تیسرے دن صاحبِ فراش ہوگئے۔ دماغی ضعف، دورانِ سر وغیرہ کا عارضہ بڑھتا گیا۔ طبِ جدید و قدیم دونوں قسم کے معالجوں کا علاج ہوتا رہا، مگر وہ گرتے ہی چلے گئے، یہاں تک کہ ہوش و حواس بھی جواب دینے لگے۔ ۱۴ اپریل کو اسلام آباد جاتے ہوئے انہیں گاڑی میں ساتھ لے گیا۔ ایک دو مستند ڈاکٹروں نے دیکھا اور مشورہ دیا کہ لاہور کسی دماغی امراض کے ماہر کے پاس لے جانا بہتر رہے گا۔

چنانچہ لاہور لے جائے گئے جہاں جنرل ہسپتال کے ڈاکٹر بشیر احمد جو مشہور نیورو سرجن ہیں
نے اپریشن کے لیے داخل کیا۔ اُن کا خیال تھا کہ دماغ میں رسولی ہے، ٹیسٹ اور ایکسروں نے
ان کے خیال کی تائید کی۔ چند دن بعد سر کا آپریشن ہوا، آخر تک انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں
رکھے گئے۔ ہوش آنے پر ڈاکٹر بیحد مطمئن تھے کہ جلد شفایاب ہوں گے مگر اللہ کو منظور تھا کہ یہ
تھکا ماندہ زار و نزار بندہ اب ابدی راحتوں سے ہمکنار ہو جائے۔ رات کو پونے ایک بجے
روح پرواز کر گئی۔ صبح ایمبولینس کے ذریعہ لاش لاہور سے روانہ ہو گئی۔ ہمیں دس بجے یہ
وحشتناک اطلاع ملی، تجہیز و تکفین اور تدفین کا انتظام شروع کر دیا گیا۔ دورۂ حدیث کے
امتحانات کا آخری دن تھا، باقی اکثر طلبہ بوجہ تعطیل چلے گئے تھے۔ جہاں جہاں ممکن تھا اطلاع
دے دی گئی۔ ریڈیو اور ٹی وی نے بھی اعلان کرنے میں تعاون کیا۔ بعد از نمازِ عصر گھر سے جنازہ
اٹھا کر پہلے دار العلوم کے صحن میں رکھا گیا، کثرتِ ہجوم سے صحن کی وسعتیں تنگ ہو گئی تھیں اور
ایک جھلک دیکھنے کیلئے درسگاہوں کی چھتوں پر بھی ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے تھے، دیدارِ عام
کے بعد دار العلوم سے ملحق عیدگاہِ شہر میں حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے جنازہ پڑھایا،
دور دراز اور اطراف و اکناف کے ہزاروں علماء، صلحاء، مہتممین و اساتذۂ مدارسِ عربیہ
اپنے اس عظیم خادم کے جنازہ میں شریک تھے۔

ناظم صاحبؒ کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ دار العلوم کے لیے ایک مخصوص الگ
قبرستان ہو، بڑی سوچ اور تلاش کے بعد میری نگاہِ انتخاب موجودہ خطہ پر ٹھہر گئی،
ناظم صاحب مرحوم کو معلوم ہوا تو خوشی سے اچھل پڑے اور نہایت اطمینان کا اظہار کیا اور
بار بار کہتے "مولانا کہیں ہمیں بھی بھول نہ جائیں ہمارا حصہ بھی اس میں رکھنا ہے"
کسے معلوم تھا کہ وہ اس خطۂ صالحین کے پہلے مہمان اور اس بقعۂ خیر کے اولین دفین ہوں
گے۔ ناظم صاحبؒ مقبرہ دار العلوم کے اس خطہ میں سپردِ خاک کیے گئے، سرہانے عیدگاہ
کی دیوار، پائینتی دار الحفظ والتجوید جو شب و روز قرآن کریم کے زمزموں سے گونجتا رہتا
ہے، اور دائیں طرف بجانبِ قبلہ جسدِ مبارک سے متصل عیدگاہ کی سیڑھیاں جو اللہ
کے سامنے سر بسجود ہونے والے ہزاروں نمازیوں کی گذرگاہ بنتی ہیں۔ بائیں جانب خالی حصہ

ہیں خدا جانے کن کن ارواحِ صالحین اور عبادِ مقربین کی ابدی آرام گاہیں بنیں گی۔ رجالٌ صدقوا ما عاهدوا الله عليه فمنهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر[1]
وہ دار العلوم کے تھے اور اپنی خاکِ پاک بھی خاکِ دار العلوم میں فنا کر گئے۔ جگر نے ایسے موقع کے لیے کہا ہوگا ؎

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

قبر تیار ہوگئی تو حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کو سہارا دے کر سرہانے پشتۂ دیوارِ عیدگاہ پر بٹھا دیا گیا، سامنے غمزدگان کا ہجوم تھا حضرت شیخ مدظلہ نے اپنے اس جان نثار خادم کے بارہ میں گلوگیر آواز میں فرمایا:۔

"مولانا سلطان محمودؒ ہمارے اچھے رفیق، اچھے ساتھی اور بہت دیانتدار تھے۔ آج جو آپ کو دار العلوم کے وسیع شعبہ جات اور خدمات نظر آتے ہیں اور بہت سے امور میں جو حضرت ناظم صاحبؒ اور ان کے رفقاء کے خلوص، للہیت، تقویٰ، دیانت اور امانت کی برکتیں ہیں۔ دار العلوم کو صرف اس علاقہ سے نہیں سارے ملک اور ملت سے واسطہ رہتا ہے اور رکھنا پڑتا ہے۔ ناظم صاحبؒ نے یہ واسطہ بڑے احسن طریقہ سے نبھایا۔ مرحوم کی وفات ہمارے لیے دار العلوم حقانیہ، اساتذہ، طلبہ اور تمام وابستگان کے لیے ایک بہت بڑی مصیبت ہے، اللہ پاک اس کے بدلے صبر اور صابرین کا اجر عطا فرماوے۔ دینی مدارس کا تو اللہ محافظ ہے انا نحن نزلنا الذكر وانا له لحافظون۔ خدا تعالیٰ جس سے چاہتا ہے دین کی خدمت لے لیتا ہے۔ ہمارے ناظم صاحبؒ سے خدا نے دین کی خدمت لے لی، بڑے خوش نصیب تھے جن کو خدا نے اتنی

---

[1] (ایمان والوں میں سے) کتنے مرد ہیں کہ سچ کر دکھایا جس پر قول کیا تھا اللہ سے پھر کوئی ہے ان میں کہ پورا کر چکا اپنا ذمہ اور کوئی انتظار میں ہے۔ (القرآن) ——— (مرتب)

عظیم خدمت کے لیے چن لیا تھا۔ ناظم صاحبؒ کی خوبیاں، کمالات اور خدمات ہمارے بیان سے باہر ہیں۔ بہرحال کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذوا لجلال والاکرام۔ ہم اللہ تعالےٰ کے امر پر راضی ہیں اور صابر ہیں، آپ سب کو خدا کے امر پر راضی رہنا چاہیئے۔ دارالعلوم کی ہمہ گیر دینی خدمات یہ سب حضرت ناظم صاحبؒ کے لیے صدقہ جاریہ ہیں، مرحوم نے دارالعلوم کی بڑی خدمت کی۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ دارالعلوم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے اور اللہ تعالیٰ ناظم صاحبؒ سے راضی ہو جائے اور ان کی قبر کو جنت کے باغوں میں سے باغ بنا دے، آمین"

سورج غروب ہو رہا تھا کہ ہم حرماں نصیب علم و عمل، زہد و تقویٰ، اخلاص و ایثار کے اس پیکر اور آسمانِ دارالعلوم کے اس آفتاب و ماہتاب کو سپردِ خاک کر گئے۔
فرحمہ اللہ ورضی عنہ وارضاہ

الحق
مئی ۱۹۸۴ء

قطعہ سال رحلت

استاذ العلماء شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب قدس سرہ العزیز

بانی و مہتمم دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور

از مرتب کتاب حافظ محمد ابراہیم فانی

ماجرا کیا ہو گیا یہ یا الٰہ العالمیں — کیا یہ سنتا مجھے اب بھی نہیں آتا یقیں

اِک صفِ ماتم بچھی ہے اس محیطِ ارض پر — "آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں"

کس قدر اُلجھی ہوئی ہے وادرِ لغاز لفِ شام — صبح کے چہرے پہ اللہ! نور کا غازہ نہیں

گلستانِ دھر پر گویا چلی بادِ سموم — اور بزمِ کہکشاں ہے دیکھ پژمردہ جبیں

قلزمِ حسرت میں ڈوبی ہے یہ ساری کائنات — نالہ ریز و نوحہ زن ہے حسرتا چرخِ بریں

شق گریبانِ جگر ہے دامنِ دل تار تار — ہر طرف ہے شورِ گریہ ہر نفس اندوہ گیں

عالمِ اسلام ہے ماتم کناں با خونِ دل — اُف قیامت اِک بپا ہے آج بر روئے زمیں

دیکھتا ہوں میں یہاں ہر شے ہے مصروفِ بکا — داستانِ دردِ دل کیسے سناؤں ہم نشیں

آج اس دنیا سے وہ عیسیٰ نفس رخصت ہوا — ذات جس کی تھی فنائے ذاتِ ختم المرسلیں

کر گیا وقفِ یتیمی آہ یہ دار الحدیث — زخمِ دل کا ہو مداوا یہ تو ممکن ہی نہیں

آپ پر تنہا نہیں ٹوٹا یہ کوہِ دردِ غم — ہائے مولانا سمیع الحق مدیرِ بہتریں

کون ہو گا ملتِ بیضاء کا ایسا حدی خواں — ہو گئے اب بے سہارا مصطفیٰؐ کے جانشیں

ہاتفِ غیبی نے مجھ سے یوں کہا سالِ وفات — رو رہا ہے جن پہ تو با خونِ جاں قلبِ حزیں

مل گیا اُن کو "مکانِ" "اعلیٰ" "بجنت" مرحبا ۴۵۵ — آ گئی آوازِ حق یوں "فادخلوها خالدین" ۱۴۲۲

ہم نشینِ رحمتِ یزداں ہے روحِ پاک اُو

یہ دلِ ویراں ہے فانیؔ اُن کی یادوں کا امیں

طرحِ نو می افگند اندر ضمیرِ کائنات

نالہ ہا کز سینۂ اہلِ نیاز آید بروں

اقبالؒ

جہادِ افغانستان

کے

حقّانی شہداء

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں [۲]دو فروزاں ہو گئیں

غالب

جہادِ افغانستان
کے
حق پرست حقّانی شہداء

اِک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

غیور و جسور مسلمان مملکت افغانستان میں روس نواز اور بالآخر روسی انقلاب کے بعد حمیتِ اسلامی سے سرشار علماءِ حق و مشائخ کرام اور جان نثار مجاہدین کی جماعتیں روسی سامراجیت کے مقابلہ میں جس سرفروشی اور قربانی کا مظاہرہ کر رہی ہیں اس نے اسلام کی تاریخ جہاد و عزیمت میں ایک شاندار باب کا اضافہ کر دیا ہے۔ ہمیں خوشی ہے اور خدائے ذوالجلال کے ممنون ہیں کہ اس طویل اور عظیم جہاد میں جو شاید اس صدی میں سرخ روسی سامراج کے مقابلہ میں پہلا بھرپور اور عظیم جہاد ہے۔ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں تعلیم پانے اور اس سے فارغ التحصیل ہونے والے افغانی علماء اور فضلاء کا بھی عظیم حصّہ ہے۔ یہ حقانی جان نثار اس کارزار حق و باطل کی فرسٹ لائن ثابت ہو رہے ہیں۔ اور جیسا کہ دارالعلوم حقانیہ کا مادر علمی دارالعلوم دیوبند اپنے دور میں مغربی سامراج کے لئے قہر الٰہی ثابت ہوا۔ اسی طرح آج بحمداللہ دارالعلوم حقانیہ اپنے مستفیدین اور قابلِ فخر افغانستانی فضلاء کی شکل میں دنیا کی سب سے بڑی ظالم و جابر اشتراکی قوت کے لئے سدِ سکندری بنا ہوا ہے۔ اور آج کئی جماعتوں اور اہم محاذوں کا ہائی کمان ان کے ہاتھ میں ہے۔ ہم اس جہاد کے تمام شہداء، تمام مجاہدین کو عموماً اور اپنے حقانی فرزندوں کو خصوصاً اسلام پیش کرتے ہیں جن کے دم سے آج پانی پت، بالاکوٹ، اور شاملی کی تاریخ قندھار و

ہرات، اور جلال آباد و ترکستان میں دہرائی جارہی ہے۔

اس جہاد میں دارالعلوم حقانیہ کے جو عظیم سپوت شہید ہوگئے ہیں ہماری کوشش ہے کہ اگر ان کے نام اور مختصر حالات ہمیں معلوم ہو سکیں تو انہیں ایک مضمون میں ثبت کر دیا جائے۔ گو اصل دوام و ثبات اور حیات جاودانی تو جریدۂ عالم پر انہیں حاصل ہو چکی ہے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ۔ فمنھم

من قضی نحبہٗ و منھم من ینتظر۔ الآیہ

مولانا محمد اللہ قندہاری شہیدؒ

ناموس اسلام پہ مرمٹنے والے یہ نوجوان گل سرسبد ۱۷ر شوال المکرم ۱۳۹۷ھ میں دارالعلوم حقانیہ میں داخل ہوئے۔ دراز قد گراں ڈیل جوانی، کم گو اور باوقار، والد ماجد کا نام مولانا عبدالقادر ہے۔ قندہار کے قریہ زنگ آباد سنجوائی سے تعلق تھا۔ دارالعلوم میں دو سال تک موقوف علیہ دورہ کی تکمیل کی پھر دورۂ حدیث شریف میں شامل ہوئے ابھی سہ ماہی امتحان ہوا تھا کہ افغانستان میں انقلاب کے بعد طبل جہاد بلند ہوا دورۂ حدیث شریف شوق جہاد میں ناتمام چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ چند دوستوں کا ایک گروپ تھا۔ پابرکاب ہوا تو سب نے غسل کیا، صاف ستھرے کپڑے پہن کر نوافل پڑھے۔ پھر اساتذہ کے پاس آکر اجازت طلب کی اور جہاد کی فتح اور اپنی شہادت کی دعا کروائی۔ دوستوں سے کہا معلوم نہیں پھر ملیں یا نہ ملیں۔ کیا عجب، لیلائے شہادت سے ہمکنار ہو جائیں۔

وہاں جاکر حرکت انقلاب اسلامی افغانستان سے وابستہ ہوئے اور قندہار کے محاذ پر کام شروع کیا اور اس اثنا میں افغان حکومت نے انہیں گرفتار کر کے قندہار جیل میں بند کر دیا۔ ان کے ساتھ کئی ایک اور دارالعلوم حقانیہ کے حقانی طلباء بھی رفیق جیل تھے۔ یہاں مولانا

محمد اللہ قندہاری مرحوم پر ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑے گئے۔ بجلی کے ظالمانہ شارٹ بے دردی سے دئے جاتے بھوکا پیاسا ہفتوں تک رکھا گیا۔ ساتھیوں کے ہاتھ بھی پشت کی طرف باندھ دئے جاتے کہ کوئی انہیں ایک گھونٹ پانی نہ دے سکے۔ وہ تڑپتے رہے مگر عزم ایمانی میں تذبذب نہ آیا۔ مغربی سامراج کے کارندے افغان سپاہی آہنی بوٹوں سمیت انہیں سیدھے منہ لٹا کر پیٹ پر اور جسم کے نازک حصوں پر اچھلتے کودتے مگر وہ جو کہ روحِ بلالی سے سرشار تھے عزیمت و استقامت کے پہاڑ ثابت ہوتے۔ بارہا انہیں پشت کی جانب باندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے ٹھوکر ماردی جاتی اور وہ گردن کے بل نیچے لڑھک جاتے اسی حالت میں ایک بار سیڑھیوں سے اترتے ہوئے انہیں دھکا دیا گیا وہ زمین پہ آرہے اور گردن ٹوٹ گئی۔ اس طرح ایک مجاہدِ عظیم کی روح قندھار جیل میں اپنے مطلوب و محبوب، شہادت اور وصالِ حقیقی سے سرشار ہوئی۔ کئی ان کے ساتھی حقانیہ کے طلباء حالیہ انقلاب تک اسی جیل میں رہے۔ مرحوم کیسے استعداد اور علمی ملکات کے مالک تھے؟ اور آئندہ چل کر کتنے بہترین عالم بن جاتے؟ اس کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے۔ کہ انہوں نے موقوف علیہ دورہ کے سالانہ امتحانات میں مشکوٰۃ میں ۹۰ بیضاوی میں ۸۵ جلالین میں ۱۰۰ اور فقہ اکبر میں ۵۵ نمبرات حاصل کئے۔ فرحمہ اللہ وارضاہ۔

مولانا شیرا جان شہیدؒ

ولدیت، کابل اوسوالی (تحصیل) سروبی افغانستان کے یہ شہیدِ اسلام دارالعلوم حقانیہ میں درجہ علیا کی کتابیں مشکوٰۃ شریف جلالین شریف وغیرہ پڑھتے رہے کہ جذبۂ ایمانی سے سرشار روح نے بے چین کر دیا اور نمناک آنکھوں سے مادرِ علمی دارالعلوم حقانیہ کو الوداع کہہ کر عازمِ وطن ہوئے اپنے عظیم اور مجاہدانہ خدمات کی بناء پر حرکتِ انقلاب اسلامی کی جانب سے اپنے علاقہ کے سارے محاذِ جبہہ سروبی کے امیر (کمانڈر) مقرر ہوئے اور دشمن کو زک پہنچاتے رہے۔ افغانی تقویم کے ۱۲ برج ثور کو صبح نماز فجر سے فارغ ہوئے

تھے کہ اشتراکی ایمان فروش خلقی ایجنٹوں نے ان کا محاصرہ کر لیا اور گرفتار ہونے کے بعد بے دردی سے شہید کر دئے گئے۔ ظالموں نے اس پر اکتفاء نہ کیا بلکہ اخلاق و انسانیت سے عاری ملعون روسی کارندوں نے اس شہید طلبگار علوم نبوت، طالب العلم اور نوجوان مجاہد کی لاش کو ٹریکٹر سے باندھ کر سروبی کے بازاروں میں پھرا پھرا کر روند ڈالا۔ اور اس دوران اشتراکی افغان ایجنٹ لاش مبارک پر پیشاب بھی کرتے رہے اور ایک شہید کی ڈاڑھی بھی نوچ نوچ کر اپنی ذلت ابدی میں اضافہ کرتے رہے۔

مرحوم نے دارالعلوم میں قیام کے دوران اخلاقی اور علمی صلاحیتوں اور خوبیوں کا مظاہرہ کیا۔ سہ ماہی امتحان (۱۳۹۹ھ) میں انہوں نے مشکوٰۃ شریف میں ۱۰۰ نمبرات لئے اور بیضاوی، جلالین، ہدایہ اخیرین میں بھی عمدہ نمبرات سے کامیاب ہوئے، اور پھر سب سے شاندار کامیابی تو کارزار حق و باطل میں حاصل کی کہ روح مبارک نے پکار کر کہا ہوگا کہ فزت ورب الکعبۃ، رب کعبہ کی قسم حقیقی کامیابی تو یہی تھی خدا سے دعا ہے کہ اس "شیر بیشۂ اسلام شیر اجان" کے خون شہادت کے صدقے گلشن اسلام کو دشمن کے تاخت و تاراج سے محفوظ کر دے۔

مولانا محمد ایوب قندہاری شہیدؒ

اسلام کے اس فرزند جلیل دارالعلوم حقانیہ کے اس اولوالعزم حقانی فرزند نے سال ہی میں نہایت اہم اور شاندار خدمات انجام دیتے ہوئے جام شہادت نوش کیا، وہ اپنے محاذ کے قائدانہ فرائض اور ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھے۔ اپنے مادر علمی دارالعلوم حقانیہ نے انہیں ۱۱ شوال ۱۳۸۶ھ کو اپنی آغوش علم و معرفت میں لیا۔ اور وہ تقریباً دس برس تک اس سرچشمۂ کتاب و سنت کے آب زلال سے اپنے قلب و سینہ کو شاداب و آباد کرتے رہے۔ ایمان کی یہ کھیتی جب لہلہا اٹھی تو دشمن خدا و رسول اعداء اسلام کیلئے غیظ و غضب کا سامان بن گئی۔ کزرع اخرج شطأہ فآزرہ فاستغلظ فاستویٰ علیٰ سوقہ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار۔

حزب اسلامی کے عظیم حقانی قائد مولانا محمد یونس خالص کے زیر قیادت قہر الٰہی بن کر خرمن کفار پر یلغار کرتے رہے۔ وہ حزب اسلامی کے دوسرے عظیم قائد اور مجاہدین حزب اسلامی کے چیف کمانڈر حضرت مولانا جلال الدین حقانی (فاضل حقانیہ و سابق مدرس دارالعلوم حقانیہ) کے دست راست اور معتمد ترین ساتھی تھے کہ مادر علمی میں بھی طالب العلمی کا طویل عرصہ دونوں نے ایک ساتھ گذارا تھا۔ حال میں مولانا جلال الدین چیف کمانڈر پکتیا وغیرہ جب دارالعلوم تشریف لائے اور جامع مسجد دارالعلوم میں طویل خطاب فرمایا، تو دوران خطاب اپنے اس عظیم ساتھی کی شہادت کا ذکر کیا اور بڑے درد سے کہا کہ ان کی شہادت سے میرا دست راست ٹوٹ گیا۔ اس مجسمۂ علم وعمل شہید عالم حقانی نے دارالعلوم میں زندگی کا ایک عشرہ گزارا اور تمام اساتذہ اور طلبہ کو مکارم اخلاق سے گرویدہ بنائے رکھا۔

۱۳۸۶ھ میں دارالعلوم میں داخل ہونے والا یہ ہونہار طالب العلم ۱۳۹۴ھ میں حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ اور دیگر اساتذہ سے دورۂ حدیث شریف پڑھ کر اعلیٰ نمبرات سے فارغ التحصیل ہو کر ایک مدرس و مبلغ و مجاہد عالم بن کر نکلا، ان کے والد ماجد کا نام ملا فقیر محمد تھا، قندھار کے مضافات میں توغی نامی گاؤں کے باشندے تھے۔ گو ان کی شہادت سے "حزب اسلامی افغانستان" ایک نڈر سپاہی اور جرنیل سے محروم ہوگئی مگر وہ اپنے اقران و معاصرین کے لئے نشان راہ بن گئے اور اپنے مادر علمی درسگاہ علم و مرکز تربیت کیلئے ذخیرۂ عقبیٰ و فرط آخرت بھی اللھم ارض عنہٗ وارفع درجتہٗ۔ آمین۔

مولانا اصلاح الدین حقانی شہیدؒ

اپنی زندگی کی صرف ۲۶ منزلیں دیکھنے والا یہ جوان، شمع اسلام پر نثار ہو گیا افغانستان کے صوبہ لغمان تحصیل قرغیہ گاؤں میاں خاکس میں ملا محمد مبین کے ہاں پیدا ہوئے اپنے ملک اور پھر پاکستان میں تحصیل علم کرتے کرتے دارالعلوم میں پہنچ گئے۔

دقوف، یہ دورہ کی تکمیل کی اور پھر دورۂ حدیث شریف سے ۱۳۹۹ھ میں فارغ ہوئے
اور جاتے ہی ملک میں مجاہدانہ سرگرمیوں میں شریک ہوئے۔ ۱۴۰۱ھ میں اپنی ڈگری لینے
آئے تو لرزہ خیز مظالم اور واقعات سناتے رہے، کابل کے رسوائے زمانہ فرنگ جیل کے
وحشیانہ ایذارسانیوں کے سامنے ڈٹے رہے۔ کچھ ساتھی تو جیل میں خلعت شہادت پا چکے
اللہ کو منظور تھا کہ ہمارے مولانا اصلاح الدین جیل کے ان شدائد سے بھی بچ کر نکلیں گے اور
میدان جہاد کی شہادت سے بہرہ یاب ہوں گے۔ باہر آئے تو حرکت انقلاب کے
میں کپتان شوکی کی قیادت سنبھالی۔ روسیوں کے ایک بڑے حملہ کا سینہ سپر ہو کر محمد انور اور
گروپ سمیت مسلسل بارہ گھنٹے مقابلہ کیا اور فتح پائی۔ اسی طرح تفصیل علی ششگر میں فتوحات
کی شاندار مثالیں قائم کیں بالآخر افغانی تقویم کے حساب سے ۷ میزان ۱۳۶۰ھ مطابق
۲۸ ستمبر ۱۹۸۱ء کو اخروٹی کے مقام پر شہید کر دیے گئے۔

مولانا عبدالخالق شہیدؒ

خدائے قہار کے مغضوب رذایل کمیونسٹوں کا نشانہ بننے والے یہ شہید پچھلے دنوں
۱۹۷۹ء افغانستان کے ولایت لوگر میں شہید ہوئے۔ شہادت سے قبل جہاد و جہد ایمانی
کے اعلیٰ نقوش صفحہ تاریخ پر مرتسم فرمائے۔ وہ ۱۰ شوال ۱۳۹۷ھ میں دارالعلوم حقانیہ میں داخل
ہوئے ۱۳۹۸ھ میں علوم و فنون کی تکمیل کی اور حضرت شیخ الحدیث مدظلہ و دیگر اساتذہ سے
دورۂ حدیث پڑھنے کا شرف حاصل کیا دورۂ حدیث کے امتحانات سالانہ میں ان کا نتیجہ
یہ تھا۔ بخاری شریف ۶۵ - ترمذی ۸۰ - مسلم شریف ۱۰۰ - ابوداؤد شریف ۸۰ - سنن و
شمائل ۱۰۰ - طحاوی شریف ۱۰۰ - دارالعلوم کے فارم داخلہ میں ان کا پتہ یہ ہے: مولانا عبدالخالق
ولد سفر محمد مقام بانارہ انگمش ضلع تخار ترکستان افغانستان۔

مرحوم معتدل جسم تھے گھنی ڈاڑھی سر پر سفید و براق عمامہ حسین کتابی چہرہ جسے دیکھ
کر قدیم مشائخ بخارا و ترکستان کی یاد تازہ ہوتی۔ دارالحدیث میں مسند شیخ کے بالکل قریب
اور سامنے بیٹھتے۔ استاذی زہد و تصوف تقشف، اور قناعت کی بنا پر اپنے ساتھیوں

میں صوفی عبدالخالق کے نام سے مشہور تھے ، الحمدللہ کہ دارالعلوم حقانیہ کا یہ جلیل القدر فرزند متاعِ اسلام کی حفاظت کے لئے جان لٹا گیا اور گلشنِ محمدی کا یہ مہکتا ہوا پھول بھی محبوبِ حقیقی کی راہ میں بکھر کر حیاتِ جاودانی حاصل کر گیا ۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

شہادت کس انداز سے پائی کہ اپنے ساتھی مجاہدین کے ساتھ دشمن پر یلغار کی ، جسم پر چھ گولیاں لگیں جب بھی گولی سے جسم میں سوراخ ہو جاتا اپنے کپڑے پھاڑ کر زخم میں ٹھونس دیتے ۔ ذرا زخم بند ہو جاتا تو آگے بڑھتے تھے ، پانچ گولیوں کے بعد آخری گولی لگی اور جامِ شہادت نوش فرمایا ۔

مولوی محمد سروس ضیاء شہیدؒ

کاروانِ شہداء کے یہ رہرو حق ۲۴ شوال ۱۳۹۶ھ کو دارالعلوم حقانیہ میں داخل ہوئے اور شہادت سے چند روز قبل تک ، چار سال برابر دارالعلوم میں تعلیم پاتے رہے تعلق افغانستان کے علمی خانوادہ سے تھا ۔ ایک علم دوست عالم مولانا حاجی غلام سید کے گھر قریہ سنگہ نیازی السوالی علینگار ولایت نغمان افغانستان میں پیدا ہوئے ، مقامی مکاتب دینی علوم کی تحصیل کے بعد دارالعلوم حقانیہ سے وابستہ ہوئے ۔ اخلاق و شرافت ، علم و ذہانت ، کا یہ گلِ رعنا اپنے اخلاق کریمانہ اور نجابت سے دارالعلوم کو گرویدہ کر گئے ۔ خاموش طبیعت ، متواضع اس باادب طالب علم نے شوال ۱۳۹۹ھ میں دورۂ حدیث ، کی موقوف علیہ کتابوں میں داخلہ لیا ، غلغلۂ جہاد نے بے چین کر دیا ۔ شوقِ شہادت ، وجہاد شوقِ تحصیلِ علم پر غالب آیا اور ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۹۹ھ کو مادرِ علمی سے بعزمِ جہاد عازمِ وطن ہوئے اور حزبِ اسلامی کے ایک گروپ کے زیرِ کمان اپنے علاقہ میں جہاد و جہد اور فدائیت کے عظیم مظاہرے کرتے ہوئے ۱۵ ربیع الثانی/جدی کو علاقہ علینگار میں مجاہدین کے ایک سربکف دستہ کی معیت میں جامِ شہادت نوش فرما گئے ، عمر ۲۰-۲۲ سال کے لگ بھگ ہوگی ، جاتے وقت وصیت کر گئے تھے کہ دارالعلوم کی طرف سے نذرانہ کی

مستعار کتابیں بعد از شہادت دارالعلوم کو پہنچائی جائیں۔ علوم دینیہ کی دو چار ذاتی درسی کتابوں کے بارہ میں بھی کہہ گئے کہ مادر علمی کے کتب خانہ میں داخل کر دی جائیں۔ دوستوں نے وصیت پر عمل کیا۔ ایک شہید راہ حق کا یہی کچھ اثاثہ تھا اور ایک متاع گرانمایہ جان، جو جان آفرین کے سپرد کر گئے اور کتابیں مادر علمی پہنچ گئیں ؎

چند تصویر بتاں اور چند حسینوں کے خطوط

بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا

حزب اسلامی افغانستان کے سرکاری اور جنگی گزٹ "شہادت" نے ربیع الاول ۱۴۰۲ھ کے شمارہ میں چمن اسلام کے اس نوخیز پھول کو جو کھلنے سے قبل ہی عظمت اسلام پر نچھاور ہو گیا دو طویل کالموں میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"ایں رہ رو راہ حق شہید (مولوی صاحب ضیاء) در طول مدت شدہ از موقع ورود تا لحظہ شہادت در آنجا از ہیچ نوع رشادت دلاوری و فداکاری در راہ بر انداختن کاغیان زماں دریغ نکرد کہ جد و جہد و بیش رفت روز افزوں ایں مجاہد اکبر در امور جہاد شہرہ خاص و عام است ایں فدائی راہ اسلام بالآخر بعد از جانفشانی ھائے زیادی در راہ اعلاء کلمۃ اللہ بہ تاریخ ۱۵ / جدی در عملیاتیکہ علیہ ملحدین در ولسوالی علینگار از طرف مجاہدین سر بکف حزب اسلامی صورت گرفت داعی اجل را لبیک گفتہ بہ شہادت رسید (انا للہ وانا الیہ راجعون)"

آخر میں اس مجاہد جلیل کی فدائیانہ اور مؤمنانہ تعلیم و تربیت پر ان کے مادر علمی دارالعلوم حقانیہ سے تعزیت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"حزب اسلامی بدیں وسیلہ تسلیت و ہمدردی خود را بہ فامیل محترم شان و استادان دارالعلوم حقانیہ کہ چنیں شاگرد فداکاری تربیہ نمودہ اند اظہار نمودہ از بارگاہ ایزد توانا صبر کامل و اجر جمیل برایشاں سلت می نماید"

علوم و فنون میں آپ کی استعداد و صلاحیت یہ تھی کہ دارالعلوم حقانیہ کے سالانہ امتحان میں

تلویح و توضیح میں ایک ایک نمبر دو اور شرح عقائد میں نمبرات حاصل کئے۔

مولانا باقی باللہ شہیدؒ

مولانا باقی باللہ ولد مولانا حبیب اللہ سکنہ اخوندخیل میری غزنی افغانستان ۸ سال قبل ۱۲ شوال ۱۳۹۲ھ کو دارالعلوم حقانیہ میں داخل ہوئے۔ علم و عمل کا یہ شجرۂ طوبیٰ اب بارآور ہونے کے قریب تھا۔ اور اس سال ۱۴۰۰ھ میں وہ یکم محرم سے دورۂ حدیث شریف میں شامل ہوگئے، اس وقت وہ بظاہر بڑے پُرسکون تھے، نورانی چہرہ سیماھم فی وجوھم من اثر السجود۔ مگر اپنے علاقہ غزنی میں آنے سے قبل کفر سے برسرپیکار رہ کر زخمی ہوگئے تھے زخم اندر اندر سے رستا رہا کچھ عرصہ بعد مجھ سے پشاور کے کسی ڈاکٹر کے نام تعارفی خط مانگا۔ میں نے کہا کہ بظاہر تو آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ انہوں نے دامن اٹھا کر اپنا پہلو دکھایا تو ایک گھاؤ تھا جو ناسور بن رہا تھا۔ ڈاکٹر نے لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں زیر علاج رکھا۔ پھر آپریشن کیا گیا مگر ملاءِ اعلیٰ کی ملکوتی کائنات مشتاقِ دید تھی۔ زخم بڑھتا گیا اور وہ ۲۹ فروری ۱۹۸۰ء مطابق ۱۲ ربیع الثانی ۱۴۰۰ھ کو ہسپتال میں واصل بحق ہوئے۔ نماز جنازہ پشاور میں پڑھائی گئی اور مشہور عارف و صوفی عبدالرحمان بابا کے قبرستان میں یہ غریب الوطن طلبگار علوم نبویہ، شہادت حقیقی و حکمی کے چند در چند درجات پاتے ہوئے سپرد خاک ہوئے ؎

زمین ز خون شہیدان ما خضاب گرفت
چنیں عبث تو بہ سرخی ایں شفق منگر

جماعت مجاہدین حرکت انقلاب اسلامی کیطرف سے ان کو دیا گیا شناختی اور تعارفی کارڈ اس وقت ان کے نورانی اور حسین پیکر کے ساتھ میرے سامنے موجود ہے جس پر امیر حرکت مولانا محمد نبی محمدی صاحب کیطرف سے پشتو میں یہ ایمان پرور عبارت لکھی گئی:

گرانه مجاهده مسلمان ورور باقی بالله ایمانی جذباتو
محصول خه متونه موخدائی قبول کړه په ګران افغانستان
د کفر توره تیاره راغلی ده همت ملا کلکه و تړه د کمیونزم استبدادی

رجیم سرہ مردانہ وار جہاد وکڑہ توفیق ہو نصیب شہ"

ترجمہ :- یعنی میرے عزیز گرانقدر مسلمان بھائی تمہارے ایمانی جذبات پر مبنی خدمات کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ عزیز افغانستان پر کفر کے گہرے اندھیرے چھا گئے ہیں کمر ہمت مضبوطی سے باندھ کر کمیونزم کے رجیم استبداد سے مردانہ وار جہاد کرو توفیق خداوندی تمہارا شامل حال ہو۔

پھر دیکھئے ہمارے عزیز اور محبوب طالب علم مولانا باقی باشندہ اس نصیحت پر کیسے عمل کر دکھایا۔؟ فرحمہ اللہ وارضاہ [illegible]

مولانا سید جان محمد صاحب عرف خالی جان حقانی شہید

مولانا جان محمد ولد جناب خواجہ محمد، وطن اقامت کوئٹہ، وطن اصلی غزنی افغانستان۔ یکم محرم الحرام ۱۳۹۹ھ کو مادر علمی دارالعلوم حقانیہ میں داخلہ لیا۔ کافیہ، شرح وقایہ، اصول الشاشی مجموعہ منطق اور جمال القرآن پڑھتے رہے، ان کا ایک چھوٹا بھائی بھی ساتھ تھا، ابتدائی کتب پڑھتا رہا، جوش جہاد اور جذبہ شہادت نے مجبور کیا تو دارالعلوم سے عارضی رخصت پر جہاد کیلئے چلے گئے۔ ان کے محاذ جنگ میں ایک گروپ "دینی طلبا" کے نام سے مشہور تھا۔ رات کے بارہ بجے انہوں نے دشمن پر چھاپہ مارا۔ اور گروپ کی تعداد سے بڑھ کر خلقی لوگوں کو قیدی بنا کر مرکز لے جانے لگے کہ دشمن کے ٹینکوں نے تعاقب کیا۔ بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ رمضان المبارک کے روزہ کی حالت میں مشین گن کی بوچھاڑ سے عصر کے قریب شہید ہو کر ارشاد نبوی للصائم فرحتان فرحۃ عند فطرہ و فرحۃ عند لقاء ربہ۔ کے مطابق فطر سے کچھ قبل رب کریم کے لقاء حقیقی سے سرشار ہو گئے۔

مولانا حافظ عبدالکریم حقانی شہیدؒ

مولانا حافظ عبدالکریم صاحب ماکوان صوبہ قندھار کے باشندے تھے۔ ۱۰ر شوال ۱۳۹۳ھ کو دارالعلوم حقانیہ میں داخل ہوئے اور ۱۳۹۴ھ میں سند فراغت حاصل کی۔ آپ

دفتر حرکت انقلاب اسلامی افغانستان میں معاون امیر تھے۔ بعد ازاں ان کو دو سو افراد پر مشتمل ایک جبھہ ناجیہ کی قیادت سونپی گئی۔ ہر میدان میں آپ نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ ان کے ہاتھوں بہت سے روسی اور افغان سر بارہ واصل جہنم ہوئے۔ ۱۴ رمضان المبارک کو دشمن کے ساتھ ایک مقابلہ میں جب کہ وہ کسی طالب علم کو بچانے کے لئے اٹھے تو ایک گولی آپ کے منہ پر لگی جس سے آپ نے جام شہادت نوش کیا۔

اچھے اوصاف کے مالک قابل اور ذی استعداد شخص تھے۔ دورۂ حدیث شریف ۱۳۹۶ھ میں پڑھا۔ سالانہ امتحان جو کہ وفاق المدارس کے زیر انتظام ہوتا ہے، اس میں شرکت لی اور ۳۹۹ نمبر لے کر درجہ علیا میں کامیابی حاصل کی۔

شہید مرحوم کے اس جبھہ ناجیہ میں چند اور مشہور حقانی فضلاء کے نام یہ ہیں:
مولوی سید عبدالروف حقانی، مولوی سید عبدالحمید حقانی، مولوی سید حبیب اللہ حقانی، مولوی سید محمد اعظم حقانی۔ مولوی سید محمد اکرم حقانی اور سید محمد اکبر حقانی وغیرہم جو روسی کفر و الحاد سے برسرپیکار ہیں۔

مولانا محمد سعید حقانی شہیدؒ

مولانا محمد سعید ولد محمد مرجان صاحب، مقام کندرخیل ڈاک خانہ سید کرم صوبہ گردیز افغانستان ۲۰ شوال ۱۳۷۹ھ کو دارالعلوم میں داخل ہوئے اور علوم و فنون کی تحصیل کرتے رہے۔ علاقہ گردیز صوبہ خوست کے باڑی قلعہ میں بارودی سرنگ نکالنے میں مصروف تھے۔ اس گروپ نے ۸۵ بارودی سرنگ (مائنز) نکالیں۔ اس دوران ایک سرنگ پھٹ جانے سے ایک ہاتھ کٹ گیا، مگر لٹکتا رہا۔ نصف گھنٹہ بعد کاٹ دیا گیا۔ مجاہدین نے جمع ہو کر انہیں فوری طبی امداد پہنچائی۔ چائے پلائی مگر جانبر نہ ہو سکے اور خلعت شہادت سے بار یاب ہوئے۔ اس وقت آپ علاقہ نظمی مرکز سے وابستہ تھے۔ دارالعلوم حقانیہ سے فراغت کے بعد خوست کے موضع یاد منڈی کے دینی مدرسہ میں درس و تدریس کرتے رہے۔

مولانا محمد نعیم حقانی شہیدؒ

مولانا محمد نعیم ولد مولانا مخدوم مقام درخان ضلع بدخشاں افغانستان مولوی سید شاہ صاحب کے نام سے معروف ہوئے ۱۴ شوال ۱۳۸۵ھ کو دارالعلوم حقانیہ میں داخل ہوئے۔ ۱۳۹۱ھ میں دارالعلوم سے سند فراغت حاصل کی۔ تقریباً چھ برس اس مرکز علمی میں تحصیل علم میں مشغول رہے۔ اعلیٰ استعداد کے مالک تھے درجہ علیا میں کامیابی حاصل کی۔ اپنے محاذ اور جبہہ کے کمان کی مارٹرگن سے ایک روسی حملہ آور جہاز کو بھی مار گرایا۔ زلمت ولایت پکتیا میں مصروف جہاد تھے کہ شہادت پائی۔

مولانا عبدالوہاب حقانی شہیدؒ

مولانا عبدالوہاب ولد مولانا محمد اکرم ساکنہ بیتہ دار کوہستان شمالی افغانستان پروان ۱۵ شوال ۱۳۸۴ھ کو دارالعلوم حقانیہ میں داخلہ لیا۔ دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی بہترین علمی استعداد کے مالک تھے۔ اسی بنا پر ۸۶-۱۳۸۵ھ میں ایک سال تک اپنے مادرِ علمی دارالعلوم حقانیہ میں تدریس کی خدمات بھی انجام دیں۔ اس کے بعد کابل کے مدرسہ نوریہ میں شیخ الحدیث تھے۔ جنگ میں بھرپور حصہ لیا۔ دو اڑھائی سال سے عدم پتہ ہیں۔ اغلب گمان یہ ہے کہ جام شہادت نوش فرما چکے ہیں۔

مولانا غلام محمد صاحب حقانی شہیدؒ

مولانا غلام محمد صاحب ولد جناب مسافر خان صاحب کوٹ۔ ڈاک خانہ و تحصیل شاہی جلال آباد افغانستان علاقہ زلمت میں شہید ہوگئے۔ آپ ۱۵ شوال ۱۳۸۴ھ کو دارالعلوم حقانیہ میں داخل ہوئے دورۂ حدیث شریف کی موقوف علیہ کتابیں یہاں پڑھیں۔ رحمہ اللہ تبارک وتعالیٰ

الحق، مارچ ۱۹۸۱ء

حقّانی شہداء افغانستان یا تاریخ اسلام کا روشن باب

مولانا احمد گل حقانیؒ ـــــ مولانا فتح اللہ حقانیؒ کی شہادت

> مولانا احمد گل حقانی شہیدؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن عرف مولانا فتح اللہ شہید فاضلانِ دارالعلوم کی شہادت کا واقعہ ستمبر ۱۹۸۵ء کو پیش آیا۔ مولانا احمد گل صاحب مؤرخہ ۶ ستمبر ۱۹۸۵ء بروز جمعہ خوست کے محاذ پر سفاک روسی فوجیوں کی گولیوں کا نشانہ بنے جبکہ مولانا حبیب الرحمٰن نے اس کے ایک ہفتہ بعد اسی محاذ پر جام شہادت نوش کیا۔ ان دونوں شہیدین کی شہادت کی خبر جب دارالعلوم حقانیہ پہنچی تو اساتذہ وطلباء نے مل کر ان کے ایصالِ ثواب کے لیے ختمِ قرآنِ پاک کیا اور تعزیتی اجلاس منعقد ہوئے۔ ان دو مختلف تعزیتی اجلاسوں سے مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ نے خطاب فرمایا جسے مولینا عبدالقیوم حقانی صاحب نے قلمبند کیا۔ پہلا خطاب ۸ ستمبر بعد از نمازِ عصر اور دوسری تقریر ۱۴ ستمبر بعد از نمازِ عشاء کی ہے ـــــ (مرتب)

حضرات اساتذہ کرام اور عزیز طلبہ! اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل وکرم اور عنایت و توجہ ہے جس نے ہمیں اپنے علوم و معارف قرآن وحدیث اور دینی مدارس سے وابستہ کر دیا ہے اور آج ہم اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر جانیں قربان کر دینے والے افغان مجاہدین وشہداء کے ایصالِ ثواب کیلئے جمع ہوئے ہیں۔ اور اللہ نے یہ احساس بخشا ہے ورنہ اب تو امت پر مجموعی حیثیت سے بڑا زوال اور انحطاط کا دور آیا ہے۔ آج سے ساٹھ ستر سال قبل مسلمانوں کے ہنگامے، ان کے جلوس، ان کی ہڑتالیں، ان کی سیاست اور ان کی ہر قسم کی مساعی مسلمانوں کی فلاح، ان سے ہمدردی و نصرت

اور ان کے غم اور پریشانیوں کو دور کرنے کی غرض سے دعا کرتے تھے۔

مشرق میں جنگ ہوتی تو مغرب کے مسلمان پریشان ہوجاتے اور اگر مغرب میں کسی مسلمان کو تکلیف پہنچتی تو مشرق کے مسلمان اس کو اپنے دل میں محسوس کرتے۔ ترکی میں، بلقان میں، افریقہ میں غرض جہاں کہیں مسلمانوں پر کوئی آفت آئی تو برصغیر میں حساس مسلمان، علماء اور قائدین اور سیاستدان بے چین ہوجاتے۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ مسلمان حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں جبکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو جسدِ واحد قرار دیا ہے: اذا اشتکی بعضہ اشتکی کلہ۔ جب جسم کے کسی ایک عضو میں تکلیف ہوتی ہے تو اس سے سارا جسد درد محسوس کرتا ہے، اگر آنکھ میں تکلیف ہوتی ہے تو اس کو سارا جسم محسوس کرتا ہے۔ جسم کا ہر حصہ دوسرے حصے سے مربوط اور خوشی و مسرت اور دکھ درد میں شریک ہے۔

مگر اب کے تیس چالیس سال سے میں بڑی تبدیلی محسوس کرتا ہوں، آپ برصغیر کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تحریکِ خلافت ہو یا بلقان کی جنگ، ہمارے اسلاف، اکابر علماء دیوبند نے کتنا شاندار کردار ادا کیا۔ ترکی میں خلافت کے زوال کو پوری امت نے اپنا زوال محسوس کیا۔ اور برصغیر میں تحریکِ خلافت نے مسلمانوں میں ایک ہیجان اور اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ مسلمانوں نے دل کھول کر چندے دیئے اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مسلمان ان کی کامیابی کے لیے خدا کی بارگاہ میں گڑگڑاتے۔

بانی دارالعلوم دیوبند قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کو دیوبند کے کسی رئیس نے اپنی بیٹی نکاح میں دے دی۔ جب خلوت میں اپنی دلہن کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ وہ سونے کے زیورات سے اٹی ہوئی ہے۔ آپ نے نئی نویلی دلہن پر توجہ کیے بغیر اسی کمرہ میں اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوئے اور نماز پڑھتے رہے، فارغ ہوئے تو بیوی کے قریب ہو کر اسے یوں تقریر کی کہ دیکھو! تم ایک امیر اور رئیس کی صاحبزادی ہو اور میں فقیر و غریب اور ایک مسکین انسان ہوں، نکاح کے بعد اب تمہارا اور میرا ایک ساتھ جینا ہو گیا ہے، ہمارا مستقبل ایک دوسرے سے وابستہ ہے مگر یہ نباہ بظاہر مشکل ہوگا کہ تو امیر ہے اور امیر کی بیٹی ہے، میں فقیر ہوں اور فقر کو پسند کرتا ہوں، ہمارا گذارا تب بہتر ہو سکے گا جب دونوں ایک ہوجائیں، یا میں امیر

بن جاؤں یا تُو فقر اختیار کرلے جہاں تک میری امارت اور دُنیا پسندی کا تعلق ہے وہ تو ناممکن ہے، البتہ آپ کو فقر و مسکنت کی راہ اختیار کرنا آسان ہے، اب آپ جونسی راہ اختیار کریں گی مستقبل کے لحاظ سے ہمارے تعلق کا اس پر نتیجہ مرتب ہوگا۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تو فقیر اور زہد اور ورع و تقویٰ کے پہاڑ تھے، بیوی نے ان کی تقریر سُنکر بڑی خوشی سے کہہ دیا کہ میں فقر و غربت کی راہ اختیار کرتی ہوں اور میرے سارے زیورات وہ آپ کی ملکیت ہیں اور آپ کو اختیار ہے جہاں اور جیسے چاہیں استعمال کریں۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اُسی وقت بغیر کسی تاخیر کے اپنی دُلہن سے تمام کے تمام زیورات اُتار لیے اور صبح بلقان کی جنگ میں مسلمانوں کی اعانت و نصرت کے لیے چندہ میں داخل کر دیئے۔

آج ہمارے پہلو میں سرحد پر افغانستان کے مسلمانوں کی زبردست جنگ شروع ہے اور میرا شرحِ صدر ہے کہ تاریخ میں یہ جنگ بدر و حنین اور اُحد و احزاب کے مناظر پیش کرتی ہے، وہی معرکہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کو پیش آیا تھا۔ وہاں تو صحابہؓ کیلئے ڈھارس حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس موجود تھی، ان کے سامنے وحی کا نزول ہوتا تھا، مگر آج تو ۱۴۰۰ سال بعد پھر ایسا معرکۂ کارزار گرم ہوا ہے کہ مجاہدین صحابہؓ کی طرح سر کو ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ کارزار میں کُود پڑے ہیں، یہ ان ہی کا زبردست اور مضبوط ایمان ہے، نہتے اور مُٹھی بھر اور انگلیوں پر گنی جانے والی تعداد ایک سُپر پاور اور روس جیسے درندہ صفت فوجوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

آج ہمارے قائدین، ہمارے علماء، ہمارے سیاستدان اور لیڈر، ادھر سے غافل ہیں، ہماری سرحد پر ہمارے بھائی، ہمارے مسلمان، ہماری ملت کے محافظ مجاہدین، مسلمانانِ افغانستان خاک و خون میں تڑپ رہے ہیں، اُن کی عزتیں لُٹ رہی ہیں، ان کے بچے کٹ رہے ہیں، ان کی عصمت دری کی جا رہی ہے مگر یہ ہیں کہ ٹس سے مس تک نہیں ہوتے۔

الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ اللہ پاک نے دارالعلوم حقانیہ کو ہزارہا انعامات و سعادتوں سے نوازا ہے مگر سب سے بڑی اور سب سے اہم سعادت یہ ہے کہ آج جہادِ افغانستان میں دارالعلوم حقانیہ کا اسّی فیصد حصہ ہے، اور یہ عظیم تاریخی کارنامہ ہے۔ ہر محاذ پر، ہر جماعت میں، ہر میدان میں،

دارالعلوم حقانیہ کے فضلاء اور طلباء کا کردار نمایاں، قائدانہ اور گویا جہاد کی اصل روح ہے۔

چند روز قبل ہفت روزہ "تکبیر" (کراچی) کے مدیر اور مشہور صحافی محمد صلاح الدین اپنے ساتھیوں کے ساتھ جہادِ افغانستان کے مختلف محاذوں پر گئے اور اپنے رسالہ کا افغانستان نمبر نکالا۔ آپ حیران ہوں گے کہ اس نمبر میں انہوں نے اپنے تاثرات و مشاہدات میں لکھا ہے کہ وہ محاذ پر دارالعلوم حقانیہ کے فضلاء کا ولولہ، جذبۂ جہاد اور محاذِ جنگ پر سرفروشانہ کردار دیکھ کر حیرت میں ڈوب کر رہ گئے، اور ان کی تحسین و عقیدت میں صفحات کے صفحات لکھ ڈالے مولانا جلال الدین حقانی (فاضل دارالعلوم حقانیہ) مولانا محمد ابراہیم حقانی (فاضل دارالعلوم حقانیہ) اور مولانا احمد گل حقانی (شہید) کو اس دور کا امام ابن تیمیہ، امام السنوسی اور امام شامل قرار دیا۔

یہ جلال الدین حقانی، یہ محمد ابراہیم حقانی اور احمد گل حقانیؒ وغیرہ کون ہیں؟ یہ آپ کے دارالعلوم کے فاضل ہیں، انہوں نے آپ کے ساتھ یہاں دارالعلوم میں زندگی کا طویل حصہ گذارا، ان کی طالب علمانہ زندگی بھی زہد و تقویٰ کا نمونہ اور پاکیزہ تھی۔ انہیں اپنی مادر علمی کا احترام تھا اور اپنے شیخ اور اساتذہ سے بےحد عقیدت تھی، اور آج اللہ نے ان کو جہاد و حفاظتِ دین کی کتنی عظمتیں عطا فرمائی ہیں۔ دن کو گھوڑوں کی پیٹھ پر جہاد کرتے ہیں اور رات کو اللہ کی بارگاہ میں عجز و نیاز اور کامیابی کی دُعا کی خاطر جبینِ نیاز جھکاتے ہیں۔

یہ اب جس محاذ پر لڑائی سخت ہو گئی ہے، اور ان آٹھ دس دن میں رُوس نے جو ۵ سالہ تسلط و اقتدار اور اس دوران افغان مجاہدین پر حملوں میں یہ سب سے بڑا حملہ کیا ہے اور جہاں اب سخت اور فیصلہ کُن جنگ جاری ہے۔ دونوں طرف زخمیوں سے ہسپتال اَٹے پڑے ہیں۔ یہاں بھی دُوسرے محاذوں کی طرح دارالعلوم حقانیہ کے فضلاء پیش پیش ہیں۔ کمانڈ اور قیادت ان کے ہاتھ میں ہے۔ مولانا جلال الدین حقانی اور مولانا محمد ابراہیم حقانی اسی محاذ پر دشمن کو بارہا دندان شکن شکست دے چکے ہیں، اور اب کافی عرصہ سے انہوں نے خوست کی فوجی چھاؤنی کا محاصرہ کر رکھا تھا اور دن بدن وہ اپنے محاصرے کو تنگ کیے جا رہے تھے جس سے روسی کارمل حکومت بے حد پریشان ہو گئی تھی، اور قریب تھا کہ یہ چھاؤنی مجاہدین کے ہاتھوں فتح ہو جائے رُوس نے پیش بندی کی خاطر پوری قوت سے اس محاذ کو کُچلنے کی خاطر

بہت بڑا حملہ کر دیا۔

آج ہم جس غرض سے یہاں جمع ہوئے ہیں وہ مولانا احمد گل حقانی (فاضل دارالعلوم حقانیہ) جو اس محاذ پر مجاہدین کے کمانڈر اور روح رواں تھے اور ۵ ہزار مجاہدین کی فوج انکے زیر کمان تھی، روسی دشمن سے زبردست مقابلہ کرتے ہوئے اپنے دوسرے رفقاء اور دارالعلوم کے فضلاء کے ساتھ شہید ہو گئے ہیں اور ان کی نعش کو میران شاہ لایا گیا ہے۔ آج کے نوائے وقت میں مولانا احمد گل حقانی کی شہادت کی خبر شائع ہوئی ہے۔ مولانا احمد گل حقانی دارالعلوم کے لائق اور ہونہار فاضل تھے۔ ذہین اور محنتی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اساتذہ سے خصوصی تعلق تھا۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ کے قریب ترین تلامذہ میں سے تھے، آپ کی مسجد میں بھی رہے حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی امامت بھی ان کے ذمہ تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ دارالعلوم حقانیہ جہاد کی چھاؤنی ہے۔ دارالعلوم ایک چار دیواری یا مخصوص نصابِ تعلیم کا نام نہیں بلکہ وہ ایک عالمی اور بین الاقوامی تحریک ہے جو ہر جگہ اور ہر محاذ پر باطل سے برسرِ پیکار رہے، جن میں سرِ فہرست اور سب سے زیادہ نمایاں محاذ، روس جیسی سپر پاور سے جنگ ہے، جس میں دارالعلوم حقانیہ کے فضلاء اور طلباء پیش پیش ہیں۔

عزیز طلبہ! آپ کے سامنے دارالعلوم حقانیہ کے قدیم طلباء اور فضلاء بالخصوص مولانا جلال الدین حقانی اور مولانا احمد گل حقانی کا کردار بطور نمونہ موجود ہے۔ دس فیصد محبت اور اخلاص بھی پیدا ہو جائے تو اللہ پاک سو فیصد کامیابیوں اور کامرانیوں سے نوازتا ہے۔

مولانا احمد گل، ایک نیک سیرت، سادہ اور محنتی طالبعلم تھا۔ عبادت، ذکر و فکر اور اپنے اسباق پر اس کی پوری توجہ تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے جرنیل اور آج اُخروی درجات و ترقیات سے نوازا اور شہید بنا دیا۔ آج اپنے پرائے سب انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں، اور سب کو اعتراف ہے کہ مولانا احمد گل حقانی اور مولانا محمد ابراہیم حقانی اور مولانا جلال الدین حقانی نے میدانِ کارزار میں محاذِ جنگ پر خالدؓ بن ولید، حیدر کرارؓ اور ابو عبیدہؓ کی یاد تازہ کر دی، انکے ایثار و شجاعت

کے نمونے دکھائے۔

علماء اور اہلِ اسلام کا یہ فرض ہے کہ ہمہ تن ادھر متوجہ ہو جائیں، نوجوان میدانِ کارزار میں جہاد کریں، اہلِ ثروت ان کی امداد کریں، علماء اس کی تبلیغ کریں اور ضعفاء اور تمام مسلمان دُعا سے ان کی پُشت پناہی کریں، کیونکہ جہاد کے بھی مختلف درجات ہیں، کچھ لوگ میدانِ جنگ میں لڑتے ہیں کچھ ان کے لیے رسد، خوراک اور تعاون و نُصرت کی کوشش کرتے ہیں، کچھ مجاہدین میں جذبۂ جہاد اور ولولہ پیدا کرتے ہیں، کچھ رائے عامہ کو ہموار کرتے ہیں اور کچھ شب و روز اللہ کی بارگاہ میں گریہ وزاری کر کے ان کی فتحمندی کی دُعائیں کرتے ہیں۔

مَیں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ مسلمان جسدِ واحد ہیں۔ افغان مجاہدین و مہاجرین کی پریشانی ہماری پریشانی ہے۔ اگر ہمارے اندر بے چینی، اضطراب، ہمدردی، فتح و نصرت کے لیے دُعا والحاح اور افغان مجاہدین و مہاجرین کے مسائل سے دلچسپی نہیں ہے تو خطرہ ہے کہ اس عذاب اور ان مصائب کا رُخ ادھر پھیر دیا جائے۔

ختمِ قرآن کی غرض بھی مولانا احمد گل اور دارالعلوم کے دوسرے کثیر تعداد میں شہید ہونے والے فضلاء اور طلباء کو ایصالِ ثواب اور اُن کے رفعِ درجات کی دُعا کرنا ہے۔ اور یہ کہ باری تعالیٰ اس روسی اژدہے سے افغانستان کو نجات دے اور مسلمانانِ عالم کو اتحاد و اتفاق اور فتح و نصرت عطا فرمائے۔

مولانا فتح اللہ حقّانی

ابھی آپ کو مولانا عبدالقیوم حقانی نے دارالعلوم کے ایک دُوسرے رُوحانی فرزند فاضل مولانا فتح اللہ حقانی کی شہادت کی خبر سُنائی اور مجاہدین کی فتح، دُعائیں اور شہداء کے لیے ایصالِ ثواب کی تقریب میں شرکت کا کہا۔ واقعتہً مجاہدین، شہداء بالخصوص ہمارے دارالعلوم کے فضلاء کا ہم پر حق ہے کہ ہم ان کی معاونت، نصرت اور دُعا و ایصالِ ثواب کرتے رہیں۔

اس سے قبل گذشتہ جمعہ کو مولانا احمد گل حقانی شہید ہوئے، اور اب ہفتہ بعد مولانا فتح اللہ حقانی کی شہادت کی جانکاہ خبر ہم سُن رہے ہیں۔ جہاں تک شہادت کی بات ہے ہمیں

اس پر افسوس، ندامت اور اظہارِ غم اور نالہ و ماتم نہیں کرنا چاہیے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا عظیم فضل و کرم احسان و عنایت ہے کہ اس بے دینی، بے راہ روی اور فتنوں کے دور میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے دار العلوم کے فضلاء کو جہاد و شہادت کے لیے منتخب فرمایا ہے۔ یہ فخر اور عزت و افتخار کا مقام ہے کہ آج عالمی پریس اور نشر و اشاعت کے عالمی ادارے ہمارے فضلاء کا نام لیتے ہیں اور ان کے نام کے ساتھ حقانی کی نسبت کا لاحقہ بھی ذکر کرتے ہیں۔ جہاد و شہادت کا عظیم مقام ہے۔ حضرات صحابہ کرامؓ کی یہ تمنا ہوا کرتی تھی کہ کاش! جہاد میں شرکت کی سعادت حاصل ہو، اور اللہ کی راہ میں شہادت نصیب ہو، ہمارے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں، ہاتھ پاؤں توڑ دیئے جائیں خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بارہا اس کی تمنا کرتے کہ کاش میں اللہ کی راہ میں شہید کر دیا جاؤں، پھر زندہ کر دیا جاؤں پھر شہید کر دیا جاؤں اور جب تک قیامت قائم نہ ہو یہ سلسلہ جاری رہے۔

حضرت سعد بن وقاصؓ ایک جلیل القدر صحابی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں ہیں اوّل من رمیٰ فی سبیل اللہ کا شرف ان کو حاصل ہے۔ احادیث میں ان کے بڑے مناقب آئے ہیں۔ عراق، ایران اور عجمی علاقوں کے فاتح ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

اُحد کے روز میرے ساتھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت عبداللہ بن جحشؓ ایک طرف ہو کر فرمانے لگے کہ کل میدانِ کارزار میں جانے سے پہلے خلوص والحاح سے دُعا مانگ لیں، ایک دُعا مانگے دُوسرا آمین کہے۔ حضرت سعدؓ فرماتے ہیں کہ اوّل میں نے دُعا مانگی، پھر حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے دُعا مانگی، اللہ تعالیٰ نے ان کی دُعا قبول فرمائی فرماتے ہیں عبداللہ بن جحشؓ نے عرض کیا:۔

اللّٰھم ارزقنی غداً رجلاً شدیداً باسہ شدیداً حزرہ یقاتلنی واقاتلہ ثم یقتلنی فیجدع انفی واذنی فاذا القیتك تقول یاعبداللہ فیما جدع انفك	اے اللہ! کل میدانِ کارزار میں ایک ایسے شخص سے میرا سامنا ہو جو گرفت میں مضبوط اور مقابلہ میں توانا و طاقتور ہو، پھر وہ مجھے قتل کر دے، میرا ناک اور کان کاٹ دے میرا مُثلہ کر دے، جب آپ کے ہاں میری حاضری ہو تو آپ مجھ سے دریافت کریں

واذنك فاقول فيك وفى رسولك۔ (اوکما قال)

عبداللہ! کس سلسلہ میں آپ کا ناک اور کان کاٹ دیئے گئے ہیں! تو میں عرض کروں یااللہ! آپ کی اور آپ کے رسولؐ کی محبت میں۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے ان کے دل سے نکلی ہوئی دعا قبول کرلی اور جب انہیں میدانِ کارزار میں دیکھا تو ان کے کان اور ناک کاٹ دیئے گئے تھے۔ تو صحابہؓ میں شہادت کی تڑپ تھی۔

مولانا احمد گل حقانی کی شرافتیں، اخلاص و محبت اور جذبۂ جہاد اور مولانا فتح اللہ حقانی کا اساتذہ سے وابستگی، خلوص و محبت اور ہمارے یہاں کے اساتذہ کے ساتھ ان کی صحبتیں اور رفاقت ایک ایک چیز اُبھر اُبھر کر سامنے آتی ہے۔

مجھے یاد ہے آج سے سات آٹھ سال قبل جب جہادِ افغانستان کی ابتداء کی جارہی تھی اور مولانا احمد گل حقانی آئے تو سامنے والی پٹڑی کے اس پار کھیتوں میں رات گئے تک ٹہلتے ہوئے روسی دشمن سے جہاد اور جنگ کی منصوبہ بندی کرتے، نقشے بناتے، عزائم دہراتے، رُفقاء اور ساتھیوں کی نُصرت حاصل کرنے کے خاکے بناتے۔ یہ ساری چیزیں مجھے کل کی تازہ بات کی طرح یاد ہیں اور لگا ہے دل میں یہ خیال بھی آتا کہ ہم کیا اور ہماری بساط کیا، روسی طاقت سے کون مقابلہ کرے گا؟

مگر اللہ پاک کو ان خاکوں میں رنگ بھرنا منظور تھا اس کی قدرت کے سامنے ساری انہونی باتیں ہو کے رہتی ہیں۔ آج مولانا احمد گل حقانی اور مولانا فتح اللہ حقانی کا عظیم تاریخی کردار اُمت کے سامنے ہے بچپن سے اور طالبعلمی کے زمانے سے ان کے عزائم یہی تھے۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر والا جذبہ اور اُن کے دل کی دھڑکنیں قدرت نے انہیں ودیعت کردی تھیں ؎

فلست ابالی حین اقتل مسلماً
علی ای جنب کان للہ مصرعی
وذلك فی ذات الالٰه وان یشاء
یبارك علی اوصال شلو ممزع

ہمارے ان علماء، دارالعلوم کے فضلاء اور مجاہدین نے ایثار و قربانی کے لازوال نمونے پیش کر دیئے ہیں جس پر صرف دارالعلوم کو نہیں بلکہ پوری ملتِ مسلمہ کو سرخروئی حاصل ہوئی ہے۔

مولانا فتح اللہ حقانیؒ بھی ایک عجیب و غریب مخلص، وفادار اور دارالعلوم کے لائق فرزند تھے، ہمارے ساتھ تو بے تکلف تھے حضرت شیخ الحدیث مدظلہ سے بے حد عشق تھا ہر وقت ان کے ساتھ لگے لپٹے رہتے تھے اور دعائیں حاصل کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو میدانِ کارزار میں امارت، کمانڈری اور اب شہادت کی خلعت سے سرفراز فرمایا۔[1]

الحق
اکتوبر ۱۹۸۵ء

---

[1] کراچی سے نکلنے والے ہفت روزہ جریدہ تکبیر میں ان دونوں شہیدوں کے بارے میں معلومات افزا مضامین شائع ہوئے ہیں۔ (مرتب)

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد بعشق

ثبت است بر جریدهٔ عالم دوام ما

حافظ

چند عربی شیوخ

سیلِ خوں ہر سُو رواں ہے اور ہر دل اشکبار
پھر گیا ہے کس طرف یارب مزاجِ روزگار

داستانِ دردِ پیہم یا خدا کیسے کہوں
سینہ و تن داغ داغ و دامنِ دل تار تار

فانیؔ

داعیِ کبیر شیخ مصطفٰی السّباعی علیہ الرحمۃ

داعیِ کبیر بطلِ اسلام شیخ مصطفٰی السباعی علیہ الرحمۃ جن کا پچھلے دمشق میں انتقال ہُوا، ملتِ اسلامیہ کے ان مُخلص قائدین میں سے تھے جن کی زندگی کے تمام لمحات دینی دعوت، اعلاءِ دین کی جان سوزی اور کلمۃ اللہ کی سربلندی کی جدّوجہد میں صرف ہوئے۔ دعوت و تبلیغ، تصنیف و تالیف، جہاد و سرفروشی کا کوئی محاذ ایسا نہ تھا جس کی صفِ اول پر ملّت کے اِس غمخوار نے باطل کا مقابلہ نہ کیا ہو۔ اِس علم و شہرت کے باوجود ان کا دل اسلاف کی محبت سے معمور اور علمی گھمنڈ و غرور سے پاک تھا، اور طویل جانگسل علالت کے دوران صبر و رضا کے وہ نقوش ثبت کیے جس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ خوش قسمتی سے اسی سفرِ حجاز کے دوران جس کے تاثرات آپ نیچے پڑھیں گے۔ اس ناچیز کو بھی مدینہ طیّبہ اور مکّہ مکرّمہ میں ان سے کئی بار ملنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ بسترِ مرگ پر دراز ہونے کے باوجود ان کی ہر بات اِسلام کے سوز سے لبریز تھی اور ملّتِ مسلمہ کے نشاۃ ثانیہ کے لیے ان کا دل تڑپ رہا تھا۔

الحق ——— اپریل ۱۹۶۶ء

لہ حدیث و سنت پر مستشرقین نے جتنے اعتراضات کیے ہیں اس کا دندان شکن جواب موصوف نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "السنۃ و مکانتہا فی التشریع الاسلامی" میں دیا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں مولانا محمد یوسف بنوری رح تحریر فرماتے ہیں کہ "نہایت فصیح و بلیغ ادبی زبان اور شیریں و شگفتہ اسلوب میں کتاب لکھی گئی ہے۔ مولف موصوف جس طرح اپنے وقت کے بڑے خطیب تھے اس سے زیادہ پُرشوکت اور زوردار قلم کے مالک ادیب بھی تھے"۔ ملاحظہ ہو: "اسلام میں سنت و حدیث کا مقام"۔ (مرتب)

شیخ محمد نصیفؒ — علامہ علوی مالکیؒ

حجاز کے مشہور علم دوست بزرگ شیخ محمد نصیف ۸ رجادی الثانی (۱۳۹۱ھ) کو جدہ میں واصل بحق ہوئے۔ خود بھی عالم تھے، زندگی علم کی اشاعت اور اہلِ علم کی قدردانی میں بسر ہوئی متموّل شخص تھے مگر سارے وسائل کو علم اور نوادراتِ علم کے فروغ و اشاعت کا ذریعہ بنایا۔

کچھ عرصہ قبل شیخِ مکہ علامہ علوی مالکی کا بھی انتقال ہوا۔ آپ مکہ مکرمہ کی علمی زندگی کی رونق تھے۔ حرم شریف میں ان کا درس دورِ سلف کی یاد دلاتا۔ حجاز کی سرزمین میں بھی ایسے بزرگوں کا وجود عنقا بنتا جارہا ہے۔ حق تعالیٰ مرحومین کو مقاماتِ قُرب سے نوازے۔ آمین

الحق

اکتوبر ۱۹۷۱ء

شیخ ابوزہرہ مصریؒ

۱۹ ربیع الاوّل ۱۳۹۴ھ مطابق ۱۳ اپریل ۱۹۷۴ء عالم اسلام کے مشہور مصنف و نقاد عالم الشیخ محمد ابوزہرۃ مصر میں انتقال کر گئے۔ موصوف کثرت تصانیف، تحقیق وتنقید، بحث و تحلیل وسعت معلومات، قوت حافظ ملکۂ خطابت کے لحاظ سے یگانۂ روزگار علماء میں سے تھے۔ انہوں نے فقہ، ائمہ فقہ اور دیگر ائمہ اسلام پر نہایت قیمتی تصانیف چھوڑیں جن میں سے بعض ہمارے ہاں اردو تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں، اس کے علاوہ موسوعۃ الفقہ الاسلامی الاحوال الشخصیۃ، الزواج الطلاق، الحدود، القصاص، الجریمۃ والعقوبۃ فی الشریعۃ الغراء اور فرق اسلامیہ جیسی وقیع علمی اور تحقیقی بھی ان کے علمی تاثر میں شامل ہیں عالم عرب، کا کوئی وقیع مجلۃ بہت، کم ہی ان کے مقالات اور مضامین سے خالی رہا ہوگا۔ مصر کی مختلف یونیورسٹیوں کالجوں میں پڑھانے کے علاوہ وعظ و ارشاد مقالات اور ـــــ الغرض ساری زندگی علم اور تصنیف و تالیف ہی انکا اوڑھنا بچھونا رہا۔ مسلکاً حنفی تھے، مگر بعض مسائل میں اپنی تحقیق پر اعتماد فرماتے۔ مصر جیسے روشن خیال ماحول میں وہ واحد شخص تھے جو کلاسوں میں لیکچر دیتے وقت طلبہ اور طالبات کو الگ الگ بٹھاتے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات علمی کو شرف قبول بخش کر عالم اسلام اس سے استفادہ کی توفیق دے اور ان کے علمی زلات سے درگذر فرمادے۔

الحق
جمادی الاوّل ۱۳۹۴ھ
جون ۱۹۷۴ء

علامہ علال الفاسیؒ

دوسرا حادثہ بھی ایک برادر مسلم ملک مراکش میں علامہ الشیخ علال الفاسیؒ کی وفات کی شکل میں پیش آیا۔ علامہ الفاسی نہ صرف مراکش بلکہ عالم اسلام کی چند ایک برگزیدہ شخصیتوں میں سے تھے۔ علمی، سیاسی، دینی خدمات کے لحاظ سے نہایت اونچا مقام تھا۔ اصابت رائے، دینی جذبات، عالم اسلام کے دینی و علمی فتنوں کا گہرا احساس تھا۔ تدین و تقویٰ کے مالک تھے، سامراجی استعمار کے خلاف برسرپیکار رہے۔ ان کے مومنانہ جذبات و آراء کا اندازہ ان لوگوں کو بھی ہوگا جنہوں نے الجزائر کی علمی و اسلامی کانفرنس کی رپورٹ اخبارات میں پڑھی ہوگی کہ سامراجی سازشوں اور عالم اسلام کے خلاف استعمار کے علمی اور فکری سرگرمیوں پر کتنی گہری نظر رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ مراکش کے اس قابل فخر سپوت کو بہترین درجات عطا فرمادے۔

الحق

جمادی الاوّل ۱۳۹۴ھ

جون ۱۹۷۴ء

شیخ احمد تکروری رحمۃ اللہ علیہ

۱۶ر ذی قعدہ ۱۳۹۳ھ کو جمہوریہ سینیگال کے ایک ممتاز عالم اور داعی الشیخ الحاج احمد التکروری کا وصال ہوا، دیگر علمی خدمات کے علاوہ آپ نے ضیاء النیرین للجامع بین علوم الطائفتین کے نام سے کئی جلدوں میں تفسیر بھی لکھی، جن خطوں میں علماء کی ضرورت زیادہ مگر تعداد کم ہے وہاں ایسے علماء کا انتقال اور بھی احساسِ غم میں شدت پیدا کر دیتا ہے۔

الحق
جون ۱۹۷۴ء

◎

الشیخ محمد الامین شنقیطی

گذشتہ ماہ کئی اور ایسے حضرات نے بھی داعئ اجل کو لبیک کہا جنہیں علمی، دینی، قومی و ملی دنیا میں ایک امتیازی مقام حاصل تھا۔۔۔ سعودی عرب کے الشیخ محمد الامین الشنقیطی مرحوم رابطہ عالم اسلامی مکہ معظمہ کے بنیادی رکن اور مدینہ طیبہ کی اسلامی یونیورسٹی کے ممتاز استاذ تھے۔ علمی مآثر میں قابل قدر تفسیر "اضواء البیان فی تفسیر القرآن بالقرآن" اور دیگر وقیع کتابیں چھوڑیں۔ سلفی المشرب تھے۔ علمی دنیا میں عظیم خدمات انجام دیں۔

الحق

محرم الحرام ۱۳۹۴ھ

شیخ الازہرؒ

پچھلے ہفتہ مصر کے مقتدر شیخ اور جلیل القدر عالم شیخ عبدالحلیم محمودؒ شیخ الازہر انتقال فرما گئے۔ اِنا للہ وانا الیہ راجعون۔

شیخ الازہرؒ کا ہر دور میں ایک خاص مقام رہا ہے، مگر مرحوم کا شمار ازہر کے ان گنے چنے مشائخ کرام میں ہوگا جن کو اللہ تعالیٰ نے علم کے ساتھ عمل، ظاہر کے ساتھ باطن، شریعت کے ساتھ طریقت کی نعمتوں سے نوازا تھا، علم وتقویٰ، زہد وعمل، تجرّد، للّھیت، ہر پہلو سے آپ کی ذات ایک نمونہ تھی۔ ایسے شیخ کا ایسے وقت میں جبکہ پاکستان سمیت دیگر اسلامی ممالک کے دینی کاموں میں ان کی رہنمائی کی ضرورت تھی، یکایک جدا ہو جانا پوری ملّتِ مسلمہ کے لئے ایک المیہ ہے، جانے والوں کی زندگی اسوہ ہوتی ہے، اور ان کی تعلیمات و ہدایات اور نصائح و فرمودات سے علم وعمل کو جلا ملتی ہے۔

خوش قسمتی سے چند سال قبل جب شیخ الازہر مرحوم نے پاکستان کو اپنی آمد سے نوازا تو احقر نے ایک ملاقات میں قارئین الحق کے لئے کچھ ہدایات ونصائح کی اپیل کی، آپ نے از راہ شفقت صرف زبانی نہیں بلکہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر حسب ذیل تحریر نصائح سے نوازا۔ شیخ کی جدائی کے اس المناک موقع پر ان کی عظمت اور نصیحت کی جامعیت وافادیت کے پیش نظر ہم اسے قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ شیخ الازہرؒ نے اہل علم کو خاص طور سے مخاطب فرماتے ہوئے لکھا ہے:

النصیحۃ ان یھب الانسان نفسہٗ للّٰہ تأسیا برسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الذی یقول اللّٰہ سبحانہٗ وتعالیٰ لہٗ قل ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للّٰہ رب العالمین۔

قل ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للّٰہ رب العالمین لاشریک لہٗ

وبذالك امرت وانا اول المسلمين وحيات الانسان ان يجب ان تكون لله واذا ما رهب الانسان حياته لله فيجب عليه ان يثقف نفسه اسلاميًا وذالك بدراسة القرآن الكريم والسنة النبوية الشريف ومن افضل الكتب بعد القران الكريم كتب ائمه الحديث مثل صحيح البخاری وصحيح المسلم وكتاب رياض الصالحين وكذالك كتاب احياء علوم الدين وكتاب السيرة النبوية لابن كثير۔

واذا وهب الانسان نفسه لله فعليه ان يهدی الآخرون الى الله تعالى وذلك بالدعوة الى التمسك بالدين والتمسك بالخلق الصالح ـــــ والله الموفق ۔

عبدالحليم محمود شيخ الازهر

ترجمہ ۔ نصیحت یہ ہے کہ انسان نبی کریم علیہ السلام کے اقتدار میں اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے جنہیں خداوند کریم نے مخاطب کرکے یہ اعلان کرنے کا حکم دیا تھا کہ میری نماز اور عبادتیں میری زندگی اور موت صرف اور صرف اللہ رب العالمین کے لئے ہے ۔ کوئی اس کا شریک نہیں ہے ۔ یہی مجھے حکم دیا گیا ہے ۔ اور میں سب سے پہلے سرتسلیم و انقیاد خم کرنے والا ہوں ۔ پس اب لازم ہے کہ انسان کی زندگی صرف اللہ کے لئے ہو اور جب انسان اپنی زندگی خدا کو بخش دیتا ہے تو لازم ہے کہ اپنے نفس کی اسلامی حیثیت سے اصلاح کرے یہ اصلاح اور شائستگی قرآن کریم اور سنت نبی کریم سے ہو سکتی ہے ۔ اور قرآن کے بعد سب سے بہتر کتابیں ائمہ حدیث کی کتابیں ہیں ۔ مثلاً بخاری شریف ، مسلم شریف ، ریاض الصالحین اور احیاء علوم اور ابن کثیر کی سیرت نبویہ ۔ اور جب سب کچھ انسان خدا کے سپرد کر دے تو یہ بھی ضروری

ہے کہ اب، اوروں کی بھی اللہ کیطرف رہنمائی کرے۔ یہ کام دین پر عمل پیرا ہوکر اور اسلام کے اخلاق و اعمال صالح اپناکر ہو سکتا ہے۔

شیخ الازہرؒ کے مذکورہ جامع کلمات، ہیں عام مسلمانوں اور اہل علم کے لئے صدہا نصیحتیں ہیں خداوند قدوس ہم سب کو ایسے جامع اور عبقری مشائخ کی تعلیمات پر عمل کی توفیق دے اور مرحوم کو اعلیٰ علیین میں بہترین مقامات قرب، و رضا سے نوازے اور جامع ازہر کو اس کے شایانِ شان جامع الصفات شیخ کی سیادت نصیب ہو۔

الحق

ذی قعدہ ۱۳۹۸ھ

اکتوبر ۱۹۷۸ء

علامہ تیسیر الظبیانؒ

اردن کے مشہور ادیب ممتاز عالم علامہ تیسیر الظبیان نے بھی کاسۂ موت پی لیا
انا للہ و انا الیہ راجعون۔ موصوف کی وفات دل کے دورے سے ہوئی، ساری زندگی عالم
عرب کی دینی علمی و ادبی خدمات میں گذری۔ اولاً دمشق سے الجزیرہ کے نام سے مجلہ شائع
کروایا، پھر وفات تک الشریعۃ کے نام سے پرچہ نکالتے رہے، کئی اسلامی معاہد و
مدارس کو چلاتے رہے۔ رابطہ کے اسلامی اور ثقافتی اجتماعات کے بھی ممتاز ممبر تھے۔
کراچی کی ایشیائی کانفرنس میں شرکت، ایسے اجتماعات میں غالباً ان کی آخری شمولیت تھی وہ
عالم اسلام کے مخلص اور مجاہد علماء میں سے تھے۔ مجھے ایشیائی کانفرنس کے بعد پشاور کے
ہوٹل انٹر کانٹینل کی ایک تقریب میں ان سے ملاقات اور مختصر بات چیت کا شرف حاصل
ہوا۔ الحق ان تک پہنچتا تھا، اردو نہ سمجھ سکنے کے باوجود الحق کے بارہ میں تحسین کا اظہار فرمایا
اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔

الحق

نومبر ۱۹۷۸ء

ادیب اور شاعر

خیر تو ساقی سہی لیکن پلائے گا کسے
اب نہ وہ میکش رہے باقی نہ میخانے رہے
رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے

اقبالؔ

سیّد قطبؒ اور اُن کے رُفقاء کی شہادت

گذشتہ مہینہ مصر کے ممتاز عالم، مفکر اور دینی اقدار کے بلند حوصلہ داعی استاد سید قطب اور ان کے رفقاء کی شہادت کا سانحۂ فاجعہ پیش آیا۔ صدر ناصر اور اُن کی فوجی عدالت نے انہیں پھانسی پر لٹکا یا۔ ان لوگوں نے صبر و استقامت سے دار و رسن کے مراحل طے کیے اور اپنی جانیں رفیق اعلیٰ کے سپرد کیں، رحمہم اللہ وارضاہم

اس سانحۂ ہائلہ کے حقیقی اسباب و محرکات ابھی تک سامنے نہیں آسکے، مگر اتنی بات واضح ہے کہ عالم اسلام کی اکثریت ان پر لگائے ہوئے الزامات سے مطمئن نہیں ہوسکی، جن لوگوں کا وجود عالم اسلام کے لیے مشترکہ متاع اور گرانمایہ سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہو اُن کے ساتھ اس طرح کے سلوک پر عالم اسلام کا اضطراب ایک لازمی اور طبعی امر ہے کہ مسلمان ہر درد و مصیبت میں ایک دوسرے کے لیے "جسد واحد" کی حیثیت رکھتے ہیں: اذا اشتکی عضوٌ منہ (الحدیث)

اگر واقعی یہ لوگ ملکی مصالح سے غداری کے مرتکب ہوئے تھے، تو پھر بھی ان کی ہمہ گیر مقبولیت کی بناء پر ضروری تھا کہ ان کا کیس کسی غیر جانبدار یا مشترکہ ٹربیونل میں پیش ہوتا یا کم از کم انہیں اپنی صفائی کا موقعہ دیا جاتا۔ اگر ایک جماعت یا تحریک برسر اقتدار گروہ سے مطمئن نہ ہو اور وہ اسے بدلنا چاہتی ہو تو جمہوریت کے اس دور دورہ میں محض اس جرم کی بناء پر اسے گردن زدنی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ سامراج اور استعمار کے مقابلہ میں صدر ناصر کی کوششیں لائق تحسین و تائید ہیں۔ ہم سامراجیت علی الخصوص مغربی استعمار کو اس دور کا بدترین المیہ اور "شجرۂ ملعونہ" سمجھتے ہیں، مگر اس کے ساتھ خدا فراموشی قومیت

مذہب بیزار اشتراکیت یا سیکولرزم کو ہرگز گوارہ نہیں کیا جاسکتا۔ جو لوگ مذہب بالخصوص اسلامی اقدار کے احیاء و فروغ کو استعمار و استبداد کی بیخ کنی کی راہ میں ایک رکاوٹ سمجھتے ہیں وہ صریح غلطی پر ہیں۔ قوم و وطن سے بالاتر اور اسلامی اقدار کا علمبردار ہو کر بھی تو کافرانہ استبداد و استعمار کو للکارا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ یورپی استعمار اور سامراجیت کے بندشوں سے کلی طور پر آزاد ہونا عالم اسلام کا اقدام اور اہم ترین فریضہ ہے۔ لیکن اگر اس لعنت کی جگہ مصر کی اشتراکیت (خواہ اسے سوشلزم کے معنی میں نہ لیا جائے) یا سیکولرزم یا کوئی اور غیر اسلامی نظام اپنا قدم جماتا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ دین اور مذہب کو سماجی، اقتصادی اور معاشی راہ میں رکاوٹ سمجھتا ہے، تو ہم اس متبادل نظام کو بھی ایک لعنت ہی سمجھیں گے۔ اس صورت میں مغربی سامراج کے جنازہ نکلنے پر ہمیں خوشی تو یقیناً ہو گی مگر وہ صرف سلبی پہلو ہو گا۔ اور محض ایسی خوشی جو وہبت نام، کیوبا یا کانگو کی آزادی اور فیڈرل کاسٹرو یا ہوچی منہ اور لومبا کے کارناموں پر حاصل ہو —— ایک مسلمان کو کامل خوشی تو صلاح الدین ایوبیؒ کی مومنانہ فتوحات سے حاصل ہو سکتی ہے، جو نہ صرف صلیب کے علمبرداروں کو بلکہ صلیبی نظام کو بھی توڑ کر رکھ دے۔ مصطفےٰ اتاترک کی فتوحات اور کارناموں پر خوشی کا چراغاں ضروری تھا لیکن تصویر کا وہ روح فرسا اور ایمان سوز رُخ بھی نظروں کے سامنے رہنا ضروری تھا جس کے نتیجہ میں ترکیہ سے اسلام اور دینِ محمدی کو جلاوطن کیا گیا اور محمدیؐ اقدار کا نام لینا ناقابلِ معافی جرم قرار پایا۔ ایک دن خوشی کے نقارے بج گئے، مگر نصف صدی بلکہ آج تک ملّتِ مسلمہ ترکیہ میں اسلام کی غربت پر رو رہی ہے۔ افسوس کہ جذبات کی شدت میں یہ تلخ ترین پہلو نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ عالم اسلام کی بعض قیادتیں مغربی استعمار سے لڑ رہی ہیں، اور بعض مشرقی استبداد (سیکولرزم یا دہریت) سے برسرِ پیکار ہیں۔ مگر جس گرمجوشی سے یہ مقابلے ہو رہے ہیں اس سے زیادہ شوق اور ولولہ سے اپنے دشمن (سامراج یا سیکولرزم) کے معاشی، سماجی اقدار اور ان کی تہذیب و تمدن، نظریات، عادات و اطوار سے معانقہ کیا جا رہا ہے (ہمارے عرب بھائی تو اس معاملہ میں خاصے تیز ہیں) محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لائے ہوئے طرزِ زندگی کو جاہلیتِ عصرِ حاضرہ (مغربی تہذیب اور مادیت) کی بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔ یہ لوگ

یورپی اقوام اور بیرونی اقتدار کے تو دشمن ہیں مگر خود سر تا پا انہی کے رنگ میں ملک و قوم کو ڈبو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ مصالحت کی رو میں وہ اپنے دینی مسلمات، متوارث اور قطعی اقدار سے انحراف اور اس میں تبدیلی و ترمیم سے بھی نہیں شرماتے۔ اِن حالات میں مسلمانوں کا یوں ایک دوسرے کو مشقِ ستم بنانا، ایک دوسرے کو گردن زدنی قرار دینا ہرگز قابلِ ستائش نہیں ہو سکتا —— صدر ناصر اگر مغربی استعمار سے برسرِ پیکار ہیں، تو سیّد قطب اور ان جیسے دیگر علماء و دعاۃ مغربی تہذیب و تمدّن سے ایک سیاسی محاذ پر لڑ رہا ہے اور دوسرا علمی اور دینی محاذ پر —— اس واقعۂ فاجعہ نے مسلمانوں کے علمی محاذ کو ایک بلند پایہ عالم، مصنّف، ادیب، مفکّر اور داعی سے محروم کر دیا، تو سیاسی محاذ پر صدر ناصر کی مقبولیت اور انصاف پسندی کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔ اور یہ دونوں باتیں عالمِ اسلام، مسلمانوں، عربوں، حریت پسند اقوام اور سامراج دشمن عناصر کے لیے نیک فال نہیں ہیں۔

اللہ تعالٰی مسلمانوں کی حالتِ زار پر رحم فرمائے۔ (آمین)

الحق

اکتوبر ۱۹۶۶ء
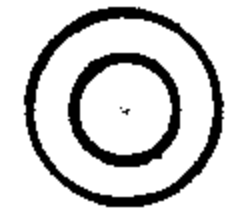
مولانا عبدالمنان دہلوی

بھارت میں ممتاز عربی ادیب، شاعر، صوفی، عالم، مولانا عبدالمنان دہلوی رحمہ باغ و بہار شخصیت کے مالک، عربی فارسی کے ہزاروں اشعار کے حافظ، عربی ادب کے باب المراثی اور قصائد میں ماہرانہ دسترس رکھنے والے اکابر دیوبند کے عاشق زار اور شاعر ہونے کے باوجود ذاکر شاغل صوفی صافی بیشمار خوبیوں اور کمالات کے مالک تھے حق تعالیٰ اپنے محبوب اکابر حضرت مدنیؒ اور حضرت رائے پوری کی صحبت و معیت سے نوازے اور فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر کا شرف نصیب ہو۔

الحق
جون ۱۹۷۴ء

◎

مولانا محمدؒ زکی کیفی رحمہ اللہ

پاکستان کے مفتیٔ اعظم بقیۃ السلف مولانا مفتی محمد شفیع کراچی کے بڑے صاحبزادے اور ہمارے محترم دوست مولانا محمد تقی مدیر البلاغ کے برادرِ اکبر مولانا محمد زکی کیفی[1] مرحوم ۱۱ محرم ۱۳۹۵ھ کو حجازِ مقدس سے واپسی کے بعد دل کے دورہ سے رب البیت سے جا ملے شاعر و فاضل خلیق و غمگسار و باغ و بہار شخصیت دینی علوم و فنون کی نشر و اشاعت سے تعلق رہا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ و رضی اللہ عنہ۔

الحق ــــــ مارچ ۱۹۷۵ء

---

[1] آپ مفتیٔ اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیعؒ کے گھر ۲۲ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ کو دیوبند میں پیدا ہوئے حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے یہ نام آپ کیلئے تجویز کیا تھا! ابتدائی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں شروع کی اور فارسی و ریاضی کی تکمیل کے بعد درسِ نظامی شروع کیا لیکن چوتھے سال کے بعد درسِ نظامی جاری نہ رکھ سکے۔ اسکے باوجود آپ کو اللہ نے علم و فضل کی وہ دولت نصیب فرمائی جو بعض اوقات درسِ نظامی کے فضلاء کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ تاریخ و تصوف کے ساتھ آپ کا گہرا شغف تھا ۱۹۴۵ء سے باقاعدہ شعر کہنے لگے تھے اور کیفی تخلص تھا مخصوص شعری نشستوں میں شرکت فرماتے۔ بیعت کا تعلق حضرت تھانویؒ سے تھا۔ گذر اوقات اور معاش کیلئے ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور کے نام سے قائم کیا آپ کی پُرکیف اور سحر آفرین غزلیات کا مجموعہ کیفیات بھی اسی ادارہ نے شائع کیا ہے۔ عشق و مستی اور زمزمہ ہائے معرفت سے لبریز یہ مجموعہ قابلِ داد بھی ہے اور قابلِ دید بھی۔ ۲۵ سال کی عمر میں پہلا حج کیا اور دوسرا حج کر کے واپس آئے ہی تھے کہ ۵۰ سال، ادن کی عمر پا کر عاشورہ محرم ۱۳۹۵ھ بروز جمعرات داصل بحق ہوئے۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

اب کیا ستائیں گی ہمیں دوراں کی گردشیں ہم اب حدودِ سود و زیاں سے نکل گئے

آپ کے بھائی مولانا محمد تقی عثمانی نے اس شعر میں معمولی تغیر کر کے شعر کے دونوں مصرعوں سے تاریخ نکالی ہے پہلے مصرع سے تاریخ وفات ۱۹۷۵ء جبکہ دوسرے مصرعہ سے ان کی ہجری تاریخ پیدائش ۱۳۴۵ھ

اب کیا ستائیں گی تجھے دوراں کی گردشیں تم تو حدودِ نفع و زیاں سے نکل چکے

(مرتب)

آغا شورش کاشمیری رحمہ اللہ

وہ شخص جس کا خمیر حق کے لیے شورش واضطراب اور سوز وگداز سے اٹھا تھا اُسے دُنیا آغا عبدالکریم شورش[1] کاشمیری کے نام سے پہچانتی ہے اور جو اب ہمیشہ کے لیے جُدا ہو چکے ہیں اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

شورش مرحوم جو کچھ بھی تھے اس کا خلاصہ یہی ہے کہ معروفات کو پھیلاؤ اور مُنکرات کو مٹاؤ، حق بہرحال حق ہے اور باطل کو باطل کہنا چاہیئے اور اُسے مٹ جانا چاہیئے: اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًا ــــ اسلامی تاریخ میں ابن حزم کے قلم کو تلوار سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہی حالت شورش ؒ کے قلم کی تھی۔ یہ الگ بات کہ کبھی ان کی بصیرت اور رائے کو ٹھوکر بھی لگ جاتی کہ وہ بھی انسان تھے معصوم نہ تھے، مگر جذبہ عموماً اخلاص پر مبنی ہوتا۔ اس لیے قلم کی تلوار کا کبھی کبھا وہ اپنوں کو بھی مشقِ ستم بنا دیتے۔ مگر وضوحِ حق کے بعد اُن کی عداوت محبّت سے بدلنے میں بھی دیر نہ ہوتی، وہ الحب للہ والبغض للہ کے قائل تھے مگر معرفت وامتیازِ حق میں کبھی کبھی اختباس ہو ہی جاتا ہے۔ مگر اُن کے حسنات کی فہرست طویل اور ممتد ہے ــــ انکی لغزشوں میں سب سے بڑی لغزش منکرِ حدیث، پرویز بدبخت کی ایک بار وکالت تھی۔ الحق نے

---

[1] مرحوم اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں: ”ہمارا خاندان بھی عام انسانوں کی طرح کا ایک خاندان وطن کشمیر اور گوت ڈار ہے۔ پردادا سرینگر سے اُٹھ کر امرتسر آ گئے، دادا کی نو عمری میں پردادا کا انتقال ہو گیا۔ ہاتھ میں کوئی ہُنر نہیں تھا۔ اس لیے بعض خانگی بدمزگیوں کے باعث لاہور آ گئے۔ میرا یوم پیدائش ۱۴ اگست، ۱۹۱۷ء ہے۔ پیدائش کے وقت عبدالکریم نام رکھا گیا لیکن جب قلم کا سفر شروع کیا تو عبدالکریم عنقا ہو گیا اور شورش کاشمیری نام ہو گیا“۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل۔ پسِ دیوارِ زنداں اور چٹان شورش نمبر۔ (مرتب)

یہ چیز دیکھی تو جذبۂ نصح وخیر خواہی اور مسئولیتِ خداوندی کے پیشِ نظر ان کا تعاقب کیا جو خطرات کو دعوت دینے کی بات تھی مگر آغا صاحب مرحوم نے نہ صرف کھلے دل سے اس تلخ کلامی کو گوارا کیا بلکہ اس کے بعد پرویز کی تائید سے اپنا خار شگاف قلم ملوث نہ کیا۔ ایسے مرحلے کبھی کبھی زندگی میں آجاتے ہیں مگر مجموعی طور پر وہ جہادِ آزادی کے اولوالعزم مجاہد، اعلاء کلمۃ الحق کے علمبردار، آقائے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس پر مرمٹنے والے اور صحافت وادب کے میدان کے نادرۂ روزگار شہسوار تھے۔ برصغیر کے اربابِ حق وصداقت علماء کی جماعت اُن کا اُسوہ رہا اور وہ اس طبقہ کے وکیل، ترجمان اور مسلکِ دیوبند کے عظیم وکیل اور اسلام کے بہترین خادم تھے۔ اُن کی زندگی اُن کے ہم پیشہ اربابِ قلم اور اصحابِ صحافت وادب کیلئے عظیم الشان سبق ہے کہ قلم کی آبرو اور حق کی عظمت وبرتری کو قائم رکھنا نہ صرف آخرت بلکہ دنیا کے لحاظ سے بھی نہایت نفع بخش سودا ہے۔ حق تعالیٰ انہیں آج[2] عالمِ حقیقی میں محنتوں کا صلہ عظیم الشان منفعتوں کی شکل میں عطا فرمائے، اور شافعِ محشر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے شفیع ہوں۔

الحق

ذیقعدہ ۱۳۹۵ھ

---
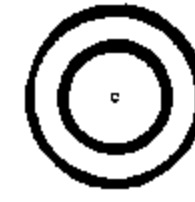
[1] مرحوم اپنی سیاست کے بارے میں کہتے ہیں ؎

ہم نے اس وقت سیاست میں قدم رکھا تھا ۔۔۔ جب سیاست کا صلہ آہنی زنجیریں تھیں

سرفروشوں کے لیے دار ورسن قائم تھے ۔۔۔ خانزادوں کے لیے مُفت کی جاگیریں تھیں

[2] ۲۵ر اکتوبر ۱۹۷۵ء کو آپ کا انتقال ہوا۔ نمازِ جنازہ مفکرِ اسلام مولانا مفتی محمودؒ نے پڑھائی۔ (مرتب)

مولانا محمد عثمان فارقلیط رحمہ اللہ

۱۲ر جون ۱۹۷۶ء کو برصغیر کی ایک اور بزرگ شخصیت نے بھی مسلمانوں کو داغِ مفارقت دیا۔ مولانا محمد عثمان فارقلیط ایڈیٹر روزنامہ الجمعیۃ کا دہلی میں انتقال ہوا۔ آپ عمر بھر صحافت اور اس کے ساتھ سیاست و مناظرہ وغیرہ کے دائروں میں مسلمانوں کی خدمت اور ترجمانی کرتے رہے۔ ان کی قومی و ملّی خدمات کا سلسلہ بے حد وسیع تھا۔ خدا انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اُن کی لغزشوں سے درگذر فرمائے۔

الحق

جولائی ۱۹۷۶ء

ابنِ انشاءؔ

شاعر — ادیب اور نقّاد

ابن انشاء کا وجود بھی ایسے وقت میں غنیمت تھا جبکہ عصرِ حاضر کے مادّی اور سفلی ادب کا دور دورہ ہے۔ اور بہت کم خدا کی دی ہوئی ادبی صلاحیتوں کو صحیح مصرف میں خرچ کیا جا رہا ہے۔ ابنِ انشاء مرحوم نے اپنی ادبی استعداد کو معاشرہ کے فاسد مواد اور عناصر پر نشتر زنی کا ذریعہ بنایا اور فکاہت و ظرافت کے انداز میں مسئولیتِ خداوندی سے عہدہ برآ ہونے کی سعی کی۔ ان کی تنقید حکمت کا پہلو لیے ہوئے تھی۔ وجادلھم بالّتی ھی احسن ان کے پیشِ نظر رہتا۔ ناگوار معاملات پر خوشگوار انداز میں تنقید اور تبصرہ ان کا طغرائے امتیاز تھا۔ ایسی خوبیوں والے ادیب کم ہی ملیں گے۔

الحق

جنوری ۱۹۷۸ء

پروفیسر محمد حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ

مُحقق ○ ادیب ○ نقاد ○ افسانہ نگار

پچھلے دنوں دستِ بیدادِ اجل نے ہم سے کئی ایک ایسے اصحابِ علم و فضل کو چھینا جن کی جدائی سے پیدا ہونے والی خلاء علم و ادب کے میدانوں میں جلد پُر نہ ہوسکے گی۔

اردو کے صاحبِ طرز انشاء پرداز جناب ابن انشاء کی وفات کے بعد یکایک جناب پروفیسر حسن عسکری[1] صاحب نے داغِ مفارقت دیا۔ عسکری صاحب اوّلاً تو اُردو ادب کے ممتاز افسانہ نگار، نقّاد اور مُترجم تھے، پھر تنقید و تحقیق کا سکّہ علم و ادب کی دنیا میں جما دیا یہاں تک کہ بین الاقوامی شہرت حاصل کی، جتنے صاحبِ علم ہوتے گئے اتنے ہی صاحبِ حال اور صاحبِ علم بھی ہوئے۔ طبعاً تو مرحوم عمر بھر خود نمائی سے گریزاں، زندگی کے ہنگاموں سے دور اور گم گو رہے، مگر آخری زندگی تو قابلِ رشک تھی، فلسفہ کی موشگافیوں سے نکل کر تصوّف و سلوک کے سایۂ عافیت میں انہیں اطمینانِ قلب کی دولت ملی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم مفتیٔ اعظم پاکستان کی شہرۂ آفاق تفسیر "معارف القرآن" کے انگریزی ترجمہ و ترتیب کا کام ان کی تحریری زندگی کا حسنِ خاتمہ تھا عصرِ حاضر کو "معارف القرآن" جیسی مفید اور کار آمد تفسیر کے انگریزی

---

[1] جناب سراج منیر صاحب حسن عسکریؒ کے بارے میں "روایت" کے صفحہ ۴۵۶ پر لکھتے ہیں:۔

—— "محمد حسن عسکری مرحوم اُردو ادب میں قطبی ستارہ تھے، کوئی اس کی سمت چلا یا مخالف رُخ کا تعین اس سے کیا، ان کے مخالفین نے باستثنائے چند ہمیشہ ان کے وسیع مطالعہ اور فکری دیانت سے خوفزدہ ہو کر ذاتی نوعیت کے سطحی الزامات کا سہارا لیا۔ ادبی محاذ پران کے خلاف مہم ترقی پسند نقطۂ نظر کے بقیۃ السیف سپاہیوں کی جھنجھلاہٹ اور غصہ کا بے مغز اظہار تھا" —— (مرتب)

ایڈیشن کی بڑی ضرورت تھی۔ قرآنِ کریم کے انگریزی ترجمہ و تشریح کے ایک اور اہم غیر مطبوعہ کام میں بھی آپ کے تعاون کی طرف نگاہیں لگی ہوئی تھیں مگر افسوس کہ وقتِ موعود آیا اور یہ سارے کام ادھورے رہ گئے جب کہ ایسے اہم کاموں کے اہل افراد کی بڑی قلّت ہے[1] ـــــ مگر ما شاء اللہ کان وما لم یشاء لم یکن۔

الحق کے لیے یہ بات باعثِ فخر رہی ہے کہ پروفیسر صاحب مرحوم اپنے خطوط میں الحق کی تحسین فرماتے رہے اور دلی لگاؤ کا اظہار فرماتے، حُسنِ ظن کا یہ تعلق صرف مخاطبت اور مراسلت تک نہ تھا، بلکہ ان کی وفات کے بعد پاکستان ٹیلیویژن نے ان کی یاد میں جو قومی پروگرام نشر کیا۔ اس میں جناب ڈاکٹر عبادت بریلوی پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور و صدر شعبہ اُردو پنجاب یونیورسٹی نے دیگر شرکاء مجلس فیض احمد فیضؔ اور احمد ندیم قاسمی صاحب سے عسکری مرحوم کا یہ تبصرہ نقل کیا کہ ـــــ "اگر انہیں اُردو کا معیاری نثر پڑھنا ہے تو وہ اکوڑہ خٹک سے شائع ہونے والے الحق کے رسالہ میں آپ کو مل سکتا ہے ـــــ"

---

[1] نو مسلم فرانسیسی عالم اور فلسفی (رینے گینوں) شیخ عبد الواحد یحییٰ (متوفّٰی ۱۹۵۱ء) کو متعارف کرانے میں حسن عسکری مرحوم نے مرکزی کردار ادا کیا ـــــ "روایت" کے صفحہ ۲۱۹ پر محمد اکرم چغتائی صاحب لکھتے ہیں ـــــ "ابتداءً یہ نام ان کی تحریروں میں حوالے کے طور پر آتا ہے، اور یہ وہ دور ہے جسے عسکری مرحوم کے ذہنی سفر کا درمیانی یا عبوری دور کہا جا سکتا ہے۔ اس دور میں نقد ادب فرانس کی ادبی تحریکوں اور نمایاں رجحانات سے اثر پذیری کے ساتھ ساتھ ایک ایسی رو بھی چل رہی تھی جس سے ان کے مذہبی اور مابعد الطبیعیاتی میلانات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ جوں جوں یہ رو تیزی اختیار کرتی جاتی ہے اُن کی تحریروں میں "رینے گینوں" کے افکار کا اثر نمایاں ہوتا جاتا ہے ـــــ عسکری کے انتقادی مطالعات کی اہمیت سے انکار [illegible]، کیونکہ وہ اب اردو تنقید نگاری کی تاریخ کا جزوِ لاینفک ہے لیکن ان کی اہم ترین فکری دین یہ ہے کہ انہوں نے یہاں کے مفکرین، اہلِ دانش اور علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والے تمام اصحاب کو اس نو مسلم فرانسیسی عالم اور بیسویں صدی کے اس عظیم مفکر کے نظریات سے روشناس کرایا ـــــ" (مُرتب)

الحق واقعی اس تحسین کا سزاوار ہے یا نہیں! یہ تو اللہ کے علم میں ہے اور معلوم نہیں کہ ایک دور اُفتادہ دیہاتی مجلہ کی کون سی ادا عسکری صاحب کو پسند آگئی تھی مگر اسے بھی پروفیسر صاحب کی علم نوازی، دینی ادب اور اسلامی رسائل و مجلات سے گہری وابستگی اور تعلق کی دلیل کہنا چاہیے۔

حق تعالیٰ پروفیسر صاحب مرحوم کو اعلےٰ مدارج قرب سے نوازے۔[1] آمین

الحق
جنوری ۱۹۷۸ء

---

[1] "روایت" میں آپ کے خطوط "عسکری بنام فاروقی" کا مطالعہ انتہائی مفید ہے جس میں فلسفہ و تصوف کے مختلف موضوعات پر سیر حاصل مواد پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں آپ کی معرکۃ الآرا تصنیف "جدیدیت" جس کے بارے میں مولانا محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ یہ کتاب انہوں نے میری فرمائش پر لکھی جدید نظریات پر تیشہ زنی کا کام دیتی ہے۔ (مرتب)

مولانا ماہر القادری صاحبؒ

شاعر، ادیب اور نقاد

۱۱ مئی تین بجے شب جدہ (سعودی عرب) میں ایک مشاعرہ کے دوران ادب و تنقید کا ایک چراغ گل ہو گیا یعنی مولانا ماہر القادری انتقال فرما گئے، تدفین جنت المعلیٰ مکہ مکرمہ کے اس خطہ میں نصیب ہوئی جہاں ہمارے سیدالطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ مدفون ہیں، زہے نصیب —— بلند پایہ نعتیہ شاعری میں تو آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ زبان و انشاء کے معاملہ میں بہت سخت گرفت تھی —— دینی موضوعات میں بھی خاصی درک تھی۔ مشرباً سلفیت کے قریب تھے —— ہر چند کہ وہ ایک خاص مسلک سے وابستہ تھے، لیکن علم و ادب اور شخصیات و رجال کے معاملہ میں اوروں کے ساتھ بھی تحمل سے کام نہ لیتے تھے۔ الحق اور یہاں کی دیگر مطبوعات کے ساتھ بھی ایسا ہی محبت کا معاملہ تھا۔ فاران کے آخری شمارہ میں حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی قومی اسمبلی کی سرگرمیوں کی رپورٹ "قومی اسمبلی میں اسلام کا معرکہ" پر تین صفحوں میں تبصرہ لکھا جو بھرپور خراجِ تحسین پر مشتمل تھا —— مرحومین کی یاد میں آپ کی یادداشتیں تلخ و شیریں کا مجموعہ ہوتیں، میں نے ایک دفعہ کہا کہ اذکروا موتاکم بالخیر۔ کی بناء پر درگذر ہی بہتر ہوتی ہے۔

مرحوم سے میری ایک ہی دفعہ مولانا تقی عثمانی کی معیت میں ان کے دولت کدہ پر ملاقات ہوئی مسئلہ کرنسی نوٹوں پر زکوٰۃ کا چھڑ گیا اور ملاقات کا اختتام تلخی پر ہوا، میں نے کہا آپ شعر و ادب تک محدود رہیں، مجتہد اور مفتی نہ بنیں —— مرحوم کی

محبت و عنایت آخر تک قائم رہی ـــــ بے شک ان کی وفات سے علم وادب کے میدان میں ایک خلاء واقع ہوئی ہے[1]

الحق

جون ۱۹۷۸ء

◎

[1] کتابوں پر نقد و تبصرہ میں آپ کسی رعایت کے روادار نہ تھے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ "پرانے چراغ جلد ۲" میں رقمطراز ہیں: "لیکن کبھی کبھی اس جذبہ کی شدت میں ان کے ہاتھ سے احتیاط اور اعتدال کا دامن چھوٹ جاتا، اور ان کے قلم سے بعض مرتبہ واجب الاحترام اور مسلم دینی شخصیتوں کے بارہ میں سخت تنقید کے الفاظ نکل جاتے"..... آگے لکھتے ہیں: "دنیا سے ہر ایک کو جانا ہے لیکن ماہر صاحب جس طرح دنیا سے گئے اور ان کو اپنی برزخی زندگی گذارنے کیلئے جو جگہ ملی وہ ہزاروں کے لیے قابل رشک ہوگی، ۱۲، ۱۳ مئی ۱۹۷۸ء کی درمیانی شب جدہ کے ایک مشاعرہ میں انہوں نے حفیظ جالندھری کو ان کے ایک ایسے شعر پر ٹوکا جس میں ان کے نزدیک دین و مذہب کے ساتھ ایک شوخی و بیباکی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد آن پر قلبی دورہ پڑا اور وہیں راہیٔ ملک بقا ہوئے۔ مکہ معظمہ میں جنت المعلّٰی میں ان کی تدفین ہوئی، اور اس طرح اس جوار رحمت میں انہوں نے جگہ پائی، جس کی آرزو بڑے بڑے علماء اور صلحاء کرتے ہیں۔" (مرتب)

علامہ عبدالعزیز المیمنی رح

۲۸ر اکتوبر کو مشہور اور بزرگ علمی و ادبی شخصیت علامّہ عبدالعزیز المیمنی نے داغِ مفارقت دیا، موصوف علوم عربیہ بالخصوص ادب عربی میں یگانہ روزگار اور ماہرِ فن استاد کی حیثیت سے متعارف تھے ان کی قابلیت کا غلغلہ اس تختی برّ اعظم کے علاوہ عالمِ عرب تک جا پہنچا۔ موصوف نے بڑی عمر پائی مگر آخر وقت تک علم و ادب کی خدمت اور مطالعہ و تدریس میں لگے رہے۔ حق تعالیٰ ملّتِ مسلمہ کو ان کا بہترین بدل عطا فرمادے، ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔

الحق

نومبر ۱۹۷۸ء

◎

آہ ! مولانا محمد الحسنی

۲۲ر رجب کے اخبار العالم الاسلامی مکہ مکرمہ کی اس المناک خبر پہ یقین نہیں آرہا کہ صحافت اسلامیہ کا ایک قوی وجری شہسوار خاندانِ سید احمد شہید کے گل سرسبد اور ہمارے مخدوم ومحترم حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کی دینی وملی امیدوں اور تمناؤں کا نخلستان، محب محترم مولانا محمد الحسنیؒ الندوی مدیر البعث الاسلامی کی ۱۸ر رجب کو اچانک وفات کی شکل میں یوں اچانک اجڑ جائے گا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون و ان للہ ما اخذ ولہ ما اعطی۔

مولانا محمد الحسنی ابھی عالمِ شباب میں تھے، اپنے نامور مربی ومشفق سرپرست، مولانا علی میاں نے ان کی نشأۃ وتربیت میں کوئی کسر نہ اٹھائی کہ خدا نے چاہا تو آگے چل کر وہ خانوادۂ حسنی کی عظمتوں کو قائم ودائم رکھ سکیں گے۔ اس مثالی تربیت وتعلیم نے مرحوم کو آغازِ شباب میں بارآور درخت بنا دیا اور اگر یہ درخت بادِ خزاں کے ہاتھوں یوں اجڑ نہ جاتا تو یقیناً آگے چل کر شجرۂ طوبیٰ بنتا۔ مگر اللہ کی مرضی کے سامنے کس کی چل سکتی ہے۔

مرحوم کو اللہ نے عجیب صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ دینی درد وحمیت، عصر حاضر کے مغربی اور لادینی افکار ومسائل پر گہری نظر، وسعتِ فکر اور پھر اس کے ساتھ عربی ادب، پہ کامل دسترس، کہ گویا وہ عربی تحریر میں مولانا ندوی کے مثنّیٰ (ڈپلی کیٹ) بن گئے تھے۔ اس طرح اردو ادب وصحافت میں اعلیٰ استعداد۔ اللہ اکبر۔ کیسا سرمایۂ علم وادب نوجوانی میں ملتِ مسلمہ کو محروم کر کے چھوڑ گیا۔ پچھلے شعبان میں جب مولانا علی میاں پاکستان تشریف لائے اور دارالعلوم حقانیہ کو بھی اپنے قدوم سے نوازا تو مرحوم محمد الحسنی بھی ان کے ساتھ تھے۔ یہ ان سے میری پہلی ملاقات تھی جو یگانگت فکر، انس ومحبت اور خلوص و

بے تکلفی کی کیسی حسین یادیں چھوڑ گئی۔ اس ملاقات میں مرحوم نے اپنا پہلا اور شاید آخری عربی مجموعۂ مقالات۔ الاسلام المتحن ۔ سے نوازا اور اس تاکید کے ساتھ کہ اس پر کچھ لکھوں ۔کاش! تعمیلِ حکم کی نوبت، انکی زندگی میں آجاتی ۔ مرحوم اپنے زخموں کی دکان غالباً پچھلے بیس سال سے مجلۃ البعث الاسلامی کے اوراق پر سجاتے رہے اور اپنے یکتا و یگانہ دلنشین ابوالحسنی اندازِ بیان اور اسلوبِ نگارش میں عالمِ عرب اور عالمِ اسلام کو جھنجھوڑتے رہے ۔ آخری شمارہ میں تو انہوں نے گویا دل کھول کر رکھ دیا ہے ۔ اور جانے سے قبل شذراتی کالموں میں وصیتیں چھوڑ کر گئے ہیں۔ "الاسلام المتحن" بھی ایک دلِ شکستہ کا ساز ہے ۔ ―――――― اور

ع۔ من قماش فروش دلِ صد پارہ خویشم ۔ کا مصداق ہے ۔ مرحوم کی جدائی پوری دنیائے اسلام کیلئے علم و ادب کا نقصان ہے ۔ دین و دعوت کا خسارہ ہے ۔ مگر ان کے عمِ بزرگوار مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کا تو بڑھاپے کا سہارا اور امیدوں کا باغ اجڑ گیا ہے ۔ ربّ ھب لی من لدنك ولیاً یرثنی ویرث من آل یعقوب۔ الآیۃ۔ مگر امید ہے کہ مولانا کی داعیانہ اور حکیمانہ عظمتیں ہی ان کے صبر و شکیب کا سہارا بن جائیں گی اور وہ کہہ سکیں گے کہ ؎

اگرچہ تلخ ملا جامِ عمرِ فانی کا
مگر محل نہیں ساقی سے بدگمانی کا

فرحمہ اللّٰہ وارضاہ ورضی عنہ ولانقول الّا ما یرضی ربّنا۔

الحق ۔ جون ۱۹۷۹ء

۱؎ آپ حکیم ڈاکٹر مولانا سید عبدالعلی لکھنوی ناظم ندوۃ العلماء و برادرِ بزرگ جناب علی میاں کے اکلوتے فرزند تھے ۔ تفصیلی حالات کیلئے ملاحظہ ہو : پرانے چراغ بمع سینے کے داغ ۔ مصنفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی ۔ اور "تعمیرِ حیات" لکھنؤ، جنوری ۱۹۸۰ء

۲؎ مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ مورخہ ۱۹/ جولائی ۱۹۷۹ء کو آں مرحوم دارالعلوم حقانیہ تشریف لائے تھے ۔ (مرتب)

زُعمَاء، سیاستدان

اور

چند دانشور

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور
اب کوئی آواز سوتوں کو جگا سکتی نہیں
سینۂ ویراں میں جانِ رفتہ آ سکتی نہیں

اقبالؒ

شاستری کی سب سے بڑی عدالت میں پیشی

بھارت کے وزیرِ اعظم لال بہادر شاستری وفات[1] پا گئے۔ ہمیں اس پر کوئی حیرت نہیں۔ موت تو سب کو آنی ہے۔ مسلمان کا عقیدہ ہے کہ اس کی حقیقی زندگی اس کے مرنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ دنیوی زندگی کے عارضی اور وقتی پردہ سرکنے کے بعد وہاں حقائق کی دنیا اور اعمال کے نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انسان نے دنیا میں جو کچھ کیا مرنے کے بعد اس کے مکافات و محاسبہ کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اب شاستری کا معاملہ بھی اس عظیم و برتر منصف و دانا حاکم رب العالمین کے اس دربار میں پیش ہے جس سے بڑھ کر کوئی عدالت نہیں۔ اور جس کے سامنے نہ کوئی لن ترانی اور نہ کوئی ملمع سازی اور سیاست و ڈپلومیسی کام دے سکتی ہے۔ دنیا کے مصنوعی ایوانوں میں بین الاقوامی عدالتوں اور جنرل اسمبلیوں میں گرجنے والے بڑے بڑے جابر و قاہر افراد کی زبان اس دربار میں گنگ ہو جاتی ہے۔ اور اللہ کی مخلوق کی قسمتوں سے کھیلنے والے جبابرہ فرعون و نمرود۔ ہٹلر و مسولینی، نپولین اور چرچل جیسے سورما اس حقیقی عظمتوں کے مالک کے سامنے لرزاں و ترساں ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں زندگی کی ہر بڑی چھوٹی ناانصافی اور حق تلفی کا حساب دینا پڑتا ہے۔ لال بہادر شاستری کا واسطہ بھی اس جبّار و قہّار، حیّ و قیوم، احکم الحاکمین سے ہے۔ وہ کشمیر نہیں چھوڑنا چاہتے تھے،

---

[1] ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستانی افواج کی عظیم الشان فتح اس پر اعصاب شکن طور سے [illegible] (مرتب)

مگر پورا ہندوستان بلکہ پوری دنیا چھوڑ کر چلے گئے۔ بیشک ان ربک لبالمرصاد۔
جبر وظلم اور فانی طاقت کے گھمنڈ پر لاکھوں کشمیری انسانوں کے بنیادی حقوقِ آزادی کی
پائمالی اور خانہ بربادی کروڑوں انسانوں کے امن وسکون کی تباہی یہ سب اعمال ایک
ایک کر کے اب اس کے سامنے ہوں گے۔ اور کوئی بڑے سے بڑا عدالتی ادارہ،
اقوام متحدہ کی اسمبلیاں ناکام وبے بس ہو کر ظلم وحق تلفی کی حمایت میں ایک لفظ تک نہ کہہ
سکیں گی۔ یہاں کے انصاف کے نام نہاد ادارے اقوام متحدہ اور عالمی رائے عامہ تو
انہیں قائل نہ کر سکی۔ مگر اس عظیم دربار میں حقیقت چھپائے نہ چھپ سکے گی۔
آہ! غافل انسان موت کے سامنے کتنا بے بس ہے۔ اور زوال وفنا کے شکنجوں
میں کس طرح جکڑا ہوا ہے۔ سوچتا کیا ہے اور حکیم وعلیم رب کے اٹل فیصلے کتنی مضبوطی سے
اس پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ وقتِ موعود آنے پر کوئی طاقت، قوت، رعیت وسیاست
ساتھ نہیں دے سکتی۔ کاش! یوم الحساب اور آخری زندگی کے فطری حقائق پر ایمان نہ
رکھنے والے بھی کم از کم دنیا کی اس بے ثباتی اور موت وفنا کے جابرانہ تسلط سے عبرت
لیتے۔ اور زندگی کو عدل وانصاف اور انسانی عزت واحترام کے خطوط پر سنوار لیتے۔ اور
اس طرح کم از کم آنے والی نسلوں کی گرفت اور بے لاگ مؤرخین کی لعنت وملامت سے
تو محفوظ ہو جاتے۔

ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ

امریکی سیاہ فام نیگرو راھنما

امریکہ کے سیاہ فام نیگرو راہنما ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ کو کتنی بے وردی سے قتل کیا گیا، اس لیے کہ اُسے خدا نے سیاہ فام پیدا کیا تھا۔ وہ اپنے اور اپنے ہم رنگ[1] و ہم نسل انسانوں کے حقوق کا تحفظ چاہتا تھا۔ ان سیاہ فام انسانوں کے حقوق جنہیں یورپ کے "سفید بندوں" نے حیوانات سے بھی بدتر اور حقیر سمجھ رکھا ہے۔ جن پر ملک کی معاشی راہیں مسدود ہیں، جن کے لیے نصابِ تعلیم، تعلیم گاہیں، ہوٹل، بسیں اور گاڑیاں تک علیحدہ ہیں، یہاں تک کہ کارخانوں میں ان کے آنے جانے کے راستے تک الگ ہیں اور جن کے ساتھ رشتہ ناطہ بہت بڑا "پاپ" سمجھا جاتا ہے ــــــ یہ سیاہ فام انسان بدترین طبقاتی تفاوت، استحصال، ظلم و جبر اور حقوق کی حق تلفی کا شکار ہیں، اُس امریکہ اور یورپ میں جو "تہذیب و تمدن" کی امامت کا مدعی ہے، اُس امریکہ میں جو اقوامِ متحدہ کا چوہدری ہے، جو انسانی حقوق کی حفاظت کا دعویدار ہے، اُس امریکہ میں جو ہمیشہ انسانی حقوق کے چارٹر کا ڈھنڈورا پیٹ کر اپنے ظلم، سفاکی اور ذلت کے داغ چھپانا چاہتا ہے۔ اپنے ملک کے باشندوں کے ساتھ بھیڑ بکریوں جیسا سلوک اُس دعویدارِ تہذیب ملک میں ہو رہا ہے جہاں کے سب سے بڑے شہر نیویارک کی بندرگاہ میں "آزادی کا مجسمہ" دنیا سے آنے والوں کا استقبال ان الفاظ سے کرتا ہے:۔

---

[1] ؎ نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب و رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات (اقبالؒ)

(مُرتب)

"اپنے بے کس مصیبت زدہ اور غلام عوام کو ہمارے سپرد کیجئے تاکہ وہ آزادی کی زندگی بسر کر سکیں، وہ لوگ جن کا نہ کوئی ٹھکانہ ہے اور نہ کوئی وطن، بھیجئے میں حاضر ہوں اور سنہری دروازہ کے قریب اپنی مشعل لیے کھڑا ہوں۔"

مگر اُف قول و عمل کے تضاد کی ایسی بھیانک مثال کیا تاریخ کے کسی دوسرے حصہ میں بھی مل سکتی ہے؟ ہرگز نہیں تاریخ میں پہلی بار دھوکہ فریب، دجل و تلبیس اور عالمی پیمانے کی یہ "بدمعاشی" صرف یورپ اور مغربی تہذیب ہی کو نصیب ہو سکی ہے۔ جس کے نسلی، علاقائی اور قومی امتیازات سے خود امریکہ اور برطانیہ جل رہا ہے۔ رہوڈیشیا مظلوم انسانوں کے خون سے لالہ زار ہے۔ کینیا نالاں ہے، اور جنوبی افریقہ پوری انسانیت پر ماتم کناں ہے، جہاں انسانی خون کی وقعت بول و براز کے برابر بھی نہیں رہی۔ اُف کتنی شوخ چشم اور حیاء سے تہی ہے یہ تہذیب اور کتنے جری ہیں اس کے علمبردار جنہیں اب بھی اپنے آپ پر ناز ہے کتنی کور چشمی اور دیدہ دلیری ہے ان گستاخ نگاہوں کی جو اپنی اس ساری شقاوت، درندگی اور ذلت و رسوائی کو تہذیب و تمدن، اخلاق اور انسانی حقوق کی رعایت کا نام دے کر بار بار اُٹھتی ہیں تو اُس مذہب پر جو حقیقی مساوات کا علمبردار، انسانی حقوق کا نقیب اور پوری کائنات کے لیے رحمت بن کر آیا ہے، اور جو ابتداء سے لے کر آج تک احترام انسانیت کا عملی نمونہ پیش کر رہا ہے، جس کے بھیجنے والے کا اعلان ہے: إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (ترجمہ) "بے شک اللہ کے ہاں تم میں زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہو"، جس کے پیغمبرؐ کا الوداعی پیغام تھا: الناس من آدم و آدم من تراب (ابن سعد) (ترجمہ) "تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے۔" آگے ارشاد فرمایا: "لافضل لعربیّ علی عجمیّ ولا لعجمی علی عربی ولا للاسود علی الاحمر ولا للاحمر علی الاسود الا بالعلم والتقوٰی" (ترجمہ) "کسی عربی کو عجمی اور کسی عجمی کو عربی پر فضیلت نہیں اور نہ کسی سیاہ فام کو سرخ رنگ والے پر اور سرخ رنگ

والے کو سیاہ فام پر فضیلت ہے مگر علم اور تقویٰ کے لحاظ سے " ایک روایت میں یہ اضافہ ہے: ولا لابیض علی اسود۔ (ترجمہ) "نہ کسی سفید کو سیاہ فام پر کوئی فضیلت ہے"

یہ اُس مذہب کی بات ہے جس نے ایک سیاہ فام حبشی بلالؓ کو انسانیت کی معراج سے نوازا، جنہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت میں اپنے سے آگے آگے چلنے کی بشارت دی، اور جب ایک صحابیؓ نے انہیں "او حبشن کے بیٹے" کہہ کر پکارا تو حضورؐ نے اسے ڈانٹ کر فرمایا: "تم میں اب بھی جاہلیت کی بو باس باقی ہے"۔۔۔ یہ اُس سیاہ فام بلالؓ کی بات ہے جسے اسلامی قلمرو کے سب سے بڑے فرمانروا فاروقِ اعظمؓ، "یا سیدنا!" "اے ہمارے سردار" سے پکارا کرتے تھے۔ اور یہ وہ فاروقِ اعظمؓ ہیں جن کا جنازہ اپنے علم و فضل کی بدولت ایک عجمی نژاد صہیب رومیؓ نے پڑھایا جبکہ سرخ و سفید رنگ والے کئی جلیل القدر صحابہؓ موجود تھے ۔۔۔ یہ اُس دینِ قیم کی امتیازی شان ہے، جس نے والیٔ مصر کے ساتھ ملنے والے وفد کی قیادت ایک ایسے سیاہ فام صحابی حضرت عبادہؓ بن صامت کو سونپ دی تھی، جسے دیکھ کر بادشاہ لرز گیا اور اصرار کرنے لگا کہ دوسرے شخص کو میرے ساتھ گفتگو کے لیے مقرر کر دو، مگر مسلمانوں نے والیٔ مصر کی یہ خواہش ٹھکراتے ہوئے کہا کہ چونکہ یہ شخص علم و فضل اور تقویٰ میں ہم سب سے بڑھ کر ہے، اس لیے یہی ہمارا امیر ہے۔ نیز فرمایا کہ ہماری فوج میں تو ایک ہزار سے زیادہ ایسے سیاہ فام شخص ہیں ۔۔۔ یہ اُس مذہب کی بات ہے جس نے ہر دور میں عجمی موالی[1] اور سیاہ فام غلاموں کو دین اور علومِ دین میں اجتہاد اور امامت کا منصب عطا فرمایا۔ یہ اُس دینِ حنیف کی خصوصیت ہے جس نے ایک بھینگے، لنگڑے، اپاہج اور چپٹی ناک والے سیاہ فام شخص حضرت عطاؒ بن ابی رباح

---

[1] اس بارے میں ابن شہاب زہری اور اموی مروانی حکمران عبدالملک بن مروان کا تاریخی مکالمہ جسے مولانا مناظر احسن گیلانی نے تدوینِ حدیث ص ۱۲۹ پر ذکر کیا ہے، انتہائی دلچسپ ہے۔ (مرتب)

کے سامنے اجلۂ علم و فضل کو سرنگوں کرا دیا جن کی وفات کو اہلِ مدینہ نے "عافیت سے محرومی" سمجھا۔ (ما وجد ناہ الا کالعافیۃ) جن کے بارہ میں اسلامی سلطنت کے فرمانروا عبدالملک بن مروان موسم حج میں منادی کراتے تھے کہ عطاء کے علاوہ کوئی اور فتویٰ نہ دے۔ وہ عطاء جو اہلِ حرمین کا امام اور فقیہ تھا، اور جنہیں مسلمانوں کے سب سے بڑے پیشوا ابوحنیفہؒ نے اپنے تمام اساتذہ اور شیوخ سے افضل قرار دیا۔

یہ اُس روشن محمدی تہذیب اور حقیقی ملت کی داستان ہے، جس کے ایک خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک سیاہ فام لونڈی کی شکایت پر والئ مصر ایوب بن شرحبیل کو مامور کیا کہ میرا خط ملتے ہی تم خود سواری کسو، خود روانہ ہو جاؤ اور اپنے سامنے اُس کے گھر کی دیوار بلند کرا دو۔ گورنر نے جا کر بڑی تلاش کے بعد گمنام لونڈی کا مکان معلوم کیا اور خود اپنی نگرانی میں امیرالمؤمنین کی خواہش پوری کی۔

تُف ہے اس عقل و خرد پر جو اس روشن اور تابندہ تہذیب کی عصرِ حاضر کی خونی اور ذلیل تہذیب سے کچھ بھی نسبت قائم کرے[1]۔

الحق
مئی ۱۹۶۸ء

---

[1] یورپی استعمار اور اس کی تہذیب پر مولانا نے جس پُرحکمت انداز سے تیشہ زنی کی ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ (مرتب)

علامہ آئی آئی قاضی
یا
عقل و فلسفہ کی خودکشی

سندھ کے شہرۂ آفاق عالم و فاضل علامہ آئی آئی قاضی نے کشاکشِ حیات سے مغلوب و مایوس ہوکر خودکشی کر لی۔ قاضی صاحب کئی زبانوں کے ماہر علومِ جدیدہ عقلیات اور فلسفہ کے ممتاز سکالر اور مصنّف تھے۔ یورپ کی بلند پایہ شخصیتوں سے بھی شوقِ فلسفہ کی تسکین کی، مگر خاتمہ ایک ایسے لرزہ اندام جرم خودکشی پہ، جس کے بارہ میں حضور ؐ نے فرمایا کہ "خودکشی کرنے والے کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ اور جس اذیّت ناک شکل میں اس نے خودکشی کی جہنم میں وہ ہمیشہ اسی حالت میں مبتلا رہے گا۔ (بخاری عن ابی ہریرۃؓ)

قاضی صاحب کے اس بھیانک انجام میں ہمارے لئے نصیحت ہے کہ زندگی کی گتھیاں عقل و فلسفہ سے نہیں سلجھ سکیں، علم جو نورِ نبوّت سے مستفاد اور ربّانی ہدایت اذعان اور یقین سے مالا مال نہ ہو، وہ نہ تو ہمیں دل کی روشنی دے سکتا ہے، اور نہ اطمینان و عافیت کی دولت، ایسے علم و فضل اور عقل و فلسفہ سے اس گنوار بوڑھی عورت کی جہل و سادگی ہزار درجہ بہتر ہے جو سخت سے سخت حالات میں بھی تسلیم و تفویض، توکل اور اعتماد علی اللہ کی دولت سے سرشار ہے جسکی بدولت نہ تو زندگی کی تلخیاں اس پر اثر انداز ہوتی ہیں اور نہ زندگی کا کوئی نازک سے نازک مرحلہ اسے سپر انداز کر سکتا ہے۔

ایمان کی روشنی سے محروم ایسا ہی علم و فلسفہ تھا جس پر حضرت عمرؓ نے دینِ اعراب کو ترجیح دی اور فرمایا: کونوا علی دین الاعراب۔ (دیہاتیوں کے دین پہ

جم جاؤ)

عقل و فلسفہ کے امام فخر الدین رازیؒ کو چین و اطمینان کی نعمت اسی سادہ مگر موثر ایمان سے نصیب ہوئی جو نہ تو کسی تاویل و استدلال کا مرہون تھا نہ عقل و جدل کا محتاج۔ مرتے وقت فرمایا: اموت علی عقیدۃ عجائز نیشابور (میں نیشاپور کی بڑھیوں کے عقیدہ پر مر رہا ہوں)

آج اس گئے گزرے دور میں اگر دیگر اقوام کی بہ نسبت مسلم قوم میں خودکشی کرنے والوں کی تعداد صفر کے برابر ہے، تو یہ اس ایمان اور خدائی روشنی کا کرشمہ ہے جس سے محروم ہو کر انسان اپنے ہاتھوں دنیا و آخرت دونوں برباد کر دیتا ہے۔

الحق

محرم ۱۳۸۸ھ

---
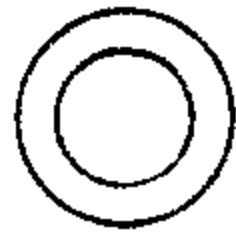
[1] مولانا روم قدس سرہ نے کیا خوب فرمایا ہے:-

چند خوانی حکمت یونانیاں حکمت ایمانیاں راہم بخواں

(مرتب)

امریکہ کے صدارتی اُمیدوار

رابرٹ کینیڈی کا قتل

امریکہ کے صدارتی امیدوار رابرٹ کینیڈی کا قتل ایک "المیہ" ہے[1] مگر یہ تو ایک شخصی معاملہ ہے، اس وقت انسانیت کا سب سے بڑا المیہ خود امریکہ اور امریکی قوم ہے، جس کے ہاتھوں ہزاروں لاکھوں انسان ویٹ نام میں جل رہے ہیں، فلسطین اُجڑ گیا ہے۔ سرزمین قدس کے مظلوم عرب خاک و خون میں تڑپ رہے ہیں اور جو بچ گئے ہیں وہ در در کی خاک چھان کر ذلت و مسکنت کی زندگی گذار رہے ہیں، اور یہ تو صرف فلسطین اور ویٹ نام کا حال ہے ورنہ اس وقت دنیا میں جہاں کہیں بھی استحصال و استعمار یا انسانی حقوق کی پامالی اور جبر و بالادستی ہے اس میں بالواسطہ یا براہ راست ان ہی سفید فام یورپیوں کا ہاتھ ہے امریکہ نے جو کچھ بویا اب اس کا پھل کاٹ رہا ہے۔ قدرت کا عجیب دستور ہے۔ بسا اوقات اللہ تعالٰی ظالم کا گلا خود اس کے ہاتھوں سے کٹوا دیتا ہے مظلوم و مقہور انسانیت سے کھیلنے والے امریکیوں کے ہاتھ اب اپنے ہی گریبانِ عصمت اور دامنِ عفت و عافیت کو تار تار کر رہے ہیں۔

پچھلے ماہ کے صرف ایک ہفتہ کے اعداد و شمار کے مطابق امریکہ میں تقریباً دو ہزار افراد یا تو قتل ہوئے یا انہوں نے خودکشی کی۔ افلاس، بیروزگاری، طبقاتی کشمکش کا عفریت الگ اس کے سر پر سوار ہے۔ اور بین الاقوامی بدنامی، سیاسی تخلف، جنگی زیردستی الگ اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ اور ان سب چیزوں سے بڑھ کر رنگ و نسل کا مسئلہ جس نے امریکیوں کے

---

[1] دنیا کے "مہذب ترین اور متمدن" ملک امریکہ کی تصویر کا سیاہ رُخ۔ (مرتب)

امن و امان کو تہس نہس کر دیا ہے۔ اور یہ ظہور ہے اس خدائی قانون، مکافاتِ عمل کا جس کی گرفت سے کوئی قوم یا فرد اور معاشرہ نہیں بچ سکا۔ ظالم کا ظلم اور سفاکی جتنی شدید ہو گی قدرت کی پکڑ بھی اتنی ہی سخت ہو گی۔ آج اگر امریکہ پر قتل و قتال اور خونریزی کے بادل چھائے ہوئے ہیں، تو یہ ٹھیک ردِ عمل ہے اس عالمی ڈکیتی اور غنڈہ گردی کا جس کی بنا پر امریکہ نے یہود جیسے راندہ درگاہ قوم کی سرپرستی کی اور اسے عربوں کے سینہ پر براجمان کر دیا۔ ایسی قوم کی پشت پناہی جس کی ذلت اور مغضوبیت پر خدا نے دائمی مُہر ثبت کی ہو، ہرگز ہرگز عزت، غلبہ اور دنیا میں مقبولیت کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

کینیڈی کو کسی عرب نے قتل کیا یا امریکی نے، مگر ووٹ کی خاطر یا اپنی مسخ شدہ اسلام دشمن فطرت کی وجہ سے وہ اسرائیل کی حمایت میں پیش پیش تھا اور خدا نے مغضوب اور ذلیل قوم کی حمایت کا مزہ اسے چکھا دیا۔

یہ تو امریکہ کی تصویر کا وہ سیاہ رُخ ہے جس پر ظاہر بین نگاہیں نہیں پڑتیں، یورپ کی سرمایہ داری، عیاشی اور دولت کی ریل پیل اور مادی آسائش کا "روشن" پہلو بھی اس سے کم سیاہ اور مہیب نہیں۔ ایمان، تصورِ آخرت اور روح سے کھوکھلی زندگی کا یہ پہلو بظاہر بڑا دلکش مگر بباطن سراپا عذاب ہے۔

ایک کینیڈی خاندان کو لیجئے، اس مختصر کنبہ کو اپنے والد سے اخبار "ڈیلی میل" کی اطلاع کے مطابق ۲۵ کروڑ پونڈ کی دولت ملی جو پورے مغربی پاکستان کے بجٹ سے زیادہ ہے۔ مگر دولت کی اس فراوانی کے باوجود اس خاندان کا کیا حشر ہوا یا ہو رہا ہے، کچھ قتل ہوئے، اکثر مختلف حوادث کے شکار ہوئے اور کچھ اندرونی بے چینی اور پریشانی کے ہاتھوں ذہنی یا جسمانی طور پر مفلوج ہیں۔

یہ عبرت انگیز مثال ہے مال و دولت اور مادی زندگی کی بے ثباتی اور بے مروتی کی، اور تصدیق ہے اُن ارشاداتِ ربانی کی جس میں مال و دولت کو ڈھلتی چھاؤں، چند روزہ بہار، نظر کا دھوکا اور متاعِ فریب کہا گیا ہے ——— کمثل غیث اعجب الکفار نباتہ ثم یھیج فتراہ مصفراً ثم یکون حطاما۔ (دنیا کی مثال

بارش جیسی ہے جس کی سبزی نے کسانوں کو خوش کر دیا، پھر وہ خشک ہو جاتی ہے تو تُو اُسے زرد شُدہ دیکھتا ہے پھر وہ چُورا ہو جاتا ہے) ——— دُنیائے فانی کی یہی وہ بے وُقعتی ہے جسے قرآنِ مجید نے ان الفاظ سے ظاہر کیا: وما اغنیٰ عنہ مالہٗ اذا تردّیٰ۔ (جس وقت وہ ہلاک ہوتا ہے تو اُس کا مال اُسے کچھ نفع نہیں پہنچاتا) ——— ما اغنیٰ عنہ مالہٗ وما کسب (اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا اُس کے کام نہ آیا) ——— اور جب پردۂ فریب نگاہوں سے ہٹ جائے گا تو یہ بندۂ ہوَس و ہوَس اور نشۂ دولت سے سرشار انسان خود بھی چیخ اُٹھے گا: ما اغنیٰ عنّی مالیہ ھلک عنّی سلطانیہ۔ (میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا مجھ سے میری حکومت بھی جاتی رہی) ——— اور یہی وہ معیشۃً ضنکًا (تنگ زندگانی) ہے جو ہوسِ دنیا، خالق و مخلوق سے بے نیازی اور سچائیوں کو جُھٹلانے کی صورت میں انسان کو گھیر لیتی ہے۔

یورپ کے کروڑپتی امیروں کی "خوش عیشی" پر مرمٹنے والو! ذرا دیدۂ عبرت کھولو، ان میں سے ہر ایک کا حال اُس راک فیلر اور ہنری فورڈ جیسا پاؤ گے جن سے اپنی دولت کا حساب تک نہ ہو سکتا تھا، مگر اندرونی بے چینی اور ذہنی خلاء کی وجہ سے انہیں کبھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہو سکا۔ اور جن میں سے ایک (راک فیلر) بھری پارلیمنٹ میں پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا اور ایوان سے پوچھنے لگا کہ مُجھے بتلا دو کہ حقیقی کامیابی کیا چیز ہے؟ اگر مال و دولت کامیابی ہے تو میں اپنی ساری متاع ایک رات کے سکون پر نثار کرنے کو تیار ہوں"۔ مگر آہ! اُسے کون سمجھاتا کہ سکونِ قلب، حیاتِ طیبہ اور عافیت سے بھرپور زندگی تو صرف اور صرف اللہ کی یاد، اس سے صحیح تعلق اور ایمان و یقین کی دولت سے مل سکتی ہے۔

بیسویں صدی کی مادّی تہذیب پر مرمٹنے والو! تمہارے لیے صد ہزار نصیحت ہے ان کینیڈیوں اور راک فیلروں کے حسرتناک انجام میں۔ خالص مادّی تہذیب تو

خدا کا وہ عذاب ہے جس کی تپش دل کی گہرائیوں تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃ ۔ عافیت اور سکون کی دولت تو خدا تعالےٰ کی یاد ہی سے مل سکتی ہے — الا بذکر اللہ تطمئن القلوب ۔ آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ تعالےٰ کی یاد ہی سے دل مطمئن ہو سکتا ہے۔

الحق

جولائی ۱۹۶۸ء

◎

سکندر مرزا

جناب سکندر[1] مرزا لندن میں وفات پاگئے اور تہران میں دفن ہوئے ــــــ دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں ۔۔ نہ کہیں ماتم نہ تعزیت نہ فاتحہ خوانی اور نہ مجلسِ عزا، بلکہ ع

بر مزارِ ما غریباں نے چراغ و نے گلے

ان کے پیشرو ملک غلام محمد نے یہ دو گز زمین ارضِ طیبہ مدینہ منورہ میں حاصل کرنا چاہی مگر انہیں یہ دو گز ملے بھی تو کراچی کے گورا قبرستان میں۔ جہاں ایک ثقہ راوی کے کہنے کے مطابق کئی راہ گیروں کو ان کے سرہانے کھڑے ہو کر پیشاب کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ العظمۃ للہ و انا للہ و انا الیہ راجعون ــــ یہ ہمارے ملک کے سیاہ ترین باب کے دو فصل ہیں جو مکمل ہو گئے، تیسرا باب ــــ محمد ایوب خان ــــ جو تماشا گاہِ عالم بننے کے لیے ابھی زندہ ہے، اور ہر روز دیکھے مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ کی صلائے عام دے رہا ہے۔ قدرت کی گرفت اور قانونِ مکافات کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اس فصل کی تکمیل بھی ویسی ہی بھیانک ہو گی[2] خدا کرے اس قوم کو نہ تو کوئی ایسا دوسرا باب لکھنا پڑے نہ کبھی اس باب کی چوتھی فصل دیکھنا نصیب ہو۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ ہم سب کے حق میں بہرحال دُعا گو ہیں، مگر کاش "قومی اور ملی مجرموں" کے حق میں کسی کی دُعا قبول ہو سکتی ــــ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

الحق ــــ دسمبر ۱۹۶۹ء

---

[1] پاکستان کے گورنر جنرل [2] آپ کی موت بھی نہایت گمنامی میں واقع ہوئی، اور یہ پیشگوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ ع دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو (مرتب)

انڈونیشیا کا فرزندِ جلیل

سوئیکارنو

انڈونیشیا کے بطلِ جلیل ڈاکٹر عبدالرحیم سوئیکارنو وفات پا گئے اور وہ گرجدار آواز خاموش ہوگئی جس کی للکار سے مغربی سامراج لرزہ براندام رہتی اور اقوام متحدہ میں زلزلہ آجاتا انڈونیشیا کے بہادر حریت کا سرخیل، ایشیا کا مردِ غیور، عالم اسلام کا غمگسار چلا گیا۔ اور سامراجی طاقتوں کے لئے ایک خدائی تلوار ٹوٹ گئی۔ مگر اس کی چمک دمک سے آج بھی عیار اور خونخوار مغرب کی آنکھیں خیرہ ہیں۔ اس کا مشن زندہ ہے۔ اس کا جذبۂ جہاد اور جوشِ عمل تمام ایشیائی اقوام بالخصوص عالم اسلام کے لئے روشنی کا مینار ہے۔ مسلمانوں کو حق حاصل ہے کہ اپنے اس فرزندِ جلیل پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فخر کریں جس نے نہایت بے سروسامانی کے عالم میں جاپانیوں اور ولندیزیوں کے مقابلہ میں تین ہزار بکھرے ہوئے جزیروں کو متحد کر کے ایک، آزاد اور پر وقار مقام تک پہنچایا۔

آج عالم اسلام کو عظیم انڈونیشیا پر ناز ہے۔ ایک ظالم اور جابر قوم کے مقابلہ میں مظلوم و محکوم منتشر مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو دینا سوئیکارنو کی بے مثال قربانی، جدوجہد، سرفروشی اور حسن و تدبر و استقامت کی دلیل ہے۔ سوئیکارنو انڈونیشیا تھے اور انڈونیشیا سوئیکارنو بلاشبہ وہ انسان تھے۔ اُن کی ذاتی زندگی میں خامیاں بھی تھیں، مگر اتنی ہرگز نہیں جتنا مغربی استعمار اور اس کے ذریت نے مخصوص عزائم کی بناء پر بڑھا چڑھا کر پیش کیا وہ یورپ کے گلے کا کانٹا تھے اور عالم اسلام کے قابلِ فخر فرزندوں اور استعمار دشمن غیور اور جسور بہادروں کو رسوا و بدنام کرنا یورپ کا خاص حربہ رہا ہے۔ وہ عمر بھر ظلم اور استعمار کے خلاف برسرِ پیکار رہے مگر عمر کے آخری حصہ میں بین الاقوامی سازشیوں اور اندرونی جاہ پسندوں

سے اس وقت ہار گئے جب وہ اپنی زندگی کی پوری توانائیوں سے انڈونیشیا کے افق پر آزادی کا چراغ روشن کر چکے تھے یہ چراغ نہ صرف انڈونیشیا بلکہ پورے عالم اسلام کو قوت ارادی، عزم مسلسل، احساس خودی کی حرارت دے رہا ہے۔ وہ حرارت جس سے جغرافیائی اور تمام مادی رکاوٹیں پگھل جاتی ہیں اور ۱۹۶۵ء جیسے نازک وقت میں ایک انڈونیشی اور پاکستانی مسلمان ایک جان دو قالب بن جاتا ہے۔ جو آنکھیں استعمار کے اس بدترین دشمن کی چمک دمک سے چندھیا گئی ہیں۔ آج ان میں اپنے اس بطل جلیل کے لئے ایک آنسو بھی نہیں ہے۔ مگر امریکہ اور یورپ سے معمولی نفرت رکھنے والا ہر مسلمان ہر ایشیائی ہر حریت پسند ہر سامراج دشمن سوئیکارنو پر نوحہ کناں ہے۔

الحق

جمادی الاولیٰ ۱۳۹۰ھ

جولائی ۱۹۷۰ء

زعیمِ مصر

جمال عبد الناصر

عالمِ اسلام کے فرزندِ جلیل اور عالمِ عرب کے بطلِ عظیم زعیم مصر صدر جمال عبد الناصر اچانک ملتِ مسلمہ کو داغِ مفارقت دے گئے۔ افریشیائی اقوام کا نشیدِ حریت اور ناقوسِ آزادی یکایک خاموش ہو گیا۔ افسوس کہ استعمار کو للکارنے والا مردِ جری اور سامراج کا بدترین دشمن ہم سے جدا ہو گیا، ساری انسانیت ماتم کناں ہو گئی اور پوری عرب دنیا حیران اور سرگرداں رہ گئی، مصر کا سہاگ اجڑ گیا اور عالمِ عرب کی آبرو چلی گئی۔ سچ ہے اگر ایسے موقعہ پر کہا جائے ؎

وما کان قیسٌ هُلکُهٔ هلکُ واحدٍ
ولکنّهٔ بنیانُ قومٍ تهدّما

مرحوم صدر ناصر کے بعض اقدامات اور پالیسیوں سے اختلاف کیا جا سکتا تھا اور دشمنوں نے اسے بڑھا چڑھا کر اچھالا بھی، مگر صدر ناصر نے استبداد اور استعمار میں جکڑے ہوئے عالمِ عرب کی نشاۃِ ثانیہ میں جو بنیادی کردار ادا کیا اُسے تسلیم کرنے پر ان کا بدترین دشمن بھی مجبور ہو گا۔ انہوں نے عربوں کو آزادی کا سبق سکھایا، شہنشاہیت کے بت توڑے، اتحاد اور خودی کا جذبہ ابھارا، عربوں کو مغربی سامراج کے طلسم سے نکالا۔ جہادِ حریت کے ہر محاذ پر وہ سالارِ کارواں بن کر نمودار ہوئے، وہ فرشتہ نہیں انسان تھے ان میں خامیاں بھی ہو سکتی تھیں، اللہ تعالیٰ ان سے درگذر کرے، مگر یہ حقیقت جھٹلائی نہیں جا سکے گی کہ صدیوں بعد عالمِ اسلام کو ان جیسا غیور وجسور باہمت، بلند حوصلہ، معتدل مزاج اور بلند اقبال رہنما نصیب ہوا تھا۔ اس وقت عرب دنیا ایک نازک موڑ پر ہے جسے صدر ناصر

جیسے رجلِ عظیم کی بے حد ضرورت تھی۔ مگر خدائے حکیم و علیم کی مرضی کے سامنے کس کی چل سکتی ہے وہی حکمتوں والی ذات ہے، وہی اچھی طرح جانتا ہے۔ کہ عربوں کے مقدر میں کیا لکھا ہے۔ سب کو اس دنیا سے جانا ہے، مگر صدر ناصر کا ایسے حالات میں عربوں سے جدا ہو جانا علاماتِ ساعت میں سے کچھ کم بات معلوم نہیں ہوتی۔ صدر ناصر فوت ہو گئے ہیں مگر ان کو زندہ رکھنے کی ایک صورت ہے کہ ساری اسلامی دنیا ان کے مشن کو تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرے اور وہ مشن ہے پورے ایشیا بالخصوص عرب دنیا سے مغربی سامراج کے نام و نشان مٹانا۔ عرب دنیا اور عالمِ اسلام کو متحد کرنا۔

صدر ناصر ہمیں یہی سبق دے گئے ہیں اور یہی وہ بہترین خراجِ عقیدت ہے جو صدر ناصر جیسے اولوالعزم قائد کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

الحق
اکتوبر، نومبر ۱۹۷۰ء
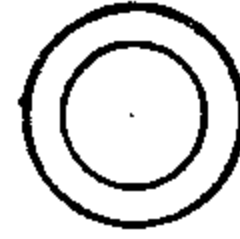
رُوسی آمرِ مُطلق خروشیف

بے خُداؤں کے خُدا کا عبرت ناک انجام

رُوس کے آمرِ مطلق اور سابق وزیرِ اعظم نکیتا خروشیف[1] انتقال کر گئے، موت بڑی کسمپرسی کی حالت میں ہسپتال میں آئی نہ کہیں ماتم اور نہ کوئی غمگسار۔ چند احباب اور خاندان کے افراد ہسپتال میں آکر تابوت سے گذرے اور اظہارِ افسوس کیا۔ تدفین بھی ایک گمنام قبرستان میں ہوئی جس میں چند ہی قریبی افراد اور اخباری نمائندوں نے شرکت کی، قبر پر نہ کوئی چراغ ہے نہ پھول، صرف ایک کتبہ جس پر "نکیتا خروشیف" لکھا ہے۔

یہ اُس شخص کا انجام ہے جو نہ صرف ساری دُنیا کو جوتا دکھا کر قوس ۔ لمن الملک ۔ بجایا کرتا تھا بلکہ نشۂ اقتدار میں ڈوب کر خدا کے وجود تک کو چیلنج دے بیٹھتا تھا، اور پھر جب رُوس کا ایک خلائی سیارہ واپس ہوا تو اُس نے پوری فرعونیت[2] سے کہا کہ خلا بازوں کو کہیں خدا نظر نہ آیا مگر

---

[1] سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے اقانیمِ ثلاثہ میں یہ رسوائے زمانہ دہریہ تیسرے نمبر پر ہے [2] مارچ ۱۹۵۵ء میں جب رُوس نے پہلی مرتبہ اپنا مصنوعی سیارہ خلا میں چھوڑا تھا تو اس آمرِ اعظم نے اندازِ خسروانہ سے یہ بیان دیا۔ "کہ ہمیں آسمان کے اندر کہیں خدا کا سراغ نہیں ملا" اس کے اس الحاد کی مزید وضاحت سوویٹ سائنسز میگزین کے چیف ایڈیٹر نے ماسکو ریڈیو سے تقریر نشر کرتے ہوئے کی جس کے الفاظ یہ ہیں "رُوس کا مصنوعی سیارہ جو حال ہی میں خلا میں چھوڑا گیا ہے اور جو ایسے نازک آلات سے لیس ہے جن میں دیکھنے سُننے اور جائزہ لینے کی پوری طاقت موجود ہے، اس نے جو خبریں بھیجی ہیں اُن میں ایسی کوئی خبر نہیں ہے جس سے مختلف مذہبوں کے اس دعوے کا ثبوت ملا ہو کہ آسمان پر کوئی برتر بادشاہ موجود ہے جو تختِ خدائی پر براجمان اور اس کے ارد گرد فرشتے گھیرا باندھے کھڑے ہوں، اور اس کے آستانوں کا پیغمبر طواف کر رہے ہوں، اور اس کے گوشوں میں جنت اور دوزخ برپا ہوں، اور اس کی عدالت سے قضا و قدر کے فیصلے صادر ہو رہے ہوں۔ گویا یہ تصورات محض وہم ہیں، اور جہالت نے لوگوں کی عقلوں کے اندر آثار رکھے ہیں، یا یہ ڈھکوسلہ ہیں، جسے دُنیاوی اقتدار کے حریص بطورِ حربہ استعمال کر رہے ہیں.... انتہلے" اب وہ خدائے جبار و قہار کی عدالت میں پہنچ چکے ہیں۔ دیر گیر د سخت گیر د مر تُرا ۔ انّ بطش ربّک لشدید ۔ (مرتب)

جلد ہی اُس کا ذلت آمیز زوال شروع ہُوا تو خدا نے اُس پر اپنی عظمت ثابت کرا دی۔ پھر موت بھی آئی تو کیسی! ؎

ہوئے ہم جو مر کے رُسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

اپنے عہدِ عروج میں پوری نسلِ انسانی کو بحران میں ڈالنے والا مغرور اور غافل انسان جب جا رہا تھا تو دو چار آنکھیں بھی اس پر اشکبار نہ تھیں، اُسے اگر زندگی میں قانونِ مکافات اور دُنیا کی بے ثباتی کا احساس نہ ہُوا تو اب ہو چکا ہو گا اور خدا کے وجود کا اعتراف بھی، جب کہ یہ احساس و اعتراف اس کے کسی کام نہیں آسکتا، اب سارے پردے ہٹ کر حقائق سامنے آچکے ہوں گے، یَوۡمَ تُبۡلَی السَّرَآئِرُ فَمَا لَهٗ مِنۡ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ——— ایسے لوگوں کی اس دُنیا میں جو حالت ہوتی ہے قرآن عزیز نے اس کی خبر دی ہے۔ مرنے کے بعد خروشیف کے چہرہ نے ان دنیا والوں کو بھی ان سرائر کی غمازی کی۔ لاش دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس کا چہرہ ایسا سکڑا اور مُرجھایا ہُوا اور اتنا بے رونق اور کریہہ تھا کہ اُسے پہچاننا بھی محال تھا۔ یہ مکافاتِ عمل اور نتائج آخروی کی جھلکی ہے۔ ایمان والے تو یہاں بھی چشمِ بصیرت سے اپنے رب کو دیکھتے ہیں۔ اور وہاں تو دیدہ و مشاہدہ کا کچھ اور ہی عالم ہو گا۔ مگر وہ جنہیں یہاں کے اس وجود سے انکار ہے وہ وہاں بھی اس کی دید سے محروم رہیں گے۔ من کان فی هٰذه اعمٰی فهو فی الاخرة اعمٰی۔ اور جس کا چہرہ یہاں خاک آلود ہے تو وہاں اس کی وحشت اور دہشت کی کیا حالت ہو گی؟ قرآن عزیز سے سُنیئے: ووجوهٌ یومئذٍ علیها غبرة ۝ ترهقها قترة۔ کتنے چہرے ہیں جو اُس دن گرد آلود ہیں، اور کفر کی کدورت اور الحاد و غرور کی ظلمت انہیں تیرہ و تاریک کر رہی ہے: ووجوهٌ یومئذٍ باسرةٌ ۝ تظن ان یفعل بها فاقرة۔ اور کتنے چہرے اس دن سُکڑے ہوئے، مُرجھائے ہوئے اور بے رونق ہوں گے۔ جنہیں یقین ہو گا کہ اب عذاب کا جو معاملہ ہونے والا ہے وہ تو ہماری کمر توڑ کے رکھ دے گا ——— العظمة للّٰہ ہٹلر، مسولینی، سٹالن اور جانسن ظلم و تکبر کے پتلے

مگر انجام کتنا تماشا گاہِ عبرت ؟ ——— آج خروشیف بھی اُسی صف میں شامل ہے جو انّھم عن ربھم یومئذٍ لمحجوبون[1] کا مصداق ہے۔ پوری دُنیا میں آج کوئی نہیں جو خروشیف یعنی خدا کے وجود کو چیلنج دینے والے غافل انسان سے اس کا انجام معلوم کرسکے۔ مگر قرآن اس کی خبر دے رہا ہے: یقول یلیتنی قدمت لحیاتی۔ کاش میں خالی نہ چلا آتا۔ ھلک عنی سلطانیہ۔ آج تو میری قوت و مملکت سب برباد ہو چلی۔ فیومئذٍ لا یعذب عذابہ احدٌ ولا یوثق وثاقہٗ احد[2]

الحق
اکتوبر ۱۹۷۱ء

◎

---

[1] وہ اس دن اپنے رب سے روکے جائیں گے۔ (القرآن)

[2] پس اس دن مار نہ دے اس کی سی کوئی اور باندھ نہ رکھے اس کا سا کوئی۔ (القرآن)

میاں گُل عبدالودودؒ

بانیٔ ریاستِ سوات

پچھلے ماہ سابق ریاست سوات کے بانی میاں گل عبدالودود[1] مرحوم انتقال کر گئے۔ قیامِ مملکت ونظم ونسق میں کئی مراحل سے گذرے، تاریخ ساز شخصیت تھے۔ ریاست کو بنتے اور پھر بگڑتے دیکھا۔ علم دوست رہے، اور اواخرِ عمر میں تو علمی مذاکرات، مطالعہ اور ذکر وفکر ہی سے سروکار رہا۔ حق تعالیٰ ان حسنات کو کفارۂ سیئات بنا دے۔ ادارہ الحق پوری ریاست اور خاندان سے اس غم میں شریک ہے۔

الحق

نومبر ۱۹۷۱ء

---
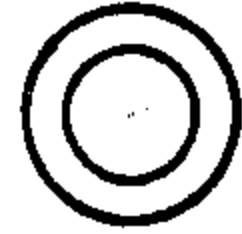
[1] آپ صاحبِ سوات اخوند عبدالغفور کے پوتے ہیں۔ میاں گل عبدالودود بن میاں گل عبدالخالق بن صاحبِ سوات اخوند عبدالغفور صاحب قدس سرہٗ ___ سن پیدائش ۱۸۸۷ء ___ تفصیلی حالات کے لیے "تاریخِ ریاست سوات" ملاحظہ ہو۔ (مرتب)

بنگلہ بندھو کا عبرتناک انجام

بنگلہ دیش میں خونیں انقلاب آیا اور شیخ مجیب الرحمان جو اس نئے ملک کے دو تین بانیوں میں سے ایک تھے اپنے خاندان کے کئی افراد کے ساتھ قتل کر دئے گئے۔ یہ انقلاب جو جذباتی نعروں، خود غرضانہ جدوجہد اور میکیاولی سیاست کے المناک نتائج کا طبعی ردِ عمل تھا۔ برِصغیر کے مسلمانوں کے لئے اپنے اندر عبرت و موعظمت کے صدہا پہلو لئے ہوئے ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ع

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

برّصغیر میں جاہ پرست خود غرض عناصر کے ہاتھوں کئی بار خون کی ہولی کھیلی گئی بنگلادیش کے قیام کے وقت بھی طبقاتی، قومی، لسانی اور معاشی نعروں کی آڑ میں ظلم و بربریّت کا وہ شرمناک اور المناک کھیل کھیلا گیا جس کی نظیریں بہت کم ہی مل سکتی ہیں۔ بالآخر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ قدرت کی تلوار نیام سے باہر آئی اور مجرموں کو اپنا بویا کاٹنا پڑا۔ مگر جو ابھی گرفت سے آزاد ہیں تو اس لئے کہ انہیں شاید کچھ نصیحت ہو جائے۔ اور اگر تدبّر و اعتبار کے سارے راستے مسدود ہو چکے ہیں تو پھر ان کی باری ہے۔ گویا بلاشبہ قانونِ فطرت کا معاملہ بھی مجرموں سے فمنہم من قضی نحبہٗ و منہم من ینتظر جیسا ہے۔ یہی خدا کی سنت ہے۔ سنۃ اللہ الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔

لہ یہ اس المیہ کے شریک جرم اور وقت کے مستبد حکمران ذوالفقار بھٹو کی طرف کھلا اشارہ تھا۔ اور کسے معلوم تھا کہ مولانا کی ان سطور کا پردۂ عالم پر اتنا عبرت انگیز ظہور ہوگا۔ (مرتب)

بنگلہ دیش کا حالیہ فوجی انقلاب شیخ صاحب کی غیر جمہوری روش کا غیر جمہوری ردعمل ہے۔ اور ابھی جبکہ دستور وہی ہے، پالیسی وہی ہے اور مرحوم کے وہی ساتھی برسراقتدار ہیں جنہوں نے انسانوں کی تباہی کی یہ بھٹی سلگائی تو ہم اس انقلاب کو صحیح معنوں میں انقلاب کہہ بھی نہیں سکتے۔ جب تک صورتحال مخدوش اور مبہم ہے۔ اور ہر آنے والا دن نئے حالات کی خبر لا سکتا ہے۔ تو ہم بنگلہ دیش کے بارہ میں کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ حیرت تو ان لوگوں کی جلد بازیوں پر ہے جنہوں نے انقلاب کا سنتے ہی ایسا جشن منایا کہ گویا غیر مصدقہ ذرائع سے بھی "اسلامی جمہوریہ" کا نام سنتے ہی بنگلہ دیش میں خلافت راشدہ قائم ہو چکی ہو۔ برسراقتدار جماعت کی تبریک، وتحسین کے شور وغل سے اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ نئی حکومت تسلیم کرنے کو ایک عظیم کارنامہ قرار دئے جانے سے ایسا گمان ہونے لگا کہ گویا بنگلہ دیش نئے سرے سے پاکستان میں مدغم ہو چکا ہو وہ سیاسی عناصر جو ابھی تک بنگلہ دیش نامنظور کے نقارخانے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے پچھلے سارے مواقف کو سراسر نظرانداز کرتے ہوئے اہلاً وسہلاً اور مرحباً کا طوفان سر پر اٹھایا۔

یہ ایک ہلکی سی تصویر ہے ہمارے ہاں کی اس سطحی اور جذباتی کیفیت کی جو ہم برصغیر میں مسلمانوں کی موت وحیات، جیسے اہم مسائل کے بارہ میں اختیار کئے چلے آرہے ہیں۔ مسائل کے بارہ میں سنجیدگی اور معقولیت، گہرائی سے کام لینا ابھی ہمارے ہاں عنقا ہے۔

بہرحال "بنگلہ بندھو" مجیب الرحمان کا عبرتناک انجام مسرتوں سے زیادہ عبرتوں کا مقام ہے۔ اور جن لوگوں کی تصویریں شیخ مجیب الرحمان کے فریم میں بالکل فٹ آرہی ہیں[1] انہیں اپنے اعمال وافعال، ماضی اور حال پر نگاہ عبرت وموعظت ڈالنی چاہئے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

(الحق: ستمبر ۱۹۷۵ء)

---

[1] چنانچہ بعد کے حالات نے ثابت کر دیا۔ (مرتب)

خادم الحرمین خلیفۃ المسلمین
شاہ فیصل کی شہادت

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمین
بر وصال شیخ مستعظم امیر المومنین

آہ کعبۃ اللہ اور مدینۃ الرسول کا کیسا خادم یکایک دنیا سے چل بسا۔ جلالۃ الملک فیصل المعظم شہید کردئے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ایک ایسے مرحلہ پر کہ عرب اور اسرائیل کے درمیان امن مذاکرات ناکامی کے موڑ پہ پہنچ گئے تھے اور مغرب کا عیار نمائندہ کسنجر بظاہر اس کا ذمہ دار اسرائیل کو ٹھہرا رہا تھا۔ اور جنگ کے بادل نہایت گہرے ہوتے گئے، کہ عالم عرب اپنے ایک عظیم اور مدبّر سپوت سے محروم ہوگیا۔

پرسوں جبکہ اسلامیانِ عالم اپنے آقا اور مولیٰ نبی عربی تاجدار دوجہاں علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کر رہے تھے۔ پاسبانِ حجاز ملک فیصل نے ایسے ہی ایک تقریب میں گویا آقائے مدینہ کے حضور میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔ شہادت تو مطلوب و مقصود مومن ہے اور ملک فیصل نے تو اسی موسم حج میں اپنے خطبہ عرفات کے دوران بیت المقدس کی بازیابی اور فلسطین کی آزادی کی راہ میں شہادت کی آرزو اور تمنا بھی ظاہر کر دی تھی۔ انہوں نے شہادت پا کر حیاتِ جاودانی حاصل کر لی مگر ایک شقی "مسلمان"[1]

---

[1] وہ بھی کوئی پرایا نہیں بلکہ اپنے ہی خانوادہ کے چشم و چراغ جو کہ بادۂ مغرب سے مخمور اور میخانۂ یورپ کا رند بدمست تھا۔ ع اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔ (مرتب)

شقی قاتل کے اس بہیمانہ اقدام سے ایک شخصیت کی زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ دورِ حاضر

کے ہاتھوں ان کی شہادت نے ہماری تاریخ کا وہ سیاہ باب دہرا دیا جبکہ بظاہر اپنوں ہی کے ہاتھوں حضرت عثمان اور حضرت علی اور پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہم کو جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔

آج جبکہ پوری ملّتِ مسلمہ شاہ فیصل کی جدائی پر ماتم کناں ہے۔ علم اور دین کی محفلوں میں قیامت برپا ہے۔ اور مسلمانوں کے ایوانِ حکومت و سیاست اضطراب میں ڈوب چکے ہیں۔ تو اس لئے نہیں کہ مرحوم فیصل ایک بادشاہ اور دنیا کی بہت بڑی مالدار ریاست کے حکمران تھے بلکہ اس لئے کہ عالمِ اسلام اپنے ایک نہایت ہمدرد و شفیق سرپرست اور دردمند بزرگ سے محروم ہو گیا ہے۔ یہ مقام اور منصب انہیں قانون اور روایتی رسم و رواج نے نہیں بلکہ ان کی فعال اور زندہ جاوید شخصیّت نے دیا تھا۔ وہ بظاہر سعودی عرب کے حکمران تھے مگر ان کے درد و اخلاص، ملتِ مسلمہ کی فکرمندی اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی کوششوں، ان کی سیاسی بصیرت، تدبّر، دور اندیشی، شرافتِ نفس، بردباری اور متحمل مزاجی کے ساتھ مدبّرانہ صلاحیتوں نے انہیں دنیا کے کروڑوں مسلمانوں کے قلوب پر حکمرانی بخش دی تھی۔ عالمِ اسلام میں انہیں قلب کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی حرمین الشریفین کی پاسبانی کے ساتھ ذاتی صفات اور بلندئ کردار نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔ اور وہ غیر شعوری طور پر مسلمانوں کے ان احساسات اور تمناؤں کے مرکز بنتے چلے گئے جو وہ اپنے دلوں میں خلافتِ اسلامیہ اور مرکزیتِ عالمِ اسلام کے بارہ میں رکھتے تھے مسلمانوں کی ان حسین اور معصوم تمناؤں کا اظہار عالمِ اسلام کے کئی قائدین نے بھی کیا

کی تاریخ کے تابناک باب کا خاتمہ ہوا۔ آثار و قرائن سے واضح ہو رہا تھا۔ کہ یہ عظیم عہد آفرین شخص سلطان محمد فاتح اور سلطان صلاح الدین ایوبی کا جانشین ہو گا۔ لیکن اسے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ بعد میں ولکم فی القصاص حیات یا اولی الاسباب۔ کے تحت قاتل کا سر قلم کیا گیا۔ (م)

کہ کاش عالمِ اسلام کو مرحوم ملک فیصل کی دامن عاطفت میں پھر خلافتِ اسلامیہ کا گوہر گم گشتہ مل سکے۔

لاہور کی سربراہ کانفرنس[1] میں تو اس کوہ وقار و تمکنت کی ادائیں دیکھ کر یہ احساس اور بھی شدت سے ابھرا، ایسے مواقع پر ان کی شاہانہ تمکنت وعظمت کے ساتھ مومنانہ انکسار و تواضع اور عبدیت میں ڈوبی ہوئی شانِ دلربائی سے دنیا بھر کے اسلامی حکمرانوں میں ان کی انفرادیت اور بھی نمایاں ہو جاتی وہ بظاہر خاموش رہتے مگر دیکھنے والوں سے کہہ رہے ہوتے ؎

من مثال لالۂ صحرا ستم در میان محفلے تنہا ستم

وہ بظاہر با اختیار حکمران تھے مگر لاہور کی بادشاہی مسجد میں رب العالمین کی بارگاہ میں جس انداز غلامانہ سے اپنی جبینِ نیاز جھکا رہے تھے اور احکم الحاکمین کے دربار میں حاضر ہو کر ماحول سے بے نیاز ہو کر اور سراپا عجز و نیاز بن کر جس انداز میں بارگاہ ایزدی میں اپنے آنسوؤں کے آبدار و تابدار موتی پیش کر رہے تھے وہ انہی کا حصہ تھا۔ اور صدیوں بعد شاہی مسجد کو اپنے معمار اورنگزیب عالمگیرؒ کا نمونہ دیکھنا نصیب ہو سکا تھا۔ ع

ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

اسلامیانِ عالم کی نظریں اس بے مثال اجتماع میں عالمِ اسلام کے قائدین کے اس جنگل میں ہارون الرشیدؒ کی عظمت و سطوت عمر بن عبدالعزیزؒ کا درد، عالمگیرؒ کا فقر اور جذبۂ علم پروری تلاش کر رہی تھیں اور اس کی کچھ جھلکیاں دکھائی بھی دیں تو شاہ فیصل مرحوم میں، وہ عموماً خاموش رہتے مگر ان کا دل ملتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ کی تمناؤں کا آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ اور ان کے چہرے کی سلوٹیں ملت کے درد اور مسئولیتِ خداوندی کے گہرے احساسات کی غماز ہوتیں، وہ مسلمانوں کے ہر اہم اجتماع میں اپنی شانِ بے نیازی شاہانہ عظمت اور مؤمنانہ مسکنت کی وجہ سے میر محفل بن جاتے، شاہوں کو وہ شاہ لگتے

---

[1] منعقدہ ۲۴ فروری ۱۹۷۴ء

تو علماء عارفین اور فقراء مقربین کو وہ ایک عارف و زاہد۔ ۱۹۶۴ء میں جب وہ سریر آرائے امارت ہوئے تو زہے نصیب کہ راقم مدینہ طیبہ میں مقیم تھا۔ شاہ سعود کی معزولی اور شاہ فیصل کی امارت کی اطلاع میں نے مدینہ طیبہ کی اسلامی یونیورسٹی میں سنی جہاں میں اتفاق سے رات کو بعض دوستوں کے ساتھ ٹھہر گیا تھا۔ اس تبدیلی اور انقلاب سے آس پاس کے چہروں پر فکر کی لہریں دوڑ گئیں، علم اور دین سے وابستہ افراد اور بالخصوص مغربی استعمار سے عداوت رکھنے والے حلقوں میں تشویش کی فضا پیدا ہوئی، وسوسوں نے انگڑائیاں لیں کہ معلوم نہیں شاہ سعود کے جاری کردہ علم اور دین کے کارہائے خیر کا کیا بنے گا؟ اور نئے حکمران کا رویہ دشمن اسلام امریکہ اور یورپ کے ساتھ کیسا ہو گا؟ جس نے سعودی عرب کو کلی طور پر اپنے رحم و کرم سے وابستہ کر رکھا ہے، وہ مغرب کے حلیف سمجھے جاتے تھے مگر بہت جلد انہوں نے ان تمام خدشات کو غلط ثابت کر دیا اور وہ اس معاملہ میں اپنے پیش رو شاہ سعود سے بھی کہیں زیادہ مدبر، ذہین، معاملہ فہم اور گرم جوش ثابت ہوئے اور مشرق وسطیٰ کے بحران میں انہوں نے مغربی سامراج کے مقابلہ میں نہایت اعلیٰ، بلند اور مثالی قائدانہ کردار ادا کیا، اس لئے کہ وہ مرد مومن تھے، اور بقول مشہور عرب ادیب امیر شکیب ارسلان: لا یجتمع الاسلام والمیل الی الاستعمار الاوربی فی قلب واحد۔ اسلام اور مغربی سامراج کی محبت ہرگز ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد شاہ فیصل نے مغربی استعمار کے عظیم دشمن صدر ناصر مرحوم سے دوستی قائم کرنے میں بھی تامل نہ کیا۔ جن کی زندگی برصغیر کے امام حریت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے ان الفاظ کی عملی تفسیر تھی کہ:

"ہم غاروں میں چرندوں سے، سمندروں میں مگرمچھوں سے اور بھٹوں میں سانپوں سے صلح کر سکتے ہیں لیکن جب تک جزیرۃ العرب کی کسی چپہ زمین پر بھی برطانوی اقتدار باقی ہے ہم انگریزوں کیطرف صلح کا ہاتھ بڑھانے کے لئے تیار نہیں۔"

شاہ فیصل نے ۱۹۶۶ء میں صدر ناصر کے ساتھ جمہوریہ یمن کے قیام کے لئے ایک سمجھوتہ پر دستخط کر دئے۔ وہ اسرائیل سے ہر محاذ پر برسرپیکار ہو گئے اور صیہونیت کے

خطرات سے مسلمانوں کو آگاہ کرتے رہے۔ انہوں نے سیاسی تدبر اور معتدل طبیعت کے ساتھ اپنے مغربی دوستوں پر بھرپور وار کیئے۔ سقوطِ بیت المقدس کی قیامت اور فلسطین کی غلامی کا سانحہ ان کے لئے سوہانِ روح بن گیا تھا۔ اور وہ استخلاص فلسطین اور بیت المقدس کی بازیابی کے لئے سیاسی، جنگی، اقتصادی ہر محاذ پر اپنی بہترین صلاحیتیں استعمال کرنے لگے اس مقصد کے لئے انہوں نے ہر نازک موقعہ پر عرب ممالک کے لئے اپنی بے پناہ دولت کے خزانے کھول دیئے۔ اور گذشتہ جنگ رمضان کے موقع پر تو عملاً بھی جنگ میں کود پڑے اور عالم عرب کے سب سے مؤثر اور کارآمد ہتھیار تیل کو یورپ کے خلاف استعمال کرنے میں تو آپ کو بنیادی رول ادا کرنا پڑا اور بلاشبہ حرب رمضان کی فتح میں شاہ فیصل کا نام سرفہرست رہے گا۔

پھر وہ صرف عالم عرب کیلئے بے چین نہ رہے جس کے اتحاد کے لئے آپ نے لگاتار دورے کئے بلکہ پوری دنیائے اسلام کے اتحاد کا فکر انہیں دامنگیر تھا۔ وہ کسی فیڈریشن پر مبنی جزوی یا علاقائی اتحاد پر نہیں بلکہ عقیدہ اور نظریہ کی راسخ بنیادوں پر مبنی وسیع اور مضبوط اسلامی اتحاد کے علمبردار تھے۔ اور اس اتحاد کے مبلغ بن کر وہ رائد التضامن الاسلامی کہلائے ان کے اتحاد عالم اسلام کے مساعی کا سلسلہ مغرب کی رباط کانفرنس اور اسلامی سیکرٹریٹ سے لیکر مشرق کی لاہور کانفرنس تک دراز ہے۔ ان سٹیجوں پر عالم اسلام کو جمع کرنے میں آپ کا بنیادی حصہ ہے۔

وہ ایک طرف مصر سے مراسم مضبوط کرتے چلے گئے، دوسری طرف اتحاد کے خطوط پر خلیج کی ریاستوں بالخصوص ابوظہبی کے شیخ زائد سے مصالحت کے رشتے نکال لائے۔ پاکستان اور افغانستان کی غلط فہمیاں دور کرنے کیلئے اپنے قاصد دوڑائے، لیبیا اور مصر کو آپس میں قریب رکھنے کی سعی کی، عراق اور ایران کی صلح پر انہیں بیحد مسرت ہوئی اور پاکستان کے افتراق وانتشار اور بنگلہ دیش کی شکل میں دولخت ہوجانے پر انہوں نے آنسو بہائے۔ رباط کانفرنس میں شاہ حسین کو فلسطین کی نمائندہ تنظیم آزادی کو تسلیم کرنے پر آمادہ کیا۔

الغرض! عالمِ اسلام پر جہاں کوئی افتاد پڑتی وہ بے دریغ اپنی جانی اور مالی مدد کے ساتھ پہنچ جاتے۔ پاکستان کے حالیہ زلزلہ میں انہوں نے بہت بڑی مدد کی ان سب باتوں کے علاوہ وہ نہ صرف اسلامی ممالک بلکہ جہاں کہیں بھی مسلمانوں کی تھوڑی بہت آبادی تھی۔ ان کی سیاسی، تمدنی، دینی اور ثقافتی تحفظ اور سرپرستی میں پیش پیش ہوتے۔ اور ان کی علمی دینی اور ثقافتی ضروریات، مسجد مدرسہ لائبریری تعلیمی مراکز کے قیام میں کروڑوں ریال خرچ کرتے۔ رابطۂ عالمِ اسلامی کے ذریعہ علم اور دین کی اشاعت، اقلیتی مسلمانوں کے حقوق کی جدوجہد، تبلیغی اور ثقافتی وفود کی ترسیل اور اسلامی مراکز کا قیام ان کے عظیم الشان صدقاتِ جاریہ میں سے ہیں۔ مغربی اثرات اور شیوعیۃ کے اثر و نفوذ کے تدارک کا آپ کو خاص اہتمام تھا۔ اسلام کے خلاف علم اور ثقافت کے میدانوں میں درپردہ صیہونی اور استعماری سازشوں سے آپ، فکرمند رہتے۔ اسلامی لبادہ اوڑھے ہوئے فرقوں اور فتنوں کے انسداد کے لیے بے چین رہتے، قادیانیت، بہائیت، اشتراکیت شیوعیۃ، ماڈرنزم، تجدد اور اباحیت کے خلاف رابطہ کے ذریعہ قرارداد پاس کروائیں اور دوسرے ذرائع سے بھی پوری دنیا میں ان فتنوں کا تعاقب کرتے رہے، کتاب و سنت اور ان سے متعلقہ علوم کی اشاعت اور ترویج پر خزانے کا ایک بڑا حصہ خرچ کرتے رہے۔ انہوں نے اپنے دورِ حکومت میں اپنی سلطنت، کی پسماندگی کو ترقی اور خوشحالی سے ایسا بدل دیا کہ باہر کے لوگ حیران رہ جاتے حجاج کرام کے لیے وہ تمام سہولتیں مہیا فرمائیں جو ممکن ہو سکتی تھیں اور حرمین الشریفین کی تعمیر و توسیع کیلئے جو کچھ کیا اس کا اندازہ لاکھوں زائرین و حجاج ہر سال خود لگا سکتے ہیں کہ اسلامی تاریخ میں اب تک اس کی مثال نہیں ملتی۔

یہ سب کچھ انہوں نے کیا مگر دوسرے فانی انسانوں کی طرح انہیں بھی رب کے بلاوے پر لبیک کہنا تھا۔ اور انہوں نے اجابتِ دعوت میں جامِ شہادت نوش کیا۔ اور اپنے پیچھے ذکرِ خیر اعلیٰ کردار اور صدقاتِ جاریہ کی ایک دنیا چھوڑ دی۔ مگر آج عالمِ عرب ایسے عالم میں انہیں ڈھونڈ رہا ہے۔ کہ اسرائیل اور مغربی سامراج کے خطرات سر پر منڈلا رہے ہیں۔ استبداد کا عفریت منہ کھولے ہوئے ہے۔ عالمِ اسلام ایسے عالم میں ان پر نوحہ کناں

ہے۔ کہ ان کا شیرازہ سمٹنے نہیں سمٹ رہا۔ علماء اور دینی مراکز اس عالم میں مرثیہ خواں ہیں کہ ابھی اس سلطانِ علم و دین کے عواطف علم و فضل کی بے حد ضرورت تھی۔ مگر وہ خادم الحرمین وہ زائد التضامن الاسلامی وہ جلالۃ الملک فیصل المعظم جو اس دورِ زوال و پستی میں مرکزِ مسلمین بننے کے سزاوار تھے، جن کیطرف غیر شعوری طور پر نظریں اٹھنے لگی تھیں جو کروڑوں مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن بننے جا رہے تھے، یکایک دنیا سے روپوش ہو گئے۔

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

اب یہ ان کے جانشینوں اور نجد و حجاز کے غیور اور بہادر بادیہ پیما عربوں کا کام ہے کہ شاہ مرحوم کے عظیم مقاصد عظیم ارادوں اور مقدس مشن کو ہر لحاظ سے جاری و ساری رکھیں اور اگر وہ ان کا مشن ان کا جذبہ ان کا درد و سوز اور ان کا مؤمنانہ کردار زندہ رکھ سکے تو شاہ مرحوم نہ صرف زندہ بلکہ زندہ جاوید ہوں گے۔

خلوص و ہمت اہلِ چمن پہ ہے موقوف
کہ شاخِ خشک میں پھر سے برگ و بار آئے

ربنا افرغ علینا صبرا و ثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکفرین۔

الحق
اپریل ۱۹۷۵ء

قیادت کا فقدان

نہ کوئی صلاح الدین ہے نہ شاہ فیصل

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت عالم اسلام کا ایک اہم مسئلہ قیادت اور شخصیت کا فقدان ہے۔ اور گیسوئے دجلہ و فرات کی تابداری کے باوجود قافلۂ حجاز میں ایک بھی حسینؓ نظر نہیں آرہا۔ مسلمانوں کا وہ قائد جس میں مومنانہ ایمان و یقین، تدبّر و بصیرت، معاملہ فہمی، اللہ پر توکل، اسلام پر فخر اور اسلامی حکمت و ذہانت جیسی چیزیں جمع ہوں۔ مسلمانوں کی نگاہیں مدتوں سے کسی ایسی شخصیت کیلئے ترس رہی ہیں۔ جو مسلمانوں کے مسائل پر غمزدہ ماؤں کی طرح روئے عالم اسلام اور اسلام کی سربلندی اس کا اوڑھنا بچھونا اور کلمۃ اللہ کی سربلندی اس کا مقصدِ حیات ہو۔ بیت المقدس کا پہلی مرتبہ مسلمانوں کے ہاتھوں نکل جانے پر مورخین لکھتے ہیں کہ صلاح الدین ایوبیؒ کی کیفیت ایک ایسی غمزدہ ماں کی سی تھی جس نے اکلوتے بیٹے کا داغ اٹھایا ہو، وہ جہاد کے دوران صفوں میں بھاگتے پھرتے اور مجاہدین کو ترغیب جہاد دے کر پکار اٹھتے یا للاسلام۔ یا للاسلام۔ اے لوگو! اسلام کی مدد کرو، اسلام کی خبرگیری کرو ـــ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ قاضی ابن شداد کہتے ہیں کہ سلطان کو بیت المقدس کی ایسی فکر دامن گیر تھی اور ان کے دل پر ایسا بار تھا کہ پہاڑ بھی اس کے متحمل نہیں تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی عظمتِ گم گشتہ کی بحالی تک خیموں ہی میں وقت گذارا۔ کھانے کے لئے بھی ڈاکٹر مجبور کرتے[1] اور آج

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی معرکۃ الآراء کتاب تاریخ دعوت و عزیمت جلد ۱

اسی بیت المقدس میں یہود دندنا رہے ہیں وہ مسجدِ اقصیٰ میں فاحشہ عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں منا مناکر اس کی تصاویر دنیا بھر میں پھیلاتے ہیں کہ مسلمانوں کے مردہ ضمیروں پر اور بھی کچھ کے رگا سکیں۔ مگر کروڑوں مسلمانوں کی اس بھیڑ میں کتنے ہیں جن کی آرام و راحت کی زندگی میں ادنیٰ سا تغیر بھی آیا ہو۔ ؟ کتنے حکمران ہیں جن کی پر عیش زندگی کو اس قیامت نے ذرا بھی مکدر کر دیا ہو۔

لے دے کر کچھ نظر اٹھتی تھی تو وہ حجاز و نجد کے مرحوم و مغفور حکمران خادم الحرمین شاہ فیصل کیطرف جو نہ تو سلطان صلاح الدین تھے۔ نہ عمر بن عبدالعزیز اور نہ بشری کمزوریوں سے معصوم، مگر اب جبکہ ان کے جانے کے بعد ان کی ایک ایک مؤمنانہ تصویر سامنے آرہی ہے تو اس واقعۂ شہادت کی شدتِ تاثیر اور گہری ہوتی جا رہی ہے وہ اپنے مومنانہ کردار، تدبر و بصیرت، معاملہ فہمی، اسلام پر فخر و مباہات اللہ پر توکل اور اسلامی سیاست و حکمت کے لحاظ سے اس دور زوال میں بھی اللہ کی ایک نعمتِ عظمیٰ تھے۔ بیت المقدس کا غم انہیں ہر دم پریشان کئے ہوئے تھا۔ شہادت سے قبل اپنے آخری انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ بیت المقدس کی بازیابی روئے زمین کے ہر مسلمان کے ذمہ ایک اہم امانت ہے۔ وہ کہتے تھے کہ بیت المقدس کافروں کے قبضہ میں ہو اور ہم آرام کریں۔ ؟ وہاں جاکر نماز پڑھنا ان کی آخری آرزو تھی۔ امریکہ کے عیار اور بے حیا کسنجر جسے شاہ فیصل بجا طور پر عالمی صیہونیت کا ایجنٹ سمجھتے تھے۔ جب مذاکراتِ امن کے سلسلہ میں مرحوم شاہ سے ملے اور مشرقِ وسطیٰ کے مسئلہ پر اپنے معرکوں کی تفصیل بیان کی اور کہا کہ اب میں نے پہاڑوں صحراؤں اور دریاؤں کا معاملہ درست کر لیا ہے تو مرحوم شاہ نے انتہائی تمکنت سے کہا: یہ سب ٹھیک ہے مگر بیت المقدس کا کیا بنے گا۔ ؟ کسنجر کی ساری عیاری اس ایک سوال سے خاک میں مل گئی اور پھر آخر تک وہ بت بنا بیٹھا رہا۔

شاہ مرحوم کو اسلام کے بارہ میں کوئی تذبذب نہیں ہوا۔ اور نہ کبھی ارتیابی کیفیت کا شکار ہونا پڑا وہ دشمنوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسلام کی بات کرتے۔ امریکہ کے ایک سفر میں کسی نے اسلام کے نظام حدود و تعزیرات پر اعتراض کیا۔ شاہؒ نے اپنے

ہاں کے دس سالہ جرائم کے اعداد و شمار پیش کر دئے جو امریکہ کے ایک دن کے جرائم سے بھی کم تھے۔ یورپ میں ایک دعوت میں گئے، ہال کا دروازہ چھوٹا تھا سر کو جھکا کر داخل ہونا پڑتا تھا۔ شاہ دروازہ پر جا کر رک گئے اور کہا میں تو معذور ہوں میرا قد دروازے سے زیادہ لمبا ہے۔ دشمن چھینپ گئے۔ دروازہ توڑا گیا تو شاہ اندر داخل ہوئے[1] اور قصہ یہ تھا کہ سامنے حضرت مریم کا مجسمہ آویزاں تھا۔ دشمنوں کے اس مقصد کا شاہ نے ساتھ نہ دیا کہ جو جائے تو تصویر کے سامنے ذرا جھک کر جائے۔ اور صدق لکھنؤ راوی ہے کہ ۲۶ء میں مولانا محمد علی جوہر حجاز گئے تو ان کی روایت تھی کہ یورپ سے دواؤں کا بہت سا ساز و سامان آیا۔ بکسوں پر صلیب احمر کا نشان بنا ہوا تھا۔ شاہؒ جو اس وقت بالکل جوان اور امیر حجاز تھے، انہوں نے محض صلیب کے نشانات کی وجہ سے سارا سامان واپس کر دیا۔ اور یہ اس وقت کا سعودی عرب نہ تھا کہ تیل اور سونے کی وجہ سے دولت کی فراوانی ہو۔ شاہؒ کے اس عزم و یقین اس ایمان و عزیمت میں عمر کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہوتا گیا اور جب یہ ہلال بدر بن گیا تو قضا و قدر نے مسلمانوں کے عمومی شامت اعمال کی وجہ سے پردۂ شہادت میں محجوب کر دیا۔ مگر مسلمان یاس و قنوط کا شکار نہیں ہوتا۔ اس کی تاریخ طلوع و غروب کی ہے[2] ادہر نکلے ایک ستارہ، غروب ہوا دوسرا طلوع گردش لیل و نہار کیطرح یہ امت بھی قیامت تک جاری و ساری رہے گی۔ ایک موج کی جگہ دوسری موج لیتی رہے گی۔ دعوت و عزیمت اور تجدید و جہاد کا یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا کہ ارشاد نبوی لا یبقی بیت وبر و لا مدر الا دخلہ اللہ اسلام (او کما قال) کا ظہور بدرجۂ اتم ہو جائے۔

(الحق: جون ۱۹۷۵ء)

---

[1] دربار جہانگیری اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کا واقعہ تو مشہور عوام و خواص ہے جس کی پاداش میں آپ کو قلعہ گوالیار میں قید کر لیا گیا۔ لیکن شاہ کے سامنے سجدۂ تعظیمی سے انکار فرمایا۔ مکتوبات شریف میں رقمطراز ہیں کہ جب شاہ کیطرف سے یہ حکم ہو تو رگ فاروقیم در حرکت آمد۔ یعنی مجھ میں فاروقی رگ بھڑک اٹھی۔ (مرتب)

[2] جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں — ادہر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے ادھر نکلے

چینی قوم کے لیڈر ◎ ماؤ

چینی اور مدنی انقلاب کا موازنہ

چینی قوم کے عظیم انقلابی لیڈر چیئرمین ماؤزے تنگ انتقال کر گئے کہ دنیا کے فانی انسانوں کی طرح انہیں بھی مرنا تھا، موت سے کسی کو مفر نہیں اور جس کے علاج نے دنیا بھر کے فلاسفہ، حکماء، طبیبوں اور انقلابیوں کو بے بس کر دیا ہے، کوئی اس "تلخ جام" کے "ساقی" سے ہزار بار آنکھ چراتا پھرے مگر وہ کائنات کی اس حقیقتِ کبریٰ کا جامِ تلخ پلا کے ہی چھوڑتا ہے۔ آگے کیا ہے؟ ایک دوسری کائنات، حیاتِ جاودانی، خلود، مکافاتِ اعمال کا ظہور اور ترتیبِ نتائج کا عالم — عالمِ آخرت — مگر یہ تو اُن لوگوں کی باتیں ہیں جن کی نظریں عالمِ آب و گل کی مادی کثافتوں تک محدود نہیں بلکہ اُس سے پرے عالمِ غیب کا مشاہدہ بھی کرتی ہیں۔ جہاں تک اس دنیا کا تعلق تھا، چیئرمین ماؤ اس میں ایسے انقلابی نقوش ثبت کر گئے جو واقعی ناقابلِ فراموش ہیں — اپنی قوم اور اپنے ملک کے لیے اُن کی زندگی ایک جہدِ مسلسل تھی۔ ضبط و نظم، حوصلہ، استقامت، قربانی اور ایثار کے لحاظ سے بجا طور پر وہ موجودہ چین کے معمارِ اوّل کہلانے کے مستحق ہیں۔ ایسی انقلابی شخصیتوں کا وجود اُن کی اپنی قوم کے لیے آئیڈیل کی حیثیت رکھتا ہے مگر مسلمان قوم کے سامنے تو انسانیت کی بھلائی کا ایک ایسا جامع اور ہمہ گیر انقلابی پروگرام موجود ہے جو وقتی نہیں دائمی ہے، علاقائی نہیں آفاقی ہے، قومی نہیں پوری نوعِ انسانیت سے وابستہ ہے اور جس کا رشتہ عالمِ انسانیت کی اُس سب سے بڑی انقلابی ذات، محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ مبارک سے وابستہ ہے، جن کے انقلابی کارناموں نے انسان کی نہ صرف دنیوی کایا پلٹ دی بلکہ اس کی لافانی زندگی بھی فلاح و نجاح سے ہمکنار کر دی، جن کا انقلابی لائحہ عمل نہ صرف مادی عروج و ترقی بلکہ عالمِ آخرت کی سرخروئی کا بھی

ضامن بن کر آیا۔ اور جو انسان کے صرف جسمانی دکھوں کا مداوا نہیں بلکہ روح کی تشنگیوں کے لیے بھی آبِ زلال ثابت ہوا اور جو صرف انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دینے والا نہیں بلکہ اُسے اپنے رب کی غلامی کی خوشگوار بندشوں سے بھی وابستہ کر دینے والا بنا، اور جن کا انقلابی پروگرام رہتی دنیا تک عالمِ انسانیت کی مشکلات حل کرنے کا ضامن بنا۔ اس رحمتِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے لیے اگر اُسوہ ہے تو فقط اُسی کی ذات، آئیڈیل ہے تو صرف اُنہی کی شخصیت ـــــ بے شک دیگر اقوام کے لیڈر بھی ان کے لیے محسن بنے، مگر ان کا احسان زندگی کے صرف اُس پہلو پر ہے جو ختم ہونے والی مادی اور فانی زندگی ہے۔ احسان بھی محدود اور محسن بھی فانی، جن کے ذریعہ ان کی اقوام کو ظالمانہ اور استحصالی بندشوں سے نجات تو ملی مگر نجات پا کر وہ ایک آہنی نظام کے شکنجے میں جکڑ دیئے گئے اور ایک ایسی مشین کا پُرزہ بنا دیئے گئے جس کی ہر حرکت اور سکون سٹیم اور برقی رو کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ یہ آزادی آزادی نہیں غلامی ہے۔

انقلابِ حقیقی تو یہ ہے کہ انسان کو انسانی بندھنوں سے نجات دے کر ربِ حقیقی کی بندگی سے باندھ دیا جائے، اگر یہ نہ ہوا تو انقلاب غلامی کے ایک دائرے سے دُوسرے دائرہ میں منتقل کر دینے والا تو بن جاتا ہے، مخلوق اور مادّی عناصر سے حقیقی معنوں میں آزادی دینے والا نہیں ہو سکتا۔

پھر اصل انقلاب تو وہ ہے جس کی بنیاد طبقاتی منافرت، عداوت اور دُشمنی پر نہیں بلکہ انسانوں کی انسانوں سے محبت، ہمدردی اور مواسات پر رکھی گئی ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو انقلاب انسان کو وقتی طور پر ایک عرصہ کے لیے کسی "سنہری جنّت" میں تو پہنچا دیتا ہے مگر عدل و انصاف، سکون و اطمینان، عزتِ نفس اور آزادی پر مبنی کوئی دائمی زندگی نہیں دے سکتا۔

چودہ سو برس قبل حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے علمِ انقلاب اُٹھایا اور پورے عالمِ انسانیت کی خاطر اعلانِ جنگ بھی فرمایا، پورے عہدِ جاہلیت کے خلاف خدا اور رسولؐ کے باغیوں اور اخلاق و شرافت کے دشمنوں کے خلاف یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے خلاف چوروں ڈاکوؤں

اور قزاقوں کے خلاف ایک ہمہ گیر جنگ لڑی، نتیجۃً پورا عالم انسانیت انسانی قدروں اور روحانی آسائشوں سے ہمکنار ہوا۔

مگر یہ سب کچھ نفرت و عداوت کے نام پر نہیں محبت اور انسانیت کے نام پر۔ دشمنوں[1] نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ اسے تلوار کی کرشمہ کاری ثابت کریں، مگر تاریخ کی سچائیوں نے ان کے منہ پر طمانچہ مار دیا کہ تاریخ کے اس سب سے بڑے انقلاب اور اس کے دس سالہ جدوجہد میں مسلمانوں اور مقابل حریفوں سب کو ملا کر انقلاب میں کام آنے والے شہیدوں اور مقتولوں کی تعداد ۶۰۰ سے زیادہ نہیں ہو سکی۔ اتنے انسان جو آج کسی بڑے شہر میں یومیہ ایکسیڈنٹوں اور حادثوں کی صورت میں لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔

دوسری طرف چین اور روس کا انقلاب کہ جس کا خمیر طبقاتی منافرت سے اٹھایا گیا تو بالکل ابتدائی ایام میں اس کی خاطر کروڑوں افراد قتل، جلاوطن، مجروح اور عمر بھر زندہ درگور ہوئے اور صرف چین میں ڈیڑھ کروڑ زمیندار پھانسی پر لٹکائے گئے۔ سٹالن[2] نے اس انقلاب کے لیے ۵ کروڑ تو صرف مسلمانوں کو قتل کیا یا بلاوطن کیا اور جس کی خاطر دین، مذہب، عقیدہ اور تمام اخلاقِ فاضلہ قربان کر دیئے گئے۔

چین کے عظیم انقلابی آنجہانی ماؤ نے کسی وقت مسلمانوں سے کہا تھا ـــــ کہ تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ تم اپنے اوقات نماز میں ضائع کرو، بلکہ غور سے

---

[1] مستشرقین یورپ نے اسلام کو بدنام اور اس کی ہمہ گیریت کو تاراج و داغدار کرنے کے لیے کتنے بے سروپا اور بے بنیاد الزامات لگائے۔ منجملہ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسلام بزورِ شمشیر اور طاقت کے بل بوتے پر پھیلا ہے اس میں کسی قسم کی اخلاقی کشش نہیں۔ اس سعیٔ نامسعود کے لیے انہوں نے کتنے صفحات سیاہ کیے، بہتوں نے زندگیاں گنوائیں۔ باوجودیکہ یہ لوگ رائی کو پہاڑ بنا کر پیش کرنے میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں لیکن اس عظیم تاریخی حقیقت کو جھٹلا نہ سکے کہ اسلام کی آفاقیت کردار و اخلاق سے ہے نہ کہ تلواروں کے طمطراق سے ـــ (مرتب)

[2] اس کی بیٹی سوتیلانہ نے باپ کی لادینیت و بربریت کی مکمل نقاب کشائی کی ہے۔ (مرتب)

سُنو تمہیں اپنی مساجد اور مدارس کو ڈھانا ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ ——— (چینی اخبار ٹن بات پاؤ ۲۲ نومبر ۱۹۶۷ء)[1]

بہر حال آج آنجہانی ماؤ کا معاملہ کائنات کے خالق کے سامنے ہے، انہوں نے مادی انقلاب سے قوم کو ہمکنار کر دیا۔ ہم اُن کی خوبیوں کی تحسین کرتے ہیں اور چینی قوم کے ساتھ اس غم میں شریک ہیں، مگر یہ اعلان کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ عالم انسانیت کے حقیقی خیر خواہ اور عظیم انقلابی صرف محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام تھے، ان کا انقلاب اَمَر اور غیر فانی ہے، نسخۂ فلاح صرف اسی کی تعلیمات ہیں، باقی سب فلسفے ہیچ اور ساری شخصیتیں فانی ہیں، اور جلد یا بدیر ساری بنی نوعِ انسانیت کو یہ ابدی صداقت تسلیم کرنی ہے۔

الحق

ستمبر ۱۹۷۶ء

---

[1] مُصنّف جب گذشتہ سالوں میں دورۂ چین پر گیا تھا، وہاں پر چین کی تاریخ میں پہلی مرتبہ چیئرمین ماؤ کی MUMY کے قریب بلکہ "کانوں" میں صدائے اذان و قد قامت الصلوٰۃ بلند کی تھی اور نماز باجماعت کا فریضہ انجام دیا تھا۔ اس "پُرشکوہ نماز" کی کیفیت خود مصنّف نے کس طرح محسوس کی ہوگی۔ (مرتب)

ذوالفقار علی بھٹو تختۂ دار پر

عجائب خانۂ عالم کا مرقعِ عبرت

عبرت سرائے دہر کا یہ کتنا واضح مرقعِ عبرت ہے جسے دستِ قدرت نے پاکستان کے سابق صدر سابق وزیر اعظم اور سابق چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کی شکل میں عجائب خانۂ عالم میں رکھوا دیا ہے۔ تاکہ یہ عبرتناک واقعہ، یہ بھیانک انجام اور یہ بطشِ شدید، مکافاتِ عمل سے غافل اور نتائجِ اعمال سے بے خبر انسانوں کے لئے عبرت و نصیحت کا ایک عظیم الشان سامان بن جائے۔ یہ واقعۂ ہائلہ عصرِ حاضر کی تاریخ کا ایک زوردار طمانچہ ہے خود فراموش اور خدا فراموش انسانوں کے منہ پر، غرور و نخوت سے سرشار متکبرین اور متجبرین کے لئے، عظمت و جبروت، قوت و اقتدار کے بلاشرکت غیرے مالک ربّ السمٰوٰت والارضین کی صفاتِ عظمت و کبریاء میں دست اندازی کرنے والے جھوٹے جبّار اور سرکش حکمرانوں کے لئے اور اُن تمام سیاسی قائدین اور زعماء کے لئے جو منافقت اور عیاری کا لبادہ اوڑھ کر سادہ لوح عوام کو اپنے حرص و ہوس کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔

جناب بھٹو کا وہ بے مثال عروج اور یہ بے مثال شرمناک اور اذیت ناک انجام فاعتبروا یا اولی الابصار ـــــ ایک ظالم و جابر انسان جو اپنے آپ کو ہر انسانی اور اخلاقی قدر و شرف، عدل و انصاف، ضمیر و احساس اور شرافت و نجابت کے ہر تقاضے سے بالاتر سمجھتا رہا، اور جو ملّت کے معنوی اور انسانی قدروں کے لئے معنوی موت کا پیام بر بنا رہا، اس کا تختۂ دار پر چڑھنے کا واقعہ اور اتنی ذلّت آمیز موت اگر آج ملّت کی ظاہری و معنوی حیات کا مژدہ سنا رہی ہے تو اس میں حیرت و تعجب کی کونسی بات ہے۔ ارشادِ ربّانی

ہے : ولکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب۔ اے عقل و بصیرت والو، قصاص اور پھر ایسا قصاص یہ تو تمہارے لئے پیغامِ حیات ہے، اگر قدرت کی گرفت نہ ہوتی اور کوئی ظالم اپنے انجامِ بد کا شکار نہ ہوتا تو کیا خدا کی یہ بستی ظلم و شر سے تہس نہس ہو کر نہ رہ جاتی اور کیا ایسا ہونا خدا کے شانِ عدل و رحم کے شایان ہوتا۔؟

پس بھٹو بھی قانونِ فطرت کے عین مطابق اپنی بوئی فصل کاٹ کر اور اپنے سوءِ عاقبت سے ہمکنار ہو کر موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے نکال و موعظت کا سامان بن چکا ہے۔ فجعلنٰھا نکالاً لما بین یدیھا و ما خلفھا و موعظۃً للمتقین۔ احتسابِ خداوندی بقدرِ نعمت و احسانات ہوا کرتی ہے، بھٹو کو خداوند تعالیٰ نے صلاحیت اور استعدادِ عمل کی وافر دولت عطا فرمائی، ذہانت و فطانت سے نوازا اور پھر ہر طرح کے وسائل و ذرائع سے لیس کر کے اُسے تمکّن و تصرّف کے عظیم الشان مواقع عطا فرما دیئے مگر جتنی نعمتیں بڑھتی گئیں اتنی ہی اس کی خدا فراموشی اور خود فراموشی، ناشکری اور حق ناشناسی کی تہیں سخت سے سخت تر ہوتی گئیں۔ اُس نے خدا کی دی ہوئی صلاحیتوں کو ظلم و فساد، فریب و نفاق، عیاری اور مکاری، جبر و استبداد کے فروغ کا ذریعہ بنا دیا۔ یہاں تک کہ وہ اہل ہوی و ہوس اور اصحابِ فسق و فجور کے لئے محبت کی نشانی اور عظمت کا آئیڈیل ہو گئے۔ ابلیسی قوتوں نے اُسے اپنا محافظ جانا اور وہ بالآخر گناہ کا سنبل بن کر رہ گئے۔ بھٹو کی یہی وہ امتیازی شان ہے جو آج بھی معاشرہ کے بگڑے ہوئے اور شر و بدی کے رسیا اور متوالے جرائم پیشہ طبقوں کے لئے ایک بت بنا ہوا ہے، عقیدت و محبت کے اس طلسمِ ہوشربا کا در پردہ اصل محرک درحقیقت انسان کا وہی جذبۂ نفسانی اور خواہشاتِ حیوانی ہیں جو اہلِ فسق و معصیّت کے لئے سامانِ ہلاکت بنے رہتے ہیں۔

بھٹو نے سیاست کے میدان میں بیشمار جرائم کئے وہ ملک کو دولخت کر گئے، مسلم قوم کا شیرازہ اتحاد بکھیر دیا۔ اسلامی، اخلاقی اور معنوی قدریں پائمال کر دیں، ہزاروں بے گناہ انسانوں کے قتل و تباہی کے مرتکب ہوئے اور یہ سب باتیں ایسے ننگِ ملّت ننگِ دین اور ننگِ وطن غداروں کی پھانسی کے لئے کافی ہوتی ہیں۔ مگر اُن کی پھانسی بھی ایسی

تمام باتوں سے نہیں، ایک بے گناہ انسان کے خون ناحق بہانے سے ہوتی اور صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے جس انداز میں اسلام کے نظام عدل و انصاف کے تمام تقاضوں کے عین مطابق اعلیٰ سے اعلیٰ عدالتوں میں طویل نقد و جرح، جانچ پرکھ اور مواقع صفائی فراہم کرنے کے بعد اور عدالتوں کے فیصلہ کے بعد سزا نافذ کرادی۔ شاید صدیوں کے بعد اسلام کے نظام عدل و انصاف کو اس طرح بے لاگ اور دوٹوک انداز میں نافذ کرنے کی اتنی روشن مثال سامنے آئی ہو۔ حقوق انسانیت کے علمبردار اور مظلوموں کی حمایت کے دعویدار عیار یورپ کو شور و واویلا کرنے کی بجائے تاریخ عدل و انصاف کے اس سنہرے اور روشن واقعہ پر تحسین و مرحبا کے نعرے بلند کرنے چاہیئے تھے مگر وہ جو اپنے کسی شاہی خاندان کے دور سے وابستہ کسی فرد کا معمولی جرمانہ ہو جانے پر اپنی جمہوریت اور عدل و انصاف کے شور سے قیامت برپا کر دیتے ہیں اور اپنے مقاصد ذلیلہ کیلئے ہزاروں لاکھوں انسان چشم زدن میں بھون ڈال دیتے ہیں اور خدا کی زمین کو آگ اور خون سے بھر دیتے ہیں وہ کب کسی اسلامی حکومت و معاشرہ کے اس عادلانہ اور جرائمندانہ کارنامہ پر حقیقت پسندی اور وسیع الظرفی کا مظاہرہ کر سکتے تھے۔ یہ اسلامی تاریخ تھی جہاں خلیفہ وقت ایک غریب اور بے بس انسان کے ساتھ اور ایک جابر و مطلق العنان امیر المومنین ایک قلی و پانڈی کے دعویٰ پر عدالت عالیہ میں ملزموں کے کٹہرے میں ایک ساتھ کھڑے ہو جاتے۔ اور آج یہ بھی اسلامی تاریخ ہی کا ایک شاندار باب ہے۔ کہ اقتدار و قوت کے اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب پر فائز ہونے والے کسی شخص کو قانون عدل و انصاف کے احترام میں تخت کی بجائے تختہ پر چڑھا دیا گیا۔ اور اس راہ میں ہر قسم کی ترغیب و ترہیب اور ہر بیرونی مطالبہ اور دباؤ کو نظر انداز کر دیا گیا۔ کہ جو قومیں اس راہ میں امیر و غریب، بڑے اور چھوٹے اپنے اور پرائے میں امتیاز کرنے لگتی ہیں، وہ بلاریب ہلاکت و زوال سے ہمکنار ہو جاتی ہیں۔ اقیموا حدود اللہ علی القریب والبعید۔ (الحدیث)

اب جب بھٹو اس دنیا میں نہیں رہے مگر ان کے پیدا کردہ فتنے اور آثار (افتراق و انتشار، جھوٹ و فریب، بحران اور غیر یقینی کیفیت، فوضویت اور اباحیت اور فرق

مراتب کی پائمالی ، اقدار انسانیت کی بربادی اور معلوم نہیں کیا کیا لعنتیں) وہ اپنے باقیات سئیات میں چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور جسے ہم " بھٹوازم " کا نام دے سکتے ہیں، بھٹو کے بعد اس " بھٹوازم " کو ختم کرنے کے لئے قوم کو ، زعماء کو ، معاشرہ کو اور بالخصوص برسر اقتدار طبقہ اور حکومت کو شدید تر محنت کرنی ہوگی ، عوام کے مسائل کے حل کے لئے بہت بڑے پیمانہ پر اقدامات کرنے ہوں گے ، اندرونی اضطراب اور بے چینی کو ختم کرنا ہوگا گناہ اور بدی کی شدت سے حوصلہ شکنی اور سرکوبی کرنی ہوگی ۔ غریبوں اور بے بسوں کو اسلام کے نظام عدل و اقتصاد اور اسلام کے شان رحمت و رأفت سے عملاً متعارف کرانا ہوگا کہ وہ اسے اپنے دکھوں کا مداوا سمجھ لیں اور انہیں یقین صادق اور ایمان محکم آجائے ۔ تب ہمیں بھٹوازم سے نجات ملے گی اور اگر ایسا نہ ہوا تو ظلمت وشر اور ظلم و بدی کا یہ لاوا کہیں نہ کہیں سے پھر اتنی شدّت سے پھوٹ پڑے گا ، کہ رہے سہے خیر و صلاح اور اصلاح کے نشانات بھی بھک سے اڑ جائیں گے ۔ ولا فعلها الله ۔

الحق

اپریل ۱۹۷۹ء

◎

بھٹو اور مکافاتِ عمل

تو منکرِ قانونِ مکافاتِ عمل تھا
لے دیکھ تیرا عرصۂ محشر بھی یہیں ہے

بالآخر لاہور ہائیکورٹ کے ایک فُل بنچ نے نواب محمد احمد خان مرحوم کے مقدمۂ قتل میں سابق وزیر اعظم پاکستان مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور قتل میں شریک چار دوسرے ملزموں کو سزائے موت کا حکم سُنا دیا۔ پچھلے سال مارچ کے یہی ایام تھے کہ ذوالفقار علی بھٹو کے سامنے کسی کی نہ چلتی تھی، اس کے ایک چشم و ابرو کے اشارے سے پاکستان کی گلیاں خونِ ناحق سے لالہ زار بنی ہوئی تھیں، ہر شخص لرزاں و ترساں، قید خانے و زندان مظلوم و مقہور انسانوں پر تنگ ہو گئے تھے۔ کتنے اہل اللہ اور صاحبِ دل پراگندہ حال مقربین بارگاہِ الٰہی تھے جن کے آہِ سحری اور نالہ ہائے نیم شب نے عرشِ بریں کو ہلا کر رکھ دیا، اور وہ جو اپنی کُرسی کو مظہرِ قدرت سمجھ بیٹھا تھا۔ مارچ کے انہی ایام میں فطرۃ اللہ کا ظہور ہوا اور آج "تختِ شاہی" پر متمکن وہ مغرور انسان دار و رسن کے لمحات سے گذر رہا ہے ——

سیاسی امور سے قطع نظر خالص مومنانہ نظر سے اگر اس واقعہ پر غور کیا جائے تو قوانینِ فطرت اور سُنّت کے کتنے ہی صدہا پہلو عبرت و موعظت کا سامان بنے ہوئے ہمیں دعوتِ فکر دے جاتیں۔ العظمۃ للہ — ظلم مٹنے والی چیز ہے، باطل کو قرار نہیں، حاکمِ حقیقی خدائے لم یزل ہے، عظمت و کبریا اسی کی سزاوار ہے۔ لمن الملک الیوم۔ للہ الواحد القھار۔ مظلوم انسانیت کی نجات کے لیے مظلوم اور بے کس رفقائے محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ظلم و ستم ڈھانے والے صنا دید قریش ابوجہل و ابولہب جیسے مغرورینِ دُنیا کے بارہ میں ارشاد ہوا: حتّٰی اذا اخذنا مترفیھم بالعذاب اذا ھم یجئرون لا تجئروا الیوم انکم منا لا

تنصرون۔ (یہاں تک کہ ہم جب پکڑلیں گے ان کے سرغنہ آسودہ حالوں کو آفت میں تب وہ چیخیں گے چلائیں گے اور کہہ دیا جائے گا کہ اب چیخنے چلانے سے کچھ نہیں بنے گا، اب ہماری گرفت سے چھوٹ نہیں سکتے) بیشک، انّ بطش ربّک لشدید۔ (تمہارے ربّ کی گرفت بہت مضبوط ہوتی ہے)

مجرم ذوالفقار علی بھٹو اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ گئے اور عدالتِ عظمیٰ نے اپنے مبنی بر انصاف فیصلے سے عدل وانصاف کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اسلام کے قانونی اور تعزیراتی پہلو میں مساوات کا یہی تصور تھا جس نے ہر قسم کے امتیازات اور خصوصی رعایات کو ختم کر کے رکھ دیا۔ صادق ومصدوق علیہ السلام نے فرمایا: اقیموا حدود اللہ علی القریب والبعید ولا تاخذکم بہما رافۃٌ فی دین اللہ۔ اپنے اور پرائے، حاکم ومحکوم، راعی اور رعیت ذی سلطنت اور ایک فقیرِ بے نوا اسلام کے قوانینِ عدل وانصاف کی نگاہ میں برابر ہیں۔ ایسا نہ ہو تو ظلم کو روکنے والا کوئی نہ رہے گا اور خدائے بزرگ و برتر کی دنیا ظلم و بربریت سے بھر جائے۔ یہی راہ نجات ہے اور اسی میں قوموں کی زندگی ہے، ولکم فی القصاص حیوٰۃٌ یا اولی الالباب (اے لوگو قصاص میں تمہاری زندگی ہے)[1]

الحق

مارچ ۱۹۷۸ء

---
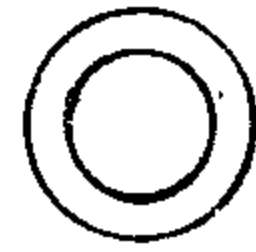
[1] سابق وزیرِاعظم پاکستان مسٹر بھٹو کے پھانسی لگنے سے قبل اُستاذِ محترم نے جو فکرانگیز شذرے قلمبند کیے تھے، مقام کی مناسبت سے پیشِ خدمت ہیں۔ (مرتب)

پابہ زنجیر بھٹو

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو قتل کے ایک کیس میں اس وقت پابہ جولاں ہیں، اور دیگر کئی مقدمات میں بھی عدالتیں انہیں بلا رہی ہیں۔ ایک صلائے عام کی کیفیت ہے۔ وہ شخص جو اپنی رعونتِ طنطنہ اور آمریت کے گھمنڈ میں کوس لمن الملک بجا رہا تھا۔ آج اس کا وجود تماشائے عالم بن کر درسِ عبرت دے رہا ہے۔ قدرت کے قوانینِ احتساب کتنے اٹل ہوتے ہیں۔ دیر بھی ہوتی ہے تو حکمتوں کی بناء پر اور استدراج کی تکمیل کے بعد مکافات کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ۔ آج وہی بھٹو ہیں اور اس کے انصار و اعوان، مگر تاریخ کا بے درد ردِ عمل شروع ہو چکا ہے۔ اخبارات و جرائد کا ہر صفحہ ان کے شرمناک، ظالمانہ اور عیاشانہ کردار کے وہ وہ مناظر دُنیا کے سامنے لا رہا ہے کہ شرافت سر پیٹ کر رہ گئی ہے۔ حقائق سامنے ہیں اور اسرار ظواہر بن گئے ہیں۔ قیامت سے پہلے بھی اس عالم میں ایک قیامت کا انکار کیونکر کیا جا سکتا۔ یوم تبلی السرائر فماله من قوة ولا ناصر ـــ اس روز سارے بھید اور خفیہ اعمال کھل کھل کر سامنے آئیں گے۔ پھر نہ تو انکے پاس اس کی مزاحمت کے لیے قوت ہوگی اور نہ کوئی مددگار ہوگا۔

اعمال و کردار کے ان سیاہ اعمالناموں کو دیکھ دیکھ کر مسٹر بھٹو اور ان کے وزراء و اعیان قیامت سے پہلے آج چیخ رہے ہیں کہ ما لھٰذا الکتٰب لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا۔ ارے ان فائلوں میں تو ہمارا ہر چھوٹا بڑا گناہ موجود ہے، گھر کے بھیدی گواہ بن گئے ہیں اور جرائم کے فردِ پر فرد عائد ہوتے جا رہے ہیں ـــ ابھی چند ماہ قبل کیا ظلم و فساد تھا، کیا رعونت تھی، کیا طنطنہ اور فرعونیت تھی، وہ سب کچھ کہاں گیا؟ آیئے! قوانینِ عروج و زوال کی ابدی صداقتوں کی امین ـــ الکتاب الکریم ـــ میں سے اس کا جواب سن لیں ـــ کم ترکوا من جنّٰتٍ وعیونٍ ° وزروعٍ ومقامٍ کریمٍ ° ونعمةٍ کانوا فیها فٰکهین ° کذٰلک واورثنٰها قومًا اٰخرین °

فما بکت علیھم السماء والارض وما کانوا منظرین ہ ولقد نجّینا بنی اسرائیل من العذاب المھین ہ من فرعون انہٗ کان عالیًا من المسرفین ہ (الدخان) "یہ لوگ کتنے ہی باغات، نہریں، کھیتیاں اور عمدہ عمدہ مکانات، عزت و وجاہت کے مناصب اور محافل اور کتنے ہی عیش و عشرت کے سامان چھوڑ بیٹھے جن میں مزے اڑایا کرتے تھے اور جب ہم نے دوسروں کو اس ساز و سامان کا وارث بنا دیا تو نہ تو پھر آسمان رویا نہ زمین (نہ ہمالیہ نے خون کے آنسو بہائے نہ خیبر سے کراچی تک کوئی آنسو بہا) اور نہ انہیں مہلت ملی، اور ہم نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ذلت ناک عذاب سے نجات دی، واقعی وہ بڑا سرکش اور حد سے باہر نکل گیا تھا" ـــ ان فی ذلك لعبرۃً لمن یخشٰی ـــ۔

الحق

ستمبر ۱۹۷۷ء

شاہِ ایران

تختِ طاؤس کے وارث اور کیخسرو و کیقباد کے مسند نشین شاہِ ایران رضا شاہ پہلوی دردر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد بالآخر آغوشِ موت سے ہمکنار ہو گئے۔ اور اس حال میں کہ سائرس اعظم کورش کبیر کے شکستہ استخوانوں پر اپنی عظمتوں کی عمارت تعمیر کرنے والے خود سر انسان کو سلطنتِ فارس میں دو گز زمین بھی نہ ملی جہاں وہ دفن ہو کر کسی ہم وطن کے فاتحہ پڑھنے کے سزاوار ہو جاتے۔ کبر و نخوت اور رعونت سے اٹھائی گئی خاک کو اپنے اندر جذب بھی کیا تو فراعنہ کی سرزمین نے کہ جاہلیت[1] اولیٰ کے احیاء کرنے والے شخص کو مناسبت تھی تو فراعنہ مصر ہی سے۔ یہ انجام، یہ ذلت و خواری، یہ جلا وطنی اور یہ جھلستے ہوئے، جلتے ہوئے آخری لمحاتِ حیات، یہ درد و کرب، یہ رسوائی اور یہ سُوءِ عاقبت ہر اُس متکبر و جبار کے مقدر میں ہے جس کے کاسۂ سر میں خاکساری اور فروتنی کی جگہ خدائی اور کبریائی کا بھوت ٹھکانہ بنا لے۔ انسانیت کو معراج تک پہنچانے والے آخری رسول علیہ السلام نے قیصریت و کسرویت کے بارہ میں اسی انجامِ بد کی خبر دی تھی[2] ھلك قیصر فلا قیصر بعدہ ــ ھلك کسریٰ فلا کسریٰ بعدہ ــ وہ جو شہنشاہ کہلاتا تھا اس کے انجام کے یہ سارے مراحل ملک الملک ربِ کائنات، مالکِ حقیقی کی حقیقی شہنشاہیت اور ملکوتیت کے اعتراف و اقرار کی دعوت بن گئے۔

---

[1] جشنِ نوروز کے نام پر ہر سال شاہی جشن منایا جا رہا تھا۔ الحمد للہ اس جشن یعنی احیاءِ جاہلیتِ اولیٰ کے خلاف سب سے پہلے ایڈیٹر الحق نے آواز بلند کی تھی اور نقشِ آغاز میں اس پر ایسا زوردار اداریہ قلمبند کیا۔ جس کی ہر طرف سے پذیرائی ہوئی اور اربابِ نظر نے اس کو بنظرِ استحسان دیکھا۔ (مرتب)

[2] یعنی قیصر (شاہِ روم) و کسریٰ (شاہِ فارس) ہلاک ہوئے، ان کے بعد نہ کوئی قیصر آئے گا اور نہ کسریٰ۔ (م)

کسمپرسی میں پردیس میں اٹھنے والا جنازہ جس نے بھی دیکھا اُس کی زبان پر بلا اختیار اللہ اکبر لا الٰہ الّا اللہ واللہ اکبر اور العظمۃ للہ کا ورد جاری ہوا۔ کتنا ظلوم وجہول ہے وہ انسان جو چند روزہ اقتدار واختیار کے سراب میں اتنا بھٹک جائے کہ خود فراموشی میں خدا کو بھی فراموش کر دے۔ وما قدروا اللہ حق قدرہ والارض جمیعاً قبضتہ یوم القیٰمۃ والسمٰوٰت مطویٰت بیمینہ۔ قیامت تو قیامت ہے اِس دُنیائے فانی میں زمین و آسمان کی طنابوں پر اسی کی حکمرانی اور جہانبانی کے یہ مظاہر کیا اس اعلانِ حقیقت کیلئے کافی نہیں کہ:۔

"یا اللہ تو مٰلک الملک ہے جس کو چاہے چند روز اختیار دے دے
اور جس سے چاہے سب کچھ چھین لے جسے چاہے معزز کر دے اور جسے چاہے
ذلت ونکبت کی اتھاہ گھاٹیوں میں پھینک دے۔ ہر خیر اور بھلائی تیرے ہی
ہاتھ میں ہے بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے"

ساسانیوں کی سرزمین کا وارث سکندر ودارا کے نقوشِ جاہلیت کو اجاگر کرنے والا رضا شاہ خسرو پرویز[1] ہی کے انجام سے دوچار ہوا۔ اور ہر متکبر وجبار خدا فراموش حکمرانِ فانی کو سامانِ صدہزار عبرت وموعظمت دے گیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار[2]

الحق ـــــ جولائی ۱۹۸۰ء

---

[1] جس کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشگوئی فرمائی تھی اور وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔

[2] اس سے پہلے "شاہِ ایران کا زوال" کے زیرِ عنوان مدیرِ شہیر نے جو اداریہ لکھا تھا اور جس میں مولانا محترم نے شاہ کے اس بدترین انجام کی طرف اشارہ کیا تھا، مناسب ہے کہ اس اداریہ کے پس منظر میں یہ پیش منظر ملاحظہ ہو۔ (مرتب) ـــــ معزول شاہِ ایران جو بزعم خود شاہوں کا شاہ کہلاتا تھا، اب خدا کی یہ وسیع کائنات اس پر اپنا عرصۂ حیات اتنا تنگ کر چکی ہے کہ ملک ملک اور دیس دیس کے راندۂ درگاہ ہوتے ہوتے اُسے پناہ بھی مل رہی ہے تو خدا کے نزدیک ذلیل اور مغضوب ومقہور قوم یہود کے دامن میں کہ انہیں شاید مسلمانوں میں اپنے صیہونی مقاصد کا آلہ کار اور ایجنٹ اگر ملا تھا تو شاہِ ایران۔ اب اسکی خدمت کا صلہ دینے کا وقت آیا تو عظیم باپ امریکہ نے بھی دغا دیدیا مگر اسکے ناجائز بچے اسرائیل نے بڑھ کر دامنِ شفقت پھیلا دیا اور عنقریب خبر آئے گی کہ ع

ع پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا (جولائی ۱۹۷۹ء)

شاہِ ایران

ھلك كسرىٰ فلا كسرىٰ بعدهٗ (الحدیث)

چرخِ کہن اور فلکِ نیلگون نے کم ہی عبرت و موعظت کا ایسا کھلا اور واضح منظر دیکھا ہو گا جو ایران کے انقلاب اور شاہِ ایران کی جلاوطنی کی صورت میں سامنے آیا، قدرت کے قانونِ احتساب کی اس شدت و سنگینی کے ہر آمر او رمغرور شخص کی طرح شاہِ ایران کو سان و گمان بھی نہ تھا، وہ اپنی سلطنت کو غیر فانی اور امر سمجھ بیٹھا تھا، اور جب کچھ عرصہ قبل اس نے عہدِ جاہلیت کی بنیادوں پر اپنی عجمی شہنشاہیت کا اڑھائی ہزار سالہ محل تعمیر کرنا چاہا اور جشن کے نام پر تجدیدِ جاہلیت کا ایک طوفان کھڑا کر دیا تو ہم نے اپنے صادق و مصدوق نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد ھلك كسرىٰ فلا كسرىٰ بعدهٗ۔ کی روشنی میں اس کی شرمناک تباہی کا خدشہ ظاہر کیا اور آج دنیا نے دیکھا کہ جو اس صدی میں کسرویت کی نشاۃ ثانیہ کا علمبردار بن رہا تھا۔ فارس کا وہ کسریٰ ایک بار ہلاک ہوا، اس لیے کہ کسرویت کیلئے فنا ہے، قیصریت کو اسلام نے ہمیشہ کے لیے پیوندِ خاک کر دیا ہے وہ جو گورِ ش کبیر کی طرح اربوں روپے سے اپنا دیو ہیکل قبرستان کھڑا کرنے کی فکر میں اُسے اپنی سرزمین میں سر چھپانے کی جگہ نہیں مل رہی اور وہ دنیا میں مارا مارا پھر رہا ہے اور جسے نظر اٹھا کر دیکھنے کی جرأتِ گستاخانہ پر آنکھیں پھوڑی جا سکتی تھیں، آج اس کے مجسمے بھی سڑکوں پر روندے جا رہے ہیں۔ العظمۃ لِلّٰہ۔ انّ فی ذٰلک لعبرۃً لمن یخشٰی۔ بیشک اس میں ڈرنے والوں کے لیے عبرت کا ایک بڑا سامان ہے۔ جب گرفت و احتساب کی تلوار نیام سے باہر آتی ہے تو کفر و ضلال کے بڑے سے بڑے حلیف اور امریکہ اور روس جیسی ساری قوتیں مجبور و بے بس بن کر رہ جاتی ہیں اور وہ بے آواز لاٹھی جب بولنے لگتی ہے تو آسمان و زمین تھرا اُٹھتے ہیں۔

چودھویں صدی کی اس عظیم ملوکیت اور شہنشاہیت کی تباہی مقدر تھی تو اس طبقہ کے ہاتھوں جسے

رجعت پسند اور ملّا نے کہہ کہہ کر معاشرہ کا پست ترین اور زار و نحیف ٹولہ قرار دے دیا گیا تھا، گو بارگاہِ خداوندی میں عزت و عظمت صرف اسی کے نام کے متوالوں اور اُسی کے دین کے شیدائیوں کیلئے مخصوص ہے کہ وللہ العزۃ ولرسولہٖ وللمومنین۔ مگر اپنے زعم باطل اور جھوٹے ترقی پسندی کے گھمنڈ میں مغرور انسانوں کا یہ خدا فراموش مغرب زدہ ٹولہ جن لوگوں کو ازکار رفتہ سمجھ بیٹھا ہے چودھویں صدی کی ڈھلتی ہوئی شام انہی غرباء اسلام کو خلعتِ کامرانی و سرخروئی سے سرفراز کر کے رخصت ہونا چاہتی ہے، اور وہ جو حالات کے ہاتھوں ابابیل کی طرح لاچار و کمزور بنا دیئے گئے تھے، ان ابابیلوں کے ذریعہ جاہلیت عصر حاضر کے عفریت پاش پاش کیے جا رہے ہیں کہ یہ لوگ اُس ذات قدسی صفات نبی الرحمۃ علیہ الصلوٰۃ والتحیۃ کے نام لیوا ہیں کہ جس کی آمد پر ایوانِ کسریٰ میں زلزلہ آ گیا تھا اور طاقِ کسریٰ کے چودہ کنگرے پیوستِ خاک ہو گئے تھے۔ شام کے آتشکدوں کی آگ بجھ گئی تھی اور سماوہ کی ندی سوکھ گئی۔ اُس نبی الرحمۃ کی اُمت نے جب بھی اُس کے دین، اُس کی شریعت، اس کے دستور العمل کا نام لیا تو فتح و کامرانی قدم چومنے لگی۔ ایرانی عوام نے شہنشاہیت کے مذہب بیزار طریقوں کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا ہی تھا کہ چودہ سو سال بعد ایک بار پھر ایوانِ کسریٰ کے چودہ کنگرے زمین بوس ہو گئے اور تختِ طاؤس خاک میں مل گئے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

فتوحات کا اسلامی سیلاب جب چودہ سو سال قبل خسرو پرویز کسریٰ فارس کی طرف بڑھنے لگا، تو اُس وقت کے چیف جسٹس نے خواب دیکھا کہ مضبوط اور تنومند اونٹ اور اونٹوں کے پیچھے عربی گھوڑے دجلہ کو عبور کر کے بلادِ عجم میں پھیل گئے ہیں۔ اس خواب کی تعبیر صدیوں تک مجسّم بن کر خدا فراموش اقوام کو دعوتِ فکر و موعظت دیتی رہی اور اب جبکہ فارس اپنی کسریٰ ریت کی طرف پلٹنے لگ گیا تھا تو ابرہہ کو خود اس کے اونٹوں نے روند ڈالا۔

پچھلے دو چار برسوں میں اس مختصر سے اقلیم ارضی یعنی تختۂ برّ اعظم ہند و پاک اور افغانستان و ایران میں انقلابات جہاں کا کتنا واضح مگر بھیانک سلسلۂ عبرت و نصیحت ہے جو شب ہائے ہجر یار کی مانند ختم ہی نہیں ہوتے پار ہا کہ جب غفلت کی تہیں آہنی فولاد کی مانند دلوں پر جم جائیں تو قدرت تنبیہہ اور احتساب کے تیشوں کو بھی تیز سے تیز تر کر دیتی ہے۔ بھارت کا نہرو خاندان یکایک اُجڑ

گیا، جو رانی اپنے بیٹے کو راجہ بنانے کا سوچ رہی تھی وہ شرمناک رُسوائی کے ساتھ راتوں رات کوچۂ اقتدار سے نکال دی گئی، اسی اقلیم کا ایک طالع آزما شیخ مجیب الرحمٰن قانونِ مکافات کے شکنجہ میں آیا تو کوئی آنکھ آنسو بہانے والی نہ تھی اور پھر ٹریڈ یونین کے چیمپین ذوالفقار علی بھٹو جس نے خدا کی اس سرزمینِ پاک کو اپنے ظلم و فساد اور غرور و تکبر سے بھر دیا تو کاسۂ صبر لبریز ہو گیا، زمین اُس پر چاروں طرف سے تنگ کر دی گئی اور آج وہ ایک کال کوٹھڑی میں اپنے طبعی شرمناک و عبرتناک انجام تک پہنچنے کی گھڑیاں گن رہا ہے اور رب کے بطشِ شدید کی تکمیل ہوا چاہتی ہے۔ افغان شہنشاہیت کا غاصب سردار داؤد خان جو اپنے ہی عزیز و اقارب کے کھنڈرات پر تختِ شاہانہ بچھائے ہوئے تھا راتوں رات کیسے بھیانک انجام سے دوچار ہوا، بعینہٖ مغلیہ شہنشاہوں کی طرح اس کے سامنے اس کے لختِ جگر بیٹے بیٹیاں اور خاندان کے دیگر افراد چُن چُن کر بھون ڈالے گئے۔ اور پھر اب باری آئی ایران کی کہ وہ باجبروت شہنشاہِ ایران جو صرف اپنی قلمرو پر قانع نہیں رہ سکا تھا اور آس پڑوس کا بھی داروغہ بن بیٹھا تھا جو عالمی صیہونی اور سامراجی مفادات کا محافظ بنا ہوا تھا، اور جو کبر و نخوت کے ہاتھوں یا مغربی وابستگیوں سے مجبور ہو کر کسی عظیم عالمی اسلامی سربراہ کانفرنس میں شرکت بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ آج قدرت نے عرصۂ حیات اس پر تنگ کر دیا ہے، وہ دیس دیس جا کر پناہ مانگتا ہے، مگر اور تو کیا اُس کا اپنا ولی رحمت امریکہ بھی اپنی فطری عیاری اور فریب کاری، بدعہدی اور بیحیائی کے عین مطابق اُسے اپنی ریاستہائے متحدہ میں دو چار مرلے زمین دینے پر تیار نہیں۔

عاد و ثمود کی داستانہائے عروج و زوال میں سامانِ نصیحت ڈھونڈنے والو! اپنے گرد و پیش کے ایسے واضح قریبی اور عظیم واقعات سے سبق لو کہ ان میں سے ہر ایک پکار پکار کر ہمیں دعوتِ نظارہ اور درسِ عبرت دے رہا ہے ؎

انقلاباتِ جہاں واعظِ رب ہیں سن لو ہر تغیّر سے صدا آتی ہے فافہم فافہم

(حضرت شیخ الہندؒ)

الحق، مارچ ۱۹۷۹ء

◎

چوہدری ظفر اللہ قادیانی

چوہدری[1] ظفر اللہ قادیانی آنجہانی کا بھی آخر کار اجل موعود آپہنچا۔ اسے المیہ کہیئے یا دینی بے حسی یا ضرورت سے زیادہ جذبۂ رواداری کا مظاہرہ کہ صدرِ مملکت، وزیر اعظم، کابینہ، وکلاء، سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں، وفاقی محتسب اور سیاسی لیڈروں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر چوہدری صاحب کی وفات پر تعزیتی پیغامات بھیجے اور نشر کرائے، پسماندگان سے ہمدردی کا اظہار کیا اور چوہدری صاحب کے "کردار" کو خراجِ تحسین پیش کیا، اور بعض ذمہ دار حضرات نے تو اس میں بڑی جرأت اور بے باکی سے شرعی حدود کا بھی تجاوز کیا کہ ایک کافر اور مرتد کی روح کی ٹھنڈک کی دعائیں بھی کیں جس کا حق حضرت ابراہیمؑ

---

[1] سر ظفر اللہ کے بارے میں میاں افتخار الدین نے ۱۹۵۰ء میں آئین ساز اسمبلی میں اپنی تقریر کے دوران کہا تھا "سر ظفر اللہ ایک قابل وکیل ہو سکتا ہے جس کا ۳۰ سالہ تجربہ ہے، اور جو برطانوی راج کا مداح رہا ہے۔ برطانیہ کا اس قدر وفادار جتنا خود شہنشاہ بھی نہ ہو۔ اس نے تیس سال کے عرصہ میں ایک بار بھی آزادی کا مطالبہ نہیں کیا۔ اس نے تمام عمر برطانیہ کی مدد کی۔ یہ شخص روپیہ حاصل کر کے بہاولپور اور بھوپال کے لیے بول سکتا ہے، حتیٰ کہ حکومتِ ہند کے حق میں بھی بول سکتا ہے، یہ شخص ہندوستان کے سیاسی نمائندے کے طور پر جا کر بول سکتا ہے، اگر اس کو معاوضہ دیا جائے جس طرح کہ روپیہ لے کر اس نے چین کے ساتھ (برطانوی دور) میں کیا۔ اس طرح یہ پاکستانی حکومت سے پیسہ لے کر کام کر رہا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو خدانخواستہ متحدہ ہندوستانی حکومت بن جائے تو اس کا موقف بھی پیسہ لے کر پیش کر سکتا ہے ...... یہ شخص آزادی کی تڑپ کو کیسے محسوس کر سکتا ہے"۔ (الحق) (مرتب)

جیسے جلیل القدر نبی کو بھی خدا نے نہیں دیا کہ وہ اپنے کافر والد کی مغفرت کی دعا کر سکیں۔ حقیقت تب سامنے آئے گی جب فرشتے نامۂ اعمال بارگاہِ ربوبیت میں پیش کر دیں گے۔

چوہدری ظفر اللہ خان بہت کچھ ہوں گے مگر سب سے بڑھ کر یہ کہ نہ صرف مرزائی بلکہ مرزا غلام احمد قادیانی کے پکے مبلغ اور وفادار ساتھی تھے۔ انھوں نے اپنی تمام صلاحیتوں اور کوششوں کو اس "قادیانیت" کے پھیلانے میں خرچ کیا جس کو صدرِ پاکستان اپنے حالیہ ایک پیغام میں پورے عالمِ اسلام کے لیے سرطان قرار دے چکے ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے خلفاء و رفقاء مرزا بشیر الدین اور چوہدری ظفر اللہ وغیرہ کا مذہبی، سیاسی، ملکی اور قومی کردار جو کچھ بھی تھا انگریزوں کی ایماء پر تھا۔ یہ لوگ انگریزی سرکار کے مُہرے اور گماشتے بنے رہے۔ قادیانیت کا وجود ہی برطانوی سرکار کا مرہونِ منت ہے۔ انگریزوں نے اس جماعت کو اپنے استعماری مقاصد کے لیے جنم دیا، پروان چڑھایا۔

ہمیں حیرت ہے کہ وفات کے بعد چوہدری ظفر اللہ کو محبِّ وطن قوم پرست اور ملّت کا خیر خواہ باور کرانے کی کوشش کی گئی، حالانکہ مرزائیوں نے مسلمانوں کی کسی بھی ابتلاء میں شرکت نہیں کی، ان کے لیے "دنیائے اسلام" کا وجود "دائرہ اسلام" سے خارج رہا۔ ملک کے اندر اور باہر ہمیشہ انگریزی حکومت کے آلۂ کار ثابت ہوئے۔ جنگِ عظیم میں عربوں اور ترکوں میں جا کر برطانوی استعمار کی جاسوسی کرتے رہے۔ مرزائیت کی پوری تاریخ پڑھ ڈالیے ہمیشہ ان کا وظیفۂ نبوت اور وظیفۂ خلافت انگریزوں کی خدمت گذاری رہا اور اس بساط کا سب سے بڑا اور اہم مُہرہ یہی ظفر اللہ خان تھے۔

تعزیتی پیغامات میں چوہدری ظفر اللہ کو مسئلہ کشمیر اور ۱۹۶۵ء کی جنگ کا ہیرو بنانے کی کوشش کی گئی، حالانکہ مسئلہ کشمیر میں چوہدری صاحب کا کردار ملک کے لیے کم اور قادیانیت کے لیے زیادہ تھا۔

اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ چوہدری ظفر اللہ اور تمام مرزائی امت انگریزی استعمار کی داشتہ رہی۔ مرزائی امت نے اپنے نبی کی آڑ میں اور چوہدری ظفر اللہ نے پاکستان کی نمائندگی کی آڑ میں انگریزوں کے مقاصد اور پشتیبانی کا فرض ادا کیا۔ تقسیم پنجاب میں

چوہدری ظفر اللہ کا ملک دشمن کردار تاریخ کے بے رحم ہاتھوں سے چھپ نہیں سکا اور پاک بھارت جنگوں میں اس طائفہ کی غدارانہ چالوں سے اب تو بڑے بڑے فوجی ماہرین بھی پردہ اٹھا رہے ہیں۔

بہر حال اب چوہدری صاحب وہاں ہیں جہاں سب کو جانا ہے، مگر دینی و ملی تشخص سے سرشار قومیں دوست اور دشمن کی تمیز ہر حال میں ضروری سمجھتی ہیں، مگر یہاں تو یار لوگوں نے اظہارِ تعزیت میں فراخدلی اور وسیع الظرفی کے وہ وہ مظاہرے کیے کہ عقل و خرد اور تدبیر و دانش سر پیٹ کر رہ گئے۔ اور سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ ہم دینی قدروں سے عاری اور غیرتِ ملی سے تہی دست کسی قوم کے فرد ہیں یا اسلامی اقدار و حدود اور تعلیمات سے تہی دامن جاہل قوم یا پھر منافق اور یا پھر اتنے وسیع الظرف اور روشن خیال و فراخدل کہ جس کی وسعتوں میں ایمان و علم اور غیرت و حمیّت کی ہر ہر نشانی ڈوب کر رہ گئی۔[1]

الحق ــــــ اگست ۱۹۸۵ء

---

[1] تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو سر ظفر اللہ کی خودنوشت "تحدیثِ نعمت" اور "تاریخِ احمدیت"۔ (مرتب)

جنرل محمد ضیاء الحق

صدرِ پاکستان

۱۷؍اگست ۱۹۸۸ء کو بہاولپور کے قریب ایک ہوائی حادثہ میں صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق بمع چند سرکردہ فوجی جرنیلوں اور بریگیڈیروں کے جاں بحق ہوئے۔ مولانا سمیع الحق صاحب نے اس عظیم قومی سانحہ پر اگرچہ تعزیتی شذرہ قلمبند نہیں فرمایا، لیکن سینیٹ آف پاکستان کے ۱۸؍اگست کی صبح کے اجلاس میں جو تعزیتی خطاب فرمایا تھا وہی تقریر شاملِ اشاعت ہے۔ (قانی)

مولانا سمیع الحق

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝

جناب چیئرمین صاحب! موت ایک اٹل حقیقت ہے جس سے کسی کو مفر نہیں لیکن کسی کی موت پورے ملک کے لیے ایک المیہ بن جاتی ہے، بیشک ہم ایک قومی المیہ سے دوچار ہوئے ہیں۔ صدر ضیاء الحق مرحوم میں سمجھتا ہوں وہ خوش قسمت تھے عملاً ایک جہاد کی صورت میں انہیں شہادت نصیب ہوئی کیونکہ وہ فوجی مشقوں کو دیکھنے گئے تھے۔ گویا ایک اسلامی سلطنت کی سرحدات کی نگرانی کے مشن پر تھے جسے حدیث میں رباط کہا گیا ہے یعنی اسلامی مملکت کی سرحدات کی نگرانی اور اس کے لیے حفاظتی تدابیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بڑے فضائل بیان کیے ہیں۔

ایک رات کی رباط ستر سال کی لیلۃ القدر سے بھی بڑھ کر ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ان کو تو اللہ نے شہادت کا مقام دے دیا۔

بہرحال المیہ قوم کا ہے۔ ہمارے ہاں بلکہ پورے عالم اسلام میں بدقسمتی سے قیادت کا فقدان ہے، عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ اس وقت قیادت کی کمی ہے اللہ تعالیٰ اس قوم کو بھی جو اس خلاء سے دوچار ہوئی ہے اس صدمے کو سہنے اور اس آزمائش سے سرخرو ہو کر نکلنے کی توفیق دے۔

اس وقت عظیم مسئلہ افغانستان کا تھا صدر صاحب سے ہزار اختلافات کے باوجود اس مسئلے میں ہمیں ان سے مکمل اتفاق تھا کہ صدر صاحب کا موقف حق پر ہے۔ انہوں نے اسلام کے جرنیلوں کی تاریخ میں جہاد افغانستان کی شکل میں ایک عظیم سنہری باب کا اضافہ کیا ہے۔ ان کی کوششیں اور مجاہدین کی قربانیاں کامیابی سے ہمکنار ہونے والی تھیں کہ ایسی حالت میں یہ صدمہ آیا اس مسئلے میں حکومت کو پوری توجہ اسی مشن پر مبذول رکھنی چاہیئے جو صدر ضیاء الحق نے شروع کرایا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی پالیسی جو افغان مسئلے میں صدر صاحب مرحوم نے اختیار کی تھی اسی پالیسی اور اسی مشن کو حکومت کو سامنے رکھنا چاہیئے اگر عالمی سازشیں خدانخواستہ اس شکل میں اس کامیابی کو خطرات سے ہمکنار کرنا چاہتی ہیں اور اس حادثہ میں غالباً ایسے عناصر کا ہاتھ بھی ہو تو اس کا عملی جواب یہ ہے کہ ہم صدر صاحب کے مشن کو کامیابی سے ہمکنار کریں اور وہاں مجاہدین کو جب تک حکومت قائم کرنے کا حق نہ ملے اس مشن میں اس تسلسل کو قائم رکھیں۔ صدر صاحب مرحوم ایک ایسے

صدر صاحب مرحوم ایک ایسے وقت میں گئے ہیں کہ ہم مشرق و مغرب دونوں سرحدات پر انتہائی نازک خطرات سے دوچار ہیں۔ ایسا وقت پوری قوم کے لیے، سیاستدانوں کے لیے، فوج کے لیے بھی اور حکمرانوں کے لیے بھی ایک امتحان ہے کہ ہم اس آزمائش میں مکمل یکجہتی، اتحاد و تنظیم کو برقرار رکھیں اور قومی مفادات کو ترجیح دیں اور وقتی مفادات سے ہٹ کر ملک کی حفاظت و سلامتی پر پوری توجہ مبذول رکھیں۔ خدانخواستہ ایسی حالت میں کوئی افراتفری، ہنگامہ آرائی اور مفادات پر مبنی سیاست اگر سامنے آگئی تو ہم تو

پہلے ہی بیرونی خطرات سے دوچار ہیں، خدانخواستہ ہماری داخلی کمزوری دشمن کے لیے بہانہ نہ بن جائے۔ قوموں پر ایک امتحان مخالف اور موافق دونوں کیلئے ہوتا ہے، ایسے وقت میں سارے اختلافات بھول جانے چاہئیں اور گویا جب تک ہمیں پورا اطمینان نہ ہو کہ اب ہم خطرات سے نکل چکے ہیں اس وقت تک ہم قومی مفاد کو سب سے پہلے نگاہوں کے سامنے رکھیں۔ ہم ایک نازک امتحان میں آئے ہیں اور قوم کو یہ ثابت کرنا ہے کہ مارشل لاء کے بغیر بھی اور فوج کی چھتری کے بغیر بھی ہم آزمائش کی گھڑیوں میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ فوج نے نہایت تدبر، عاقبت اندیشی اور دوراندیشی کا مظاہرہ کیا ہے ورنہ رات فوج چاہتی تو پورے ملک کو کنٹرول میں لے سکتی تھی مجھے آخری وقت تک کھٹکا تھا مجھ سے اخبار والوں نے دو تین دفعہ پوچھا کہ صبح اجلاس ہوگا یا نہیں؟ میں نے کہا اگر سینٹ رہا تو..... تو خدانخواستہ اگر ایسا اقدام ہوا ہوتا تو وہ اس ملک کو تباہی سے دوچار کر دیتا۔

تو کابینہ اور جرنیلوں نے بیٹھ کر نہایت متوازن فیصلہ کیا، دوراندیشی کا مظاہرہ کیا ہے امید ہے کہ آج فوج پوری توجہ ملک کی سرحدات کی حفاظت پر مبذول رکھے گی اور اس موقع پر سیاست دان ثابت کر دیں کہ ہم فوج کے بغیر اور مارشل لاء کے بغیر ملک کے نظم و نسق کو چلا سکتے ہیں۔

صدر صاحب کے اسلام کے بارے میں جو جذبات تھے، احساسات اور اعلانات تھے تو آج وہ رہ رہ کر ہمیں یہ خیال آتا ہے اور افسوس ہوتا ہے کہ کاش! وہ اپنے جذبات اور احساسات کو جو اسلام کے بارے میں تھے، کو عملی شکل بھی دے سکتے، وہ اگر چاہتے تو اللہ نے ان کو گیارہ سال کا ایک عظیم موقع دیا تھا، یہ بہت طویل مدت ہے میں نے تنہائی میں اور دوسرے لوگوں نے بھی بار بار ان کو ہر طریقے سے کہا کہ اللہ کے دیئے گئے اس موقع کو، اس نعمت کو آپ للہ استعمال کریں۔ آپ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے، جرأتِ مومنانہ سے کام لے کر جو بھی کرنا ہے وہ عملاً کر دکھائیں اور اس قوم کو اپنی منزل مقصود تک پہنچائیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ اُن کے جذبات تھے، انہوں نے میرے سوال کے جواب میں اپنے دل کے اوپر ہاتھ رکھ کر مجھے کہا کہ مولانا! مجھ میں جرأتِ مومنانہ الحمدللہ ہے۔ میں نے کہا کہ ہے تو اسے اللہ اور بڑھادے لیکن آپ اس کو استعمال کریں۔

بہرحال ایک سنہری موقعہ جو اُن کے ہاتھ آیا تھا اُس سے انہوں نے اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں صحیح فائدہ نہیں اُٹھایا، ورنہ آج تاریخ میں ان کا مقام حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور اورنگزیب عالمگیرؒ سے کم نہ ہوتا۔

یہ حادثہ ہمیں سبق دیتا ہے کہ اللہ کی طرف سے جو بھی نعمت اور موقع ملتا ہے اُس کی قدر کرنی چاہیئے، اس کی شکرگذاری یہی ہے کہ جس مقصد کے لیے اللہ نے ذرائع دیئے ہیں، وسائل دیئے ہیں، اسباب دیئے ہیں اُن کو اسی مقصد میں استعمال کیا جائے۔

ہمارے سامنے دو سانحے آئے ہیں، ایک قومی اسمبلی کے توڑنے کی شکل میں اور دوسرا اس المناک سانحہ کی شکل میں، اِن دونوں سے حکومت کو اور سینیٹ کو اور پوری انتظامیہ کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ یہ عبرت کا سامان ہے اس سے نصیحت حاصل کرنی چاہیئے کہ اللہ جو موقع دیتا ہے اُسے اگر انسان گنوا بیٹھے تو بعد میں افسوس اور پچھتاوے سے کچھ نہیں ہوتا۔

بہرحال اُن کا دور اس ملک کے لیے بحیثیتِ مجموعی ایک شرافت کا دور تھا، وہ ایک شریف النفس سیاست دان تھے، وہ ایک متواضع انسان تھے۔ آج ہم اور پوری قوم اُن کی جدائی کے سوگ میں شریک ہیں، اُن کا ہم پر حق ہے کہ ہم ان کے لیے دعائے مغفرت کریں اور اُن جرنیلوں اور ملک کے سپاہیوں کو جو اُن کے ساتھ اس سانحہ میں شہید ہوئے ہیں اُن کے لیے بھی دُعائے مغفرت کریں۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے ہی اس ایوان سے جو گویا کہ اس گھر کا ایک ممبر تھا (چیئرمین غلام اسحاق خان کی طرف اشارہ ہے) ہماری ہی برادری سے جس کا تعلق تھا آج اُن کو اللہ تعالےٰ نے زمامِ اقتدار دیا ہے، وہ ایک منجھے ہوئے اور سنجیدہ و تجربہ کار اور متحمل سیاست دان بھی ہیں اور ان کی شخصیت ایسی ہے کہ ان کو تمام چیزوں

کا تجربہ حاصل ہو چکا ہے، قوم کے مسائل اور حالات پر ان کی نظر ہے، ملک میں جو مسائل ہیں تین سال (سینٹ) میں مسلسل ان کی نشاندہی کرائی گئی ہے، اُمید ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کو نگاہ میں رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی غیبی مدد فرمائے اور ان کو توفیق دے کہ جمہوری طریقے سے، آئینی تقاضوں کے مطابق اس ملک کو ان بحرانوں سے نکال سکیں اور ملک کو صحیح جمہوریت دے سکیں۔ (آمین)

الحق

ستمبر ۱۹۸۸ء

سانحۂ بہاولپور پر خطبۂ جمعہ

۱۹ اگست ۱۹۸۸ء بروز جمعہ جامع مسجد دارالعلوم حقانیہ میں مولانا سمیع الحق مدظلہٗ نے اپنے خطبۂ جمعہ کے اختتام پر بہاولپور کے المناک حادثہ کے بارے میں مختصراً اظہارِ خیال کیا جس سے اس مسئلہ کے دیگر کئی پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے لہٰذا اسے بھی ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے پیش کیا جا رہا ہے۔ (رفاقی)

حضرات علماء کرام، عزیز طلبہ اور مسلمان بھائیو! نماز کے بعد بڑی عاجزی، انکساری اور توجہ والحاح کے ساتھ ملک کی سلامتی، بقا، خیر خواہی اور بھلائی کے لیے اجتماعی طور پر دعا کریں کہ ملک کی حفاظت تمام مسلمانوں کا فریضہ ہے۔ اس وقت ملک ایک نہایت نازک آزمائش میں ہے اور ملک کے اہم نازک موڑ پر اچانک ایسا حادثہ پیش آیا کہ دشمن بھی اس کا تصور نہیں کر سکتے تھے، سیاسی مخالفین بھی حیرت و اضطراب اور پریشانی میں ہیں۔ ہمارے لیے سب سے بڑا اور عظیم مسئلہ جو خطرہ کا نظر آتا ہے وہ جہادِ افغانستان کی تکمیل اور افغانستان کی آزادی اور وہاں اسلامی حکومت کے قیام کا مسئلہ ہے افغان مجاہدین نے بڑی قربانیوں کے ساتھ دنیا کی سب سے بڑی ظالم اور جابر طاقت کو شکست دیدی۔ سولہ لاکھ افراد اللہ کے راستے میں قربان اور شہید ہوئے، پچاس لاکھ مسلمان اس ملک (پاکستان) میں دربدر، ریگستانوں میں اور آسمان کی نیلی چھت تلے مہاجرت اور مسافرت کی زندگی گذار رہے ہیں۔

جناب صدر ضیاء الحق مرحوم کے ساتھ ہزار ہا اختلافات کے باوجود اور کئی سال سے ملک کے اندر نفاذِ شریعت کے معاملہ میں اُن سے جھگڑے اور نزاع کے باوجود مسئلہ افغانستان میں اُن کے مؤقف اور استقامت کی ہم نے بھرپور تائید اور حمایت کی اور اسے اپنا دینی فرض سمجھا۔ ہماری مروّجہ سیاست کے فروغ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی نہ ہم مغرب کی لادینی جمہوریت کے فروغ کے لیے صدر مرحوم سے جھگڑ رہے تھے اور نہ ضیاء الحق مرحوم سے ہماری لڑائی اس لیے تھی کہ وہ چلا جائے اور بے نظیر یا کوئی اور برسرِ اقتدار آجائے۔ ان چہروں کی تبدیلی سے ہمارے مسئلے حل نہیں ہونے تھے اور قوم و ملک کے لیے کوئی مفاد کی بات نہیں تھی، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ہماری لڑائی صدر ضیاء الحق مرحوم سے اس بات پر تھی اور ہم نے بارہا ان پر واضح کر دیا تھا کہ جناب اللہ نے آپ کو بڑی صلاحیتوں سے نوازا ہے اور اللہ نے اقتدار کی صورت میں آپ کو موقع بخشا ہے، بے پناہ وسائل اور قوت بخشی ہے اسے آپ شریعت کے نفاذ میں استعمال کر کے ملک میں صحیح معنوں میں کلیتہً نفاذِ شریعت کا اعلان کر دیں کہ مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے لادین سیاست دانوں، مفاد پرست طبقات اور ظالم اور خود غرض لیڈروں سے نجات مل جائے۔

وہ مسلسل اسلام کی آواز بلند کرتے رہے، جذبات بھی اُن کے یہی تھے، احساسات بھی تھے، مگر شومئ قسمت کہ ان کے ہاتھ سے نفاذِ اسلام کا مرحلہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ میں نے کل سینیٹ میں بھی اپنی تقریر میں یہی کہا کہ اللہ نے اُن کو بڑا موقع بخشا تھا اور پھر بظاہر اپنے دعاوی، اعلانات، جذبات اور اسلامی فکر کے لحاظ سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ ان کے ہاتھوں قوم منزلِ مقصود تک پہنچ سکے گی۔ ان کی باتیں اسلام کی محبت سے بھرپور اور جذبات اسلام سے معمور رہا کرتے تھے۔ اُن کے دل میں درد تھا، تڑپ تھی، شب و روز ان کا یہی وِرد تھا مگر اب خدا ہی جانتا ہے کہ ان کے لیے کیا موانعات تھے؟ کیا کیا اور کون کون سی رکاوٹیں تھیں؟ کاش کہ ملک مکمل نفاذِ شریعت کی سعادت بھی اُن کی قسمت میں لکھی ہوتی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ایک بے مثال مقام انہیں حاصل ہوتا اور ملک کو ہمیشہ کے لیے بے دین اور پیشہ ور سیاست دانوں سے نجات مل جاتی۔

مگر یہ اللہ کو منظور نہ تھا ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بہر حال ملکی حالات اور نفاذِ شریعت کا مسئلہ تو ہمارے اپنے ملک اور اپنے گھر کی بات ہے، اس مسئلے پر ہم نے ان سے لڑائی لڑی، مطالبے کیے، تحریکیں چلائیں، ان پر دباؤ ڈالا، جس کے نتیجے میں مرحوم کوئی قدم اٹھا بھی لیتے، کچھ اقدامات کر بھی لیتے گو کہ وہ ناقص ہوتے اور اصلاح طلب بھی۔ ہم نے ۷ اپریل ۸۵ء کو جمعیۃ علماء اسلام کے زیر اہتمام صدر ضیاء الحق مرحوم کے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کے دوران اسمبلی کے گیٹ کے سامنے احتجاجی مظاہرہ کیا تھا، نفاذِ شریعت کا مطالبہ کیا تھا اور کتبے لگائے تھے اور ان پر لکھا تھا:

"شریعت بل منظور کرو اور منافقت چھوڑ دو، شریعت بل سے اعراض و انکار کر کے خدا کے غضب کو دعوت نہ دو"

اور پھر جب صدر مرحوم اسمبلی گیٹ کے سامنے آئے تو ہم ان کتبات کا ہار بنا کر صدر ضیاء الحق کے سامنے اڑ گئے۔ اخبارات میں اس کی تفصیلات آئیں اور الحمد للہ! کہ اس میں ہم نے کوئی لچک اور کوئی مداہنت نہیں کی اور اپنی لڑائی احسن طریقہ سے جاری رکھی۔

مگر ایک دوسرا مسئلہ جو عظیم مسئلہ اور تمام امتِ مسلمہ کی اہمیت کا مسئلہ ہے اور وہ مسئلہ افغانستان کا ہے، مسئلہ افغانستان میں ہم شرح صدر کے ساتھ پہلے روز سے صدر مرحوم کو حق پر سمجھتے تھے، مسئلہ افغانستان اور اس کے تمام پہلوؤں کو ملحوظ رکھ کر آج تمام عالمی طاقتوں کو اس بات کا اعتراف ہے، تمام دوست اور دشمن اس بات کے قائل ہیں کہ اس مسئلے کی کامیابی اور مقصد سے ہمکناری کا سہرا افغان مجاہدین اور مرحوم صدر ضیاء کے سر ہے، اس تمام گاڑی کے ڈرائیور وہی تھے۔

اور ہمیں معلوم ہے کہ دنیا کی بڑی طاقتیں اس مسئلہ میں انہیں کس طرح دباؤ اور خوف میں رکھے ہوئے تھیں مگر مرحوم صدر نے اس مسئلہ میں تمام امور کو داؤ پر لگا دیا تھا۔

کل مجھے مرحوم ضیاء الحق کے ایک قریبی معتمد سیکرٹری نے رو رو کر بتایا اور کہا کہ صدر صاحب کے ساتھ میں ایک غیر ملکی دورے میں شریک تھا تو اُس وقت روس کی ایک ذمہ دار شخصیت نے لب ولہجہ بدل کر صدر مرحوم سے کہا کہ:

"ہمارے اس علاقہ میں جو عزائم اور مقاصد ہیں ہم خوب سمجھتے ہیں اُن کی تکمیل اور تحصیل میں آپ ہمارے لیے سب سے بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ ہم نے ہر طریقہ استعمال لیا مگر آپ کا علاج ہمارے پاس نہیں، اگر آپ نے اپنی پالیسی نہ بدلی اور لچک پیدا نہ کی تو آپ کو اس طرح اُچک لیا جائے گا کہ کسی کو خبر بھی نہ ہو گی"

تو اس موقع پر صدر ضیاء مرحوم نے بڑے اطمینان سے اُسے جواب میں کہا:

"دیکھو میں مومن اور مسلمان ہوں اور بحیثیت مسلمان میرا اللہ کی ذات پر یقین ہے کہ میری جان اسی کے قبضے میں ہے، میری موت وحیات کا مالک بھی وہی ہے۔ اگر تم لوگ میری ایک ایک بوٹی کر کے فضا میں بکھیر دو گے تب بھی اس مسئلہ میں میں ہرگز نہیں جھکوں گا"

وہ شخص یہ باتیں بیان کرتے جاتے اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ رو رہے تھے۔

دو تین ماہ سے رُوس اس قسم کی باتیں کر رہا تھا اور اُس کی جانب سے دھمکی آمیز خبریں آ رہی تھیں۔ منزل قریب تھی، روس کے تمام عزائم، مقاصد اور سکیمیں ناکام ہو رہی تھیں۔ مجاہدین نے بڑی تیزی اور پامردی سے اپنے حملوں کی یلغار کر دی۔ مرحوم صدر ضیاء الحق جنیوا معاہدہ کے اوّل روز سے موجودہ شکل میں مخالف تھے، وہ مجاہدین کے بغیر ایسے معاہدہ کے لیے ہرگز تیار نہ تھے، مگر نام نہاد جمہوریت یہاں پر بھی وہ کام کر گئی جو مسلمانوں کی حریت اور جوش جہاد پر ایک کاری ضرب تھی ـــــ جب جمہوری دور آیا تو اُس وقت کے وزیر اعظم محمد خان جونیجو پر ہم نے ساری حقیقتیں واضح کر دیں، تمام پہلوؤں سے آگاہ کر دیا کہ رُوس اور امریکہ دونوں افغانستان میں مجاہدین کی اسلامی حکومت کے مخالف ہیں۔ وہاں کی

حکومت اور مستقبل کی آزاد اسلامی ریاست مجاہدین کا حق ہے، ان کی شرکت اور رضامندی کے بغیر کوئی معاہدہ، معاہدہ نہیں لیکن وزیرِاعظم نے ساری باتیں پسِ پُشت ڈال دیں اور جنیوا معاہدے پر دستخط کر دیئے ۔ جناب جونیجو صاحب کی شکست اور ان کی حکومت کی ناکامی اور برخاستگی کی ایک باطنی وجہ یہی ہے کہ اس نے مجاہدین کی قربانیوں اور خونِ شہیداں سے تمسخر کھیلنا چاہا۔

ماہ دو ماہ سے روس نے واضح طور پر صدر ضیاالحق مرحوم اور حکومتِ پاکستان کو وارننگ دی تھی کہ اگر پاکستان اپنی پالیسی تبدیل نہیں کرتا اور مہاجرین کی مدد ترک نہیں کرتا تو ہم پاکستان کی اعلیٰ شخصیات کو نشانہ بنائیں گے ۔۔۔ اس وارننگ کے بعد صدر مرحوم کے قریبی رفقاء نے اُن سے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ ان دھمکیوں کے بعد اب عام سفر بند کر دیں، ہر قدم حزم و احتیاط سے اٹھائیں۔

مرحوم صدر نے اس وقت بھی یہی کہا تھا کہ تم کیسے مسلمان ہو، ایسی باتیں کرتے ہو؟ جو گولی میرے مُقدّر میں لکھی ہے وہ ضرور مجھے لگے گی۔

بہر حال ایسے حالات میں کہ جب جہادِ افغانستان میں مسلمانوں کی قربانیاں ٹھکانے لگ رہی تھیں تو تمام اربابِ بصیرت اور اہلِ دانش کی رائے یہی ہے کہ اس جہادِ افغانستان کی پاداش میں مرحوم صدر ضیاءالحق کو سازش کے ذریعہ قتل کرا دیا گیا تاکہ جہاد سرد پڑ جائے اور کامیابی سے ہمکنار ہونے والے مجاہدین کی یلغار روکی جا سکے۔

بہر حال مرحوم صدر نے مسئلہ افغانستان میں ملتِ مسلمہ کا سر فخر سے اونچا کر دیا ہے انہوں نے دنیا کی ایک بڑی سپر طاقت اور رُوس جیسی ظالم طاقت کو مجبور کر دیا ہے کہ آج وہ پسپا ہوتی نظر آ رہی ہے ۔۔۔ ہماری عظمتِ رفتہ جو بنگال میں برباد ہوئی تھی الحمدللہ آج افغانستان میں وہ دوبارہ بحال ہو گئی ۔

جہاد کی کامیابی کا سہرا مجاہدین اور صدر ضیاء مرحوم کے سر ہے۔ آج پریشانی کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ حادثہ ایسے حالات میں رونما ہوا کہ اس مسئلہ میں ان کا متبادل بظاہر کوئی دوسرا انتظام نہیں ہے، قحط الرجال ہے، خلا ہے، آج تمام مسلمان سربراہوں کا اپنے ذاتی کردار و عمل

کے لحاظ سے اتنا وزن نہیں ہے اور وہ ایمانی قوت اور خالص اسلامی زندگی نہیں ہے۔
مرحوم صدر نو مسلمانوں کے صفِ اوّل کے ایک راہنما تھے۔ شاہ فیصل مرحوم جب امتِ مسلمہ کے اتحاد اور اس کی ترقی کے فکر و غم میں شب و روز لگے رہے تو انہیں راستہ سے ہٹا دیا گیا اور آج ایسے حالات میں جب مسئلہ افغانستان کامیابی سے ہمکنار ہونے والا تھا تو ضیاء مرحوم کو راستے سے ہٹا دیا گیا — اور پھر ہمارے ملک میں تو قحط ہی قحط ہے۔ ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں سب نے بنا رکھی ہیں۔ کفر، بے حیائی، الحاد اور مخالفِ اسلام ازموں کے نعرے لگ رہے ہیں، ایک دوسرے کی عزت کو لوٹا جا رہا ہے، بزرگوں کی داڑھیوں کو نوچا جا رہا ہے، ایسے حالات میں ملکی مسائل کے ساتھ ساتھ مسئلہ افغانستان بھی ویسے کا ویسا رہ گیا ہے، مگر ہم اللہ تعالیٰ سے مایوس نہیں، اللہ تعالیٰ مجاہدین کے خون کو رائیگاں اور ضائع نہیں ہونے دیں گے۔ میرا یقین ہے کہ انشاء اللہ وہاں اسلامی حکومت ضرور قائم ہوگی، مگر ظاہری اسباب اور وسائل کی حد تک ملک ارباب حل و عقد کے لیے ایک بہت بڑا خطرناک اور حساس موڑ آ گیا ہے۔

یہ حقائق تو بعد میں سب پر واضح ہوں گے کہ ہمیں کتنا بڑا خسارہ پہنچا، مرحوم صدر کے ساتھ ہمارا ملکی سطح پر نفاذِ شریعت کے معاملہ میں اختلاف تھا، سیاسی جنگ شروع تھی وہ صرف اسلام کا نعرہ لگاتے اور ہم نے عملاً نفاذِ شریعت کے لیے ان کے گریبان میں ہاتھ ڈالا کہ اس ملک میں اسلام نافذ کر دو۔

اب ملک کو داخلی اور خارجی خطرات درپیش ہیں، روس جس طرح کی باتیں کرتا ہے بھارت بھی وہی بولی بولتا ہے۔ بھارت نے گذشتہ دنوں پاکستان کو پھر سے دھمکیاں دی ہیں کہ وہاں سکھوں کی تحریک اور مزاحمت پاکستان کی شہ پر ہو رہی ہے۔ راجیو گاندھی نے بھی کہا ہے کہ :-

”پاکستان کو میں تلوار کے زور سے درست کر دوں گا“

مگر یاد رہے کہ پاکستان کو کوئی ٹیڑھی آنکھ سے بھی نہیں دیکھ سکے گا، انشاء اللہ
آج ہر طرف سے ہمارے ملک پر یلغار ہے گویا ہم چکی کے دو پاٹوں میں۔ ملکی حالات

بڑے نازک ہیں، ایسے موقع پر دعا ہی ایک بڑا ہتھیار اور رُوحانی قوت ہے اور ٹوٹے دلوں کا سہارا۔

اس کے بعد اجتماعی طور پر ۱۷ اگست کو فضائی حادثہ کے تمام شہداء کے لیے دعائے مغفرت اور مُلکی استحکام اور تحریک نفاذ شریعت کی کامیابی کے لیے دُعا کی گئی۔

الحق
ستمبر ۱۹۸۸ء

بے زباں تاروں کی عشرت کیا ہے بزمِ خواب ہے

یہ چمک کچھ بھی نہیں ہے آنسوؤں کی آب ہے

حفیظ جالندھری

چند ذاتی سانحے

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اِک پیغام ہے
موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

اقبالؒ

صدمہ جانکاہ اور اظہارِ تشکر

۲۲ ، ۲۳ ؍ اکتوبر کی درمیانی شب کو دس بجے ہمشیرہ محترمہ بی بی زینب کے انتقال کا حادثہ یکایک پیش آیا۔ مرحومہ کی عمر ۲۲ سال تھی، انتقال مرضِ ولادت میں ہوا بچی (جس کا نام بعد میں ثمینہ رکھا گیا) ولادت سے دو ایک منٹ بعد ماں کے سایۂ شفقت سے محروم ہوگئی ۔ وفات اپنے شوہر میاں چاند بادشاہ کے گھر جہانگیرہ میں ہوئی جو ہمارے سگے خالہ زاد بھائی ہیں مگر ہم سب کی خواہش پر نعش جہانگیرہ سے اکوڑہ خٹک لائی گئی۔ جوانمرگ ہمشیرہ (جو بہنوں میں پہلی بہن تھیں) کی اچانک جدائی نے پورے خاندان کے دلوں کو مجروح کر دیا ہے۔ بالخصوص والدین کے لیے تو اولاد کا یہ پہلا ہی صدمہ ہے ۔ وفات کی اطلاع چند مخصوص اعزہ اور احباب کو دی گئی مگر یہ خبر راتوں رات جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی، اور ۲۳ ؍ اکتوبر کی صبح سے مہمانوں کا تانتا لگ گیا۔ نماز جنازہ ۲ بجے ہوا۔ ہزاروں افراد جن میں علماء، صالحین اور دیندار حضرات کی اکثریت تھی، نے جنازہ میں شمولیت کی۔ تدفین اپنے جدِ امجد الحاج مولانا محمد معروف گل رحمہ اللہ کے مزار کے قدموں میں ہوئی ۔ اکوڑہ کی تاریخ میں یہ جنازہ اپنی نظیر آپ تھا، اور علماء اور اہل اللہ کی شمولیت مرحومہ کی سعادت مندی کی علامت تھی۔ اُس وقت سے لے کر اب تک تعزیت کرنے والوں کا سلسلہ جاری ہے ۔ بے شمار خطوط آرہے ہیں، کئی جگہ مخلصین نے دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کا اہتمام بھی کرایا۔ ان تمام حضرات کا پورا خاندان بالخصوص والد بزرگوار حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نہایت شکر گذار ہیں۔ اور دل کی گہرائیوں سے اس صدمہ میں ہمدردی کرنے والوں بالخصوص اہلِ قصبہ کے رفع درجات کے لیے سب دست بدعا ہیں جنہوں نے مہمانوں کی خاطر داری سے اور سارے انتظامات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ——— نیز اپنے تمام مخلص قارئین

اور متعلقین سے مرحومہ[1] کے حق میں دعائے مغفرت کی درخواست ہے ـــــ ہم سب اللہ تعالٰے کی امانت ہیں۔ ان للہ ما اخذ ولہٗ ما اعطی ـــ بجز صبر وشکر کے چارہ نہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

غمزدہ : سمیع الحق ۔ اکوڑہ خٹک

نومبر ۱۹۶۸ء

---

[1] مرحومہ کے متعلق محترم المقام مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہٗ کے یہ تاثرات لکھتے وقت خود اس عاجز کی آنکھیں بھی اشکبار ہو گئیں ۔ دل کی گہرائیوں سے اللہ کے حضور دعا ہے کہ اللہ کریم مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور مرحومہ کی قبر پر اپنی خصوصی رحمت نازل فرمائے ۔ آمین (محمد لطیف گیلانی خوشنویس)

سرچشمۂ خیر و برکت

دادی اماںؒ

فرصتِ غم کہاں زمانے میں
آج رولیں تیرے لئے دم بھر

۱۸ ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۶ء بروز جمعۃ المبارک نمازِ جمعہ سے کچھ دیر قبل میری دادی صاحبہ مرحومہ و مغفورہ اور حضرت قبلہ والد بزرگوار شیخ الحدیث دامت برکاتہم کی والدہ ماجدہ قدس اللہ سرہا العزیز واصل بحق ہوئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ــــ اور یوں ہم خیر و برکت کے اس عظیم الشان سرچشمہ سے ظاہری طور پر محروم ہوگئے جس سے تقریباً پچاسی برس سے زائد عرصہ تک پورا خاندان مستفید ہوتا رہا۔

موت حق ہے اور سب نے اس دنیا سے جانا ہے۔ لیکن مرحومہ کی عمر اور ضعف و نقاہت سب باتیں اسے ایک طبعی حادثہ بنا دیتی ہیں۔ بظاہر یہ ایک ذاتی سانحہ ہے مگر درحقیقت دارالعلوم حقانیہ اور حضرۃ شیخ الحدیث مدظلہ کے تمام کاموں میں پس پردہ دادی صاحبہ مرحومہ کی پُرسوز، مسلسل اور شبانہ روز دعائیں جس انداز میں کارفرما تھیں اور جو مضبوط روحانی سہارا حاصل تھا اس لحاظ سے یہ سانحہ صرف ایک گھرانے کے لئے نہیں بلکہ پورے ادارہ اور اسکی علمی و دینی سرگرمیوں اور دارالعلوم سے وابستہ ہزاروں لاکھوں فضلاء متوسلین و محبین کے لئے باعث رنج و غم بن گیا۔ قارئین الحق اور متعلقین میں سے بہت کم حضرات کو اس وجود باجود کی موجودگی کا علم تھا، اور جب وصال کا علم ہوا تو بہت سے اہل اللہ، علماء و صلحاء نے اس امر کا اظہار کیا کہ دارالعلوم کی ترقیات اور اس کے خدام کا

دین کی سربلندی کے لیے حقیر مساعی کا راز اب سمجھ میں آیا ہے۔ حضرۃ شیخ الحدیث، مدظلہٗ نے دارالعلوم کے اساتذہ اور طلبہ کے ایک تعزیتی اجتماع میں برسبیل تذکرہ فرمایا کہ مجھے یہ یقین کامل ہے کہ اس پسماندہ بے آب وگیاہ سرزمین وادیٔ غیر ذی زرع میں دارالعلوم کا قیام اور دین کی اشاعت میری اس ضعیف والدہ ماجدہ کی سوز و تڑپ، تعلق مع اللہ اور ہر لحہ دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

پس دادی صاحبہ مرحومہ کی جدائی بلاشبہ اس لحاظ سے بھی موجب غم ہے کہ اس پُرفتن و پُرآشوب دور میں دارالعلوم اس سے وابستہ شعبے اور ادارے ایک بہت بڑی روحانی قوت سے (جو پس پردہ تھی) اور اسکی برکات اور دعاؤں سے محروم ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ اس خلاء کو مرحومہ کے روحانی برکات و فیوضات سے پُر فرمادے۔

ہر شخص کو اپنے خاندان کے بزرگوں سے محبت اور عقیدت ہوتی ہے۔ مگر راقم الحروف جب ان تمام طبعی عوامل اور دواعی سے ہٹ کر بھی مرحومہ کی طویل زندگی پر نگاہ ڈالتا ہے۔ تو ایمان و یقین، صبر و شکر اور عبدیت فضائیت کے ایسے ایسے مظاہر میں اس پوری زندگی کو ڈوبا ہوا پاتا ہے۔ جو ہر لحاظ سے ایک مومن کامل کی زندگی کہلائی جاسکتی ہے۔ اس عہد ظلمات میں جبکہ مردوں میں بھی ایمان و اعمال کے معیار پر پورے اترنے والے عنقاء ہیں دادی صاحبہ مرحومہ کی ذات میں ہمارے لئے ایک ایسی مومنہ قانتہ کی مثال موجود تھی کہ بلا مبالغہ ان کا کوئی لمحہ اور کوئی لحظہ یاد خداوندی اور فکر آخرت سے خالی نہ رہتا فرائض و سنن تو بڑی بات ہے۔ نوافل و مستحبات اور اوراد و اذکار میں بھی شدت حرص اور انہماک و شغف، کا عالم جب تک قویٰ نے مکمل جواب نہ دیا فرائض سے کم نہ تھا، معمولی سے معمولی مسئلہ اور کسی شرعی حکم میں اتنا تصلّب ہوتا کہ کسی کے کہنے پر اپنی راستے میں لچک نہ پائیں، عزیمت کا یہ حال کہ رخصت یعنی تیمم اور اشارہ سے یا بیٹھ کر نماز پڑھنے پر بھی ہم بمشکل انہیں آمادہ کرسکتے ایک مدت مدید سے رمضان المبارک میں اعتکاف کا شدت سے اہتمام فرماتیں، یہاں تک کہ گذشتہ سے پیوستہ رمضان المبارک میں بھی اس سنت کو پورا فرمایا جبکہ بیماری اور ضعف و نقاہت کی وجہ سے تمام تیمار دار روزہ نہ رکھنے پر بھی مصر تھے،

اس سال بھی جب کہ استغراق اور نیم غنودگی کی وجہ سے دن اور رات کا امتیاز بھی مشکل ہو گیا تھا۔ رمضان المبارک کے روزے پورے کئے جبکہ جسم سانس لینے کا متحمل نہ تھا۔ مگر عین افطار کے وقت بھی بڑی مشکل سے روزہ کھولتیں اور یہ کھٹکا لگا رہتا کہ شاید یہ لوگ قبل از وقت ترس کھا کر میرا روزہ کھلواتے ہیں۔

قرآنِ کریم کا ایک معتد بہ حصہ بچپن سے ازبر تھا۔ ادعیہ مسنونہ کے کئی مجموعے مثلاً گنج العرش[1] وغیرہ طفولیت سے حفظ تھے۔ اذکار و اوراد کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے دماغ میں تھا۔ مگر اس کے باوجود نئی نئی دعاؤں اور اذکارِ مسنونہ کی تلاش میں رہتیں اس ضمن میں کسی دعاؤں کی کتاب میں جبکہ ان کی بینائی قائم تھی کوئی دعا یا ورد یاد کیا تھا اور بعد میں اسے کچھ بھول گئیں۔ اور کتاب کا نام بھی حافظہ میں نہیں رہا تھا۔ مگر پچھلے دس پندرہ سال میں ایک بار نہیں بار بار جب بھی موقع ملا اس کتاب کی جلد وغیرہ کی نشانیاں بتلا بتلا کر مجھ سے تقاضا کرتیں کہ اسے ڈھونڈ کر دعا کی تصحیح کرا دوں۔ یہی حال قرآنِ کریم کی نئی نئی سورتوں کے حفظ کرنے کا تھا۔ لیٹے لیٹے بھی زیادہ وقت، قرآنِ کریم کی تلاوت اور ادعیہ مسنونہ اور ذکر اللہ میں گزرتا۔ اب، جبکہ میں حافظہ پہ زور دیکر اپنے عہدِ طفولیت کی یادوں کو دیکھتا ہوں تو کمرے میں دادی صاحبہ مرحومہ کو سحری کے وقت چکی پیستے ہوئے پُرسوز اور مترنم لہجہ میں تلاوت، قرآنِ کریم کی آواز کو اپنے کانوں میں آج بھی گونجتا ہوا محسوس کرتا ہوں چکی کی آواز قرآنِ کریم کی تلاوت کے ساتھ ایک عجیب سماں باندھتی، وہ خود فرماتی تھیں کہ ہمیں ہمارے والد صاحب تاکید کرتے کہ صبح جب، چکی پیسنی ہوتی ہے۔ (اور اس زمانہ میں یہ سب کام خواتین کرتیں) تو بے کار خاموش رہنے کی بجائے قرآن پاک کی تلاوت کرتے رہنا، اس طرح لطف بھی آئے گا اور تلاوت کی برکت اور لذت

---

[1] ہمارے پٹھانوں کے دیندار گھرانوں کی خواتین اس قسم کی کتابیں مثلاً پنج سورہ شریف، دعائے گنج العرش، دلائل الخیرات، حزب البحر، حزب الاعظم اور اسی طرح پشتو نظم کے دوسرے رسائل جس میں ابتدائی مسائل ہوتے ہیں۔ مثلاً فوائد شریعت، وفات نامہ، رشید البیان، شمائل نامہ وغیرہ تلاوت قرآن پاک کے بعد پڑھتی ہیں۔ (مرتب)

میں کام بھی آسان ہوگا، فرماتیں کہ اس طرح ہم وقت، نماز، کلمہ ، ، سیر گندم بھی چن لیتیں
اور تلاوت کا ثواب بھی حاصل ہوتا رہتا۔ پھر صبح صبح لسّی وغیرہ بنانے سے بھی فارغ ہوجاتیں
بعد میں بھی خوش قسمتی سے دادی صاحبہ کا کمرہ میرے کمرہ سے متصل تھا، بیچ میں ایک
دروازہ بھی تھا، پچھلے سال تک سردیوں کی طویل راتوں میں جب بھی میری ادھر توجہ ہو
جاتی تو دادی صاحبہ کی تلاوت، اللہ تعالیٰ سے مناجات، ذکر اللہ اور پشتو زبان کے عارفین
شعراء رحمان باباؒ وغیرہ کی منظوم مناجات اور استغفار و تسبیحات کی ایک عجیب گونج سنائی
دیتی، رات بھر یہی شغل رہتا۔ بالخصوص موت کے شدائد، جہنم سے پناہ، مرضیات ربانی کی
التجا کا عجیب عالم تھا، جب بھی ہم نے مزاج پرسی کی تو یہی کہا کہ یہ تو سب گذر جائیگا
اس دنیا کی بات کرو۔ اور خاتمہ بالایمان کی دعائیں مانگتیں، سکرات موت کا انہیں بے حد
ڈر تھا، اور یہ مرحلہ ایسے گذرا کہ کسی کو محسوس نہ ہوا کہ سوگئی ہیں یا وصال ہوگیا ہے۔ یہاں تک
کہ ڈاکٹر نے وفات کے بعد یقین دلایا کہ وصال ہوچکا ہے۔

وفات کے لئے انہیں جمعہ کا دن بہت محبوب تھا وہ فرماتیں کہ میری دادیؒ کا
وصال یوم العرفۃ کو صبح صادق سے قبل ہوا تھا، والد مرحوم بھی جمعہ کو فوت ہوئے اور
والدہ مرحومہ بھی عین اس وقت جبکہ نماز پڑھتیں جمعہ کو فوت ہوئی تھیں، میں بھی اللہ سے
یہی مانگتی ہوں۔ چنانچہ یہ تمنا خدا نے پوری فرمائی اور جمعۃ المبارک، جسے والیوم الموعود و
شاھد و مشھود کا بھی مصداق کہا گیا ہے۔ نماز جمعہ سے کچھ قبل شہود حق کی دولت جاودانی
سے سرفراز ہوئیں۔ عبادات میں انہماک، زہد عن الدنیا کی یہ دولت انہیں اپنے والد ماجد
اور بالخصوص اپنی والدہ ماجدہؒ سے ورثہ میں ملی تھیں وہ اپنی والدہ مرحومہ کی عبادات اور
ریاضات کے وہ وہ حالات بیان کرتیں کہ رونگٹے کھڑے ہوجاتے، فرماتی تھیں ذی الحجہ
اور محرم کے دس دس دن اور اس کے علاوہ ہر سال تین ماہ سات دن روزوں کا معمول
تھا جسے تقریباً زمانہ صحت میں مرحومہ نے بھی اپنایا۔

یہی حال دادی صاحبہ کا عبادات کے علاوہ دیگر اخلاقی قدروں میں بھی تھا۔
حیا، عفت کا یہ عالم تھا کہ ان کی بینائی کسی تکلیف سے ۳۰۔ ۳۵ برس قبل زائل ہوگئی اندازہ

یہ تھا کہ علاج اور اپریشن سے بینائی بحال ہوسکتی ہے اور پردے وغیرہ کا عارضہ ہے،
اس کے لئے حضرت والد ماجد مدظلہٗ نے بارہا باصرار آمادہ کرنا چاہا مگر صرف اس وجہ پر
آمادہ نہ ہوتیں کہ میں اپریشن وغیرہ کے دوران نامحرم مردوں کو کیسے منہ دکھاؤں مجھے اُس
دنیا کی آنکھیں چاہئیں یہ دنیا تو گزر جائے گی۔ زندگی بھر میں نے کوئی نامناسب اور
سخت جملہ ان کی زبان سے سنا نہ غصّہ اور غضب میں ڈوب کر کوئی ناشائستہ بات
زبان سے نکلی، جب تک صحت اچھی تھی سحری سے اشراق تک مصلّی پر بیٹھ کر اپنے وظائف
پورے کرنا اور پھر اس کے بعد آس پاس کے بچّوں اور بچّیوں کو قرآن کریم پڑھانا پھر عصر کے بعد
عشاء گئے تک اپنی عبادتوں میں مصروف رہنا اور رات کو سونے سے قبل بچّوں بچّیوں
کو دینی احکام بزرگوں کے واقعات عالم آخرت، برزخ، جہنم، پل صراط اور میدان محشر
کی باتیں سنانا بھی روز و شب تھے۔

جب ناچیز اپنے حقیر سے دینی جذبات اور احساسات پر غور کرتا ہے تو ان
باتوں کی اوّلین مربیہ اپنی دادی اماں ہی کو پاتا ہے جو میرے بردِ شعور رہی ہے۔ رات کو
سونے سے قبل خدا و رسول ؐ اور آخرت کی باتوں جنّت و جہنّم کی تفصیلات فرشتوں کے
حالات صحابہ کرام ؓ اور بزرگوں کے عجیب و غریب واقعات میں مجھے مگن کر دیتیں۔ یہ
میری وہ عمر تھی کہ میرا ذہن ان باتوں کا قطعی صحیح ادراک نہ کر سکتا اور میں حیرت کی
وادیوں میں اپنے آپ کو گم پاتا۔ یہی نہیں بلکہ غزوات رسول اور فتوحات مصر و شام
اور کربلا کی داستان کرب و بلا کی اوّلین جھلکیاں اپنے دماغ میں اپنی دادی اماں ہی کے
ذریعہ محسوس کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ عمل کی ہزار تنہ دامنی اور تہی دستی کے باوجود اگر دادی
اماں مرحومہ نے بچپن سے معصوم دینی جذبات اور احساسات کا بیج دل میں نہ بویا ہوتا
تو شاید عمل کے ساتھ ساتھ عقیدہ کی کتنی کوتاہیوں کا شکار ہوتا۔ وہ میرے دینی جذبات
کی پہلی معلّمہ اور مربّیہ تھیں حق تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے۔

اتانی ھواھا قبل ان اعرف الھویٰ
فصادف قلبًا خالیًا فتمکّنا

خداوند کریم نے اپنی اس عابدہ اور شاکرہ کو دنیا میں بھی آنکھوں کی ٹھنڈک سے نوازا یعنی حضرت شیخ الحدیث مدظلہ جیسا فرزند دیکھا اور ان کی علمی ودینی برکات سے خوش ہو ہو کر اس دنیا سے گئیں، وہ مجھے فرماتی تھیں کہ وہ اور میرے دادا مرحوم آپس میں باتیں کرتے کہ ہم نے حضرت مدظلہ کی شکل میں ایک پودا دین کے لئے لگایا ہے، کاش! یہ پودا ایک گلشن سرسبز بن جائے، اس پودے کو دادی صاحبہؒ نے خون پسینہ سے سینچا اسکی آبیاری کی اور اسے اتنا سرسبز وشاداب بنا ہوا دیکھا کہ اس کے ثمرات، ہزاروں فضلاء اور علماء جیسی روحانی ذریت کی شکل میں انہیں ملے جو انشاء اللہ اب عالم آخرت میں رہتی دنیا تک ان کے لئے صدقہ جاریہ بنیں گے۔

وفات کے وقت حضرت شیخ الحدیث مدظلہ قومی اسمبلی کے اجلاس میں مصروف تھے اطلاع ملنے پر شام کو گھر پہنچے، احقر راقم الحروف کراچی میں تھا۔ ہفتہ کے روز رات کو گھر پہنچا، نماز جنازہ ہفتہ کے دن گیارہ بجے پڑھی گئی بد قسمتی سے میں اس سعادت اور آخری دیدار سے محروم رہا۔ وفات کی خبر راتوں رات اکثر علاقوں میں پہنچ گئی، ریڈیو نے اس خبر کو رات کو اور پھر صبح کو نشر کیا، اخبارات میں بھی اطلاع آگئی، اکثر حضرات کا کہنا ہے کہ ایسا پرشکوہ نورانی جنازہ اس علاقہ میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ ایک عجیب نورانی مخلوق علماء وصلحاء مشائخ طلبہ علوم دینیہ اور دیگر دیندار مسلمان فوراً پہنچ گئے۔ ہر شخص تجہیز وتدفین کی سعادت میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ مقامی ٹاؤن کمیٹی اور شہریوں نے ہر طرح سے تعاون کیا۔ اکثر دوکانیں بند رہیں علماء ومشائخ کے علاوہ بیشمار عمائدین، شرفاء اور معززین ملک پہنچ گئے بعد میں تعزیت کا سلسلہ بھی بے حد دراز رہا، تعزیت کے لئے آنے والوں میں گورنر سرحد کئی وفاقی اور صوبائی وزراء قومی وصوبائی اسمبلی کے ارکان تعلیمی اداروں سے وابستہ حضرات بالخصوص پشاور یونیورسٹی کے جس کے وائس چانسلر سے لیکر اکثر شعبوں کے سربراہوں، پروفیسروں لیکچراروں اور طلبہ نے بہت بڑی تعداد میں قدم رنجہ فرمایا۔ ملک بھر سے مدارس عربیہ بالخصوص فضلاء دارالعلوم حقانیہ نے ختم کلام پاک اور روحانی والدہ کے لئے ایصال ثواب و دعائے مغفرت کی اطلاعیں دیں۔ ملک کے سرکردہ اکابر ملت نے دعاؤں سے نوازا،

بندہ ناچیز ان تمام حضرات کا تہ دل سے مشکور ہے۔

اپنی اماں جی (جنہیں ہم اس نام سے پکارتے تھے) کے ہم اہل خاندان پر بے حد احسانات اور حقوق ہیں جسکی وجہ سے یہ چند سطور بطور "نذرِ عقیدت" اپنے معزز قارئین نقشِ آغاز سے اس بار مستعار لینے پڑے کہ شاید وہ اپنے اس خادمِ دیرینہ کو ایک ذاتی سانحہ میں اظہارِ جذبات کا حق بڑی خوشی سے دیں گے۔

اللھم نور قبرھا وبرّد ضریحھا شابیب الرحمة والرضوان الی یوم القیامة

آمین۔

الحق

دسمبر ۱۹۷۶ء

ہمشیرہ
حضرت شیخ الحدیث مدظلہ

۳۰ مئی کو حضرۃ شیخ الحدیث مدظلہ کی ہمشیرہ محترمہ جو نہایت صالحہ عابدہ خاتون تھیں اور حضرت مدظلہ کے ساتھ ہی عمر بھر رہیں۔ صبح ۵ بجے طویل علالت کے بعد تقریباً ۵۵، ۶۰ برس کی عمر میں انتقال فرما گئیں۔ زندگی بھر آپ محلہ اور آس پاس کی بچیوں کو قرآن کریم کی تعلیم حسبۃً للہ گھر پر دیتی رہیں۔ نمازِ جنازہ ۴ بجے بعد ظہر کو ہوا۔ تدفین اپنی والدہ ماجدہ کے پہلو اور والد مرحوم کی پائنتی میں حضرت کے خاندانی قبرستان میں ہوئی۔ نماز جنازہ میں اہالیانِ اکوڑہ خٹک، اساتذہ وطلبہ دارالعلوم حقانیہ کے علاوہ اطراف واکناف سے کثیر تعداد میں علماء، صلحاء اور متعلقین نے بڑی تعداد میں شرکت فرمائی۔ تدفین کے بعد مولانا حمداللہ صاحب شیخ الحدیث ڈاگئی اور مولانا حسن جان صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم اکبر مردان نے مجمع سے خطاب فرمایا۔ تعزیت کرنے والوں کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

تمام قارئین اور دیگر اہلِ علم سے مرحومہ کے لیے ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کی مخلصانہ اپیل کی جاتی ہے۔

الحق
جون ۱۹۷۹ء

برحلت مخدومنا حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب قدس سرہ العزیز

قطعۂ سالِ وفات

از مرتب کتاب حافظ محمد ابراہیم فانی

وکیل	مغفورہ	اے
۶۶ = ۱۴۰۸ھ	۱۳۳۱	۱۱

اے کہ تیری موت آئی صد پریشانی کے ساتھ
درد و غم کرب و الم اور خانہ ویرانی کے ساتھ

شہرِ دل پر یا خدا! یہ ماجرا کیا ہو گیا
حملہ زن ہے لشکرِ غم فتنہ سامانی کے ساتھ

اے خداوندا ہمیں توفیقِ ضبطِ غم بھی دے
موت گو ہے لازمہ اک نسلِ انسانی کے ساتھ

صدمۂ فرقت نہیں یہ فردِ واحد کے لیے
آسماں بھی گریہ زن ہے بزمِ حقانی کے ساتھ

موت بھی "اللہ" تیری کس قدر رشکِ آفریں
جب اٹھا تیرا جنازہ کیفِ وجدانی کے ساتھ

مہبطِ انوارِ حق ہو آپ کا خاکی مزار
حشر تک ہو رحمتِ حق کی نگہبانی کے ساتھ

"اے" "کہ تو" "مغفورۂ" مولا "وکیل" کائنات
تیری تربت ہو منوّر لطفِ ربانی کے ساتھ

نالہ زن تنہا نہیں ہیں آپ مولانا سمیع
مرثیہ خواں ایک عالم بھی تو ہے فانی کے ساتھ

زندگی در گردنم افتاد بیدل چاره نیست

شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

بیدل

چند نامور خواتین

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

اقبالؒ

بیگم اسیر مالٹا مولانا عزیر گل صاحب

مدر مرحومہ

ابھی چند روز قبل ایک ایسی پاک طینت اور راسخ الایمان خاتون بھی انتقال فرما گئیں جن کی زندگی عصرِ حاضر کی مسلمان خواتین کے لیے روشنی کا مینار اور ایک بہترین نمونہ بن سکتی ہے۔ یہ سراپا ایمان خاتون اسیرِ مالٹا حضرت مولانا عزیر گل صاحب کا کاخیل ہ تلمیذِ خاص حضرۃ شیخ الہند قدس سرہٗ کی اہلیہ محترمہ تھیں۔ جنہوں نے برطانیہ کے ایک ممتاز اور ذی ثروت خاندان میں آنکھیں کھولیں، اس خاندان کا مذہب عیسائیت تھا۔ اس گھر کے اکثر افراد اونچے اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ برصغیر کے انگریز کمانڈر انچیف لارڈ کچنر اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سکندر حیات کے زمانہ کے انگریز گورنر پی جے گلانسی سے اسی خاتون کی چھوٹی بہن منسوب تھی۔ مگر خود انکے دل میں تلاشِ حق کا جذبہ تھا، وہ بچپن سے انجیل اور عیسائی مذہب سے مطمئن نہ تھیں۔ حق کی جستجو میں انہوں نے کئی مذاہب کی چھان بین کی۔ شوقِ حق کا یہ جذبہ انہیں ہندوستان لے آیا، یہاں انہوں نے بدھ مذہب کو اپنایا، پھر سادھوؤں کی طرح دنیا سے کنارہ کشی کی، ریاضتوں اور مجاہدوں میں ایک وقت گذارا ـــــ بالآخر انہیں قرآن کریم کی شکل میں وہ

---

[1] مرحومہ نے اپنی انگریزی تصنیف "دی ہیلینسڈ وے" میں اسلام کی طرف آنے سے پہلے کی زندگی اور بعد کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس خود نوشت میں مرحومہ لکھتی ہیں: "میں اپنے والد چارلس ایڈورڈ اسٹیفورڈ ڈسٹبل کی ساتویں لڑکی ہوں۔ میں ۱۸۸۵ء میں حیدرآباد سندھ میں پیدا ہوئی۔ میرے والد بڑے انصاف پسند اور بات کے پکے انسان تھے، انہیں ہندوستان اور ہندوستانی لوگوں سے بڑا لگاؤ تھا، کبھی کبھی تو وہ خود کو سندھی کہہ دیا کرتے تھے۔" (الحق) (مرتب)

نسخۂ شفا مل گیا جس کے لیے وہ سرگرداں تھیں۔ اسلام نے ان کے مضطرب دل و دماغ کو اطمینان بخشا۔ وہ مسلمان ہوئیں اور ۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۱ء میں ایک دینی مرکز دارالعلوم دیوبند کا شہرہ سن کر دارالعلوم دیوبند آئیں اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز کی مجلس میں اپنے اسلام اور مومنانہ اثرات کا اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یورپ کی تمام آسائشوں، ایک آسودہ حال خاندان اور اپنے ملک، وطن کو اسلام کی راہ پر قربان کر دیا، اللہ کی راہ میں ہجرت کے لیے انہوں نے اپنی اولاد تک کو بھی عمر بھر کیلئے خیر باد کہا جو اُن کے انگریز شوہر سے تھی ـــ اور یکسوئی سے اسلامی تعلیمات کے حصول میں لگ گئیں۔ حضرت مولانا عزیر گل صاحب مدظلہ، کی سابقہ اہلیہ (جو حضرت شیخ الہندؒ کی نواسی تھیں) کے انتقال کے بعد حضرت مدنیؒ اور دوسرے اکابر کے مشورہ پر ۱۹۳۶ء میں اس پاکباز خاتون کا نکاح[1] حضرت مولانا عزیر گل صاحب کے ساتھ ہوا، اور اس وقت سے لے کر اب تک ساری زندگی ایک ایسے دور اُفتادہ گاؤں (جس کی آبادی بمشکل ۳۰، ۴۰ افراد کی ہوگی) میں بسر کی، جو یورپ تو کیا اس ملک کی عام آسائشوں سے بھی محروم تھا۔ اعزہ و اقارب کے تقاضوں کے باوجود آخر دم تک ظلمت کدۂ یورپ کو چند دن کے لیے بھی جانا گوارا نہ کیا۔ ان کی زندگی حضرت مولانا کے ساتھ ایک متوسط بلکہ کفاف کی زندگی تھی۔ زندگی بھر ان کا مشغلہ قرآن مجید کا مطالعہ

---

[1] مرحومہ لکھتی ہیں: "یہاں میں اسلام کے مطالعہ میں لگی ہوئی تھی کہ اچانک میرے شوہر کا خط آیا کہ اگر میں فوراً انگلستان نہ لوٹی تو وہ مجھے خرچ دینا بند کر دیں گے ..... اس خبر پر مجھے نہ تعجب ہوا نہ افسوس، میں مسلمان ہو چکی تھی اب میں کسی عیسائی شوہر کی بیوی کیسے رہ سکتی تھی۔ رہا رزق! تو یہ اللہ کی دین ہے، کم یا زیادہ ملے گا ہی ـــ عزیر گل کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے میرا ہاتھ تھامنے کی پیش کش کی، میں نے بڑے احترام سے اس پیشکش کو قبول کر لیا۔ میں جانتی تھی کہ ان کے یہاں غربت ہے، افلاس ہے، پردہ ہے، لیکن میرے لیے تو یہی اللہ کی پسندیدہ جگہ تھی۔ عزیر گل کے گھر میں میں نے سیکھا کہ خود بھوکے رہ کر مہمانوں کی تواضع میں کیا لذت ہے۔ عزیر گل کے گھر میں مجھے زندگی کی حقیقی راحت ملی۔ وہ نہایت شریف اور مہربان شوہر ثابت ہوئے" (الحق) ـــ (مرتب)

اور اس میں غور و فکر ارشادی کے بعد انہوں نے حضرت شیخ الہند مرحوم کے ترجمہ کی روشنی اور مولانا عزیر گل کی راہنمائی میں قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ مکمل کیا، جسے اس وقت کے مشاہیر علماء سید سلیمان ندوی رح اور دیگر حضرات نے بے حد پسند کیا مگر افسوس کہ ناشرین کی سرد مہری کی وجہ سے اب تک شائع نہیں ہوسکا۔ معلوم ہوا ہے کہ لاہور میں فیروز سنز والوں نے اس کی اشاعت کی ذمہ داری لی ہے۔ نمونہ کے طور پر اس کا پروف بھی چھپا تھا، مگر ان کی بے اعتنائی کی وجہ سے یہ ترجمہ تا حال منظر عام پر نہیں آسکا ــــــ

مرحومہ نے (جو بعد اسلام مدار (رباں) کے نام سے مشہور تھیں) اسلام کی حقانیت اور دیگر مذاہب کے ساتھ اس کے موازنہ پر ایک کتابچہ بیلنس وے (BALANCE WAY) بھی لکھا ہے۔ قرآن کریم کی اشاعت کی تڑپ کا یہ عالم تھا کہ مرتے وقت بھی وصیت کی کہ ان دیہاتی عوام کو پورے قرآن کریم کا ترجمہ اور مفہوم سمجھا دیا جائے۔ علم اور فضل خدا کی دین ہے، اور وہ چاہے تو اس دولت سے عورتوں کو بھی سرفرازی بخش دیتا ہے۔ روشنی کے یہ چراغ کبھی مردوں کی شکل میں جلے تو کبھی عائشہ رض اور رابعہ رح کی شکل میں ــــــ روشنی بہرحال روشنی ہے اور اسے منزل مقصود کا ذریعہ بننا چاہیے۔

مرحومہ نے عیسائیت سے بیزاری، پھر اللہ کی راہ میں ملک و وطن، مال و اولاد اور عمر بھر کی عیش و راحت کی قربانی قرآن کریم سے شغف اور انہماک کا ایک نمونہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے جو ہم سب کے لیے ایک نصیحت اور قابل تقلید اسوہ ہے۔

الحق

اکتوبر ۱۹۶۶ء

◎

اہلیہ محترمہ قاری محمد طیب قاسمیؒ

عالم اسلام کے عظیم مرکز علمی و دینی دار العلوم دیوبند کے مہتمم حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمی کی اہلیہ محترمہ کی وفات کا علم رسل و رسائل منقطع ہونے کی وجہ سے بہت بعد میں ہوا، مرحومہ اردو مدراسی زبان کی بہترین خطیبہ اور محافل مستورات میں وعظ و تبلیغ کی اعلیٰ خدمت انجام دیا کرتی تھیں اور بیشمار معنوی خوبیوں کی مالک کہ ؏

این خانہ ہمہ آفتاب ست

حق تعالیٰ مرحومہ کو اعلیٰ مقامات سے سرفراز فرما کر پسماندگان خصوصاً حضرت حکیم الاسلام مدظلہ اور ان کے صاحبزادگان کو صبر جمیل کے درجات سے نوازے۔

الحق
دسمبر ۱۹۷۶ء

محترمہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ

ہمشیرہ مولانا ابوالحسن علی ندوی

خانوادۂ سید احمد شہیدؒ کی ایک صاحبِ علم و فضل خاتون امۃ اللہ تسنیم[1] کے انتقال کی خبر بھی بھارت کے پریس سے معلوم ہوئی۔ آپ مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی قابلِ احترام ہمشیرہ، خواتین کے رسالہ "رضوان" کی مدیرہ اور کئی عربی و اردو تصانیف کی مصنفہ تھیں[2]۔ عربی زبان اور شعر و ادب میں بھی مہارت رکھتی تھیں اور ایسے گھر سے تعلق رکھتی تھیں جو ع این خانہ ہمہ آفتاب ست — کا مصداق ہے۔

اللہ تعالیٰ جانے والے ان سب خادمانِ علم و دین کو بہترین مقاماتِ قرب و رضا سے سرفراز فرمائے، پسماندگان صبر و اجر اور امت کو ان کا بہترین بدل عطا فرمائے۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

الحق —— مارچ ۱۹۷۶ء

---

[1] مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی "پرانے چراغ" حصہ دوم ص ۳۴۲ پر رقمطراز ہیں کہ:—— "ان کی ولادت ۱۲ جمادی الثانی ۱۳۲۶ھ / ۱۸ جون ۱۹۰۸ء بروز جمعرات ہوئی۔ اور میری ولادت ۶ محرم الحرام ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۴ء .... لکھنو امین آباد کے اس محلہ میں جس کو اس وقت بازار جھاؤ لال کہتے تھے"۔—— تاریخ وفات ۲۸ جنوری ۱۹۷۶ء

[2] مولانا ندوی نے بچوں کے لیے عربی میں "قصص النبیین للاطفال" تصنیف فرمائی تو ان کی ہمشیرہ صاحبہ نے اس کا آزاد ترجمہ لکھا جس کا نام "قصص الانبیاء" ہے۔ اور پانچواں حصہ اس کا ہمارے حضورؐ کے مستقل نام سے شائع ہوا ہے۔ اسی طرح امام نوویؒ کی مشہور کتاب "ریاض الصالحین" کو آپ نے "زادِ سفر" کے نام سے اردو کا جامہ پہنایا، جس کے مقدمہ میں مولانا سید سلیمان ندویؒ رقمطراز ہیں:— "ہم کو اس اظہار میں بڑی خوشی ہے کہ امام نوویؒ کی اس کتاب "ریاض الصالحین" کا ترجمہ اسی گھرانے نے کیا ہے جس نے سنتِ نبوی کی اشاعت اور بدعت کے ازالہ کا کام ایک صدی سے پہلے شروع کر رکھا ہے اور جنکے انوار و برکات ہر جگہ نمایاں ہیں"۔—— تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: "پرانے چراغ" حصہ دوم مع تکملہ "سینے کے داغ"۔ (مرتب)

صرف دو آنسو بہت تھے تیرے غم کے واسطے

کیا خبر تھی منتظر دریا کا دریا دل میں ہے

ڈاکٹر عارفی

سوانح وحوادث

کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت
زلزلے ہیں بجلیاں ہیں قحط ہیں آلام ہیں
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں

اقبالؔ

ہزاروں لاشیں

مشرقی ترکی میں زلزلہ

مشرقی ترکی میں زلزلہ آیا اور کتنی ہولناک تباہی و بربادی ساتھ لیتے آیا۔ بیس لاکھ افراد بے گھر ہوئے۔ سینکڑوں بستیاں پیوندِ خاک ہوئیں۔ صرف ایک شہر وارتو میں دو ہزار لاشیں تادمِ تحریر ملبے سے نکالی جا چکی ہیں اور مزید لاشیں مل رہی ہیں۔ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گئے۔ زمین جگہ جگہ دھنس گئی۔ مواصلات اور امدادی نظام درہم برہم ہوا اور آخری خبروں تک زلزلے کے جھٹکے آ رہے ہیں۔

یہ داستانِ عبرت نہ تو قومِ عاد ثمود کی ہے اور نہ لوطؑ و سدوم کی بستیوں کی بربادی کا ذکر ہے، بلکہ اسی ہفتہ کے اندر ایک اسلامی ملک کا جہاں سارے مسلمان ہی مسلمان بستے ہیں۔ اور اس سے پہلے پاکستان اور بھارت میں زلزلہ آیا، یوگوسلاویہ اور جاپان بھی لرز اٹھے، تاشقند کی زمین تو ایسی لرز اٹھی ہے کہ سکون کا نام ہی نہیں لیتی ـــــ یہ حال تو قدرت کے ایک تازیانے (زلزلے) کا ہے۔ ورنہ ہلاکت آفرینیوں کا ایک تانتا ہے جس نے سارے کرۂ ارضی کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا ہے، اور ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ[1] (الآیہ) کا منظر عیاں ہے۔ مگر ہائے ہماری غفلت کیشی کا یہ حال کہ چونکتے تک نہیں ـــ قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل سے جتنی بے پرواہی اس "حیوانی دور" میں برتی جا رہی ہے اس سے پہلے کی سرکش اور باغی قوموں میں شاید اس کی مثال نہ ملے۔ ہم اپنی بربادیوں کے رشتے اسباب و علل سے جوڑتے ہیں مگر مسبب الاسباب

---

[1] برائی ظاہر ہو گئی خشکی اور سمندر (تری) میں لوگوں کے ہاتھ کی کمائی کی وجہ سے۔ (القرآن) ـــــ (مرتب)

پر نہیں پڑتی۔ حالانکہ اس تمام خانماں بربادی کا سرچشمہ ہم خود ہی تو ہیں، یہ ہمارے اعمالِ بد کا ظہور ہی تو ہے۔ "وہ" جن کے لیے اسلام نے ایک فرد کی موت کو بھی سب سے بڑا واعظ قرار دیا تھا، اُن کے سامنے قوموں کی قومیں صفحۂ ہستی سے مٹ رہی ہیں، مگر عین عذاب کے وقت بھی مسجد کی طرف نہیں بلکہ سینماؤں کی طرف دوڑتے ہیں۔ ترکی میں صبح کے بعد شام کو پھر زلزلہ آیا، مگر اس وقت بھی سینما ہال بھرے ہوئے تھے، اور صرف ایک ہال میں دو سو افراد زلزلے سے تباہ ہوئے ــــ کیا صبح کا تازیانہ بھی انہیں جھنجھوڑ نہ سکا تھا؟ انا للہ وانا الیہ راجعون

شقاوت اور بدبختی کے تسلط کا اگر یہی عالم رہا تو شاید اسرافیل کی سیٹیاں بھی ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار نہ کر سکیں، اور یہ زلزلے اور طوفان تو خود مخبرِ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کے مطابق قیامت کے الارم ہیں۔ قدرت کی تلوار جب نیام سے باہر ہو جائے (العیاذ باللہ) تو دنیا بھر کے ہلال و صلیب[1] کی سوسائٹیاں اور امدادی ادارے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے ــ تلوار چلانے والے کے دامن میں پناہ لو ورنہ بالآخر تمہارا نام و نشان تک اس عالمِ خاکی سے مٹا دیا جائے گا ــــ جابر اور قاہر قومیں تم سے پہلے یہاں آباد تھیں، مگر اب ان کی بھنک بھی تمہارے کانوں میں نہیں پڑتی۔

وکم اھلکنا قبلھم من قرنٍ ھل تُحِسُّ منھم من احدٍ او تسمع لھم رکزا۔	ہم نے ان سے پہلے کئی جماعتیں ہلاک کیں تم ان میں سے کسی کی آہٹ پاتے ہو یا سنتے ہو ان کی بھنک۔

سُنا ہے انہیں دنوں ترکی کا ایک وفد پاکستان کا دورہ اس غرض سے کر رہا ہے کہ یہاں "خاندانی منصوبہ بندی" کے کام کا جائزہ لے کر اسے اپنے ہاں اپنائے۔ مگر قدرت کی طرف سے اس عذاب کی شکل میں جو "منصوبہ بندی" ہوئی ــــ کاش!

---

[1] ہلالِ احمر اور ریڈ کراس۔ (مرتب)

اس قدرتی پلاننگ سے ہماری آنکھیں کھل جائیں۔ اور وفد جن لوگوں سے سبق سیکھنے آیا ہے، سبق دینے والوں کو خود اس "حادثۂ فاجعہ" سے سبق مل جائے کہ "قانونِ پاداشِ عمل[1]" سب سے بڑی منصوبہ بندی ہے۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے حال پر رحم کرے۔ اللھم لا تھلکنا فجاءۃً و اذا اردت بقوم فتنۃً فاقبضنا غیر مفتونین ـــــــ

الحق
اکتوبر ۱۹۶۶ء

---

[1] از مکافاتِ عمل غافل مشو۔ (مرتب)

سانحۂ علی پور فراش!

پچھلے دنوں ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی میں ان نو مجرموں کو پھانسی دے کر کیفرِ کردار تک پہنچایا گیا، جنہوں نے گذشتہ برس موضع علی پور فراش کے ۹ افراد کو اُن کی انتہائی بے کسی اور کسمپرسی کے عالم میں نہایت انسانیت سوز طریقے سے دلخراش چیخوں کے دوران زندہ جلا دیا تھا۔ گھر کو مقفل کر کے اس کے اردگرد پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی گئی اور اس کے تمام مکینوں نے جن میں چار عورتیں اور ایک بچی بھی تھی، انتہائی بے بسی کے عالم میں تڑپ تڑپ کر جان دی۔ فاضل عدالت کے فیصلہ کے مطابق ان بے کس مظلوم خواتین میں آٹھ ماہ کی حاملہ ایک خاتون بھی شامل تھی جو ایک خوفزدہ چوہے کی طرح کمرے میں ادھر ادھر دوڑتی رہی اور آخر کار جب اُسے معلوم ہوا کہ اس کا کمرہ بند ہے تو مایوس ہو کر کمرہ کی ایک بلند جگہ سے کود کر گر پڑی اور تڑپ کر جان دے دی۔ بھرا گاؤں اس بربریت کے مظاہرہ کو روکنے کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ مجرموں نے تمام انسانی قدروں کو پائمال کرتے ہوئے ہنسی خوشی اِس صدی کا یہ اندوہناک کھیل دیکھا۔ بھائی بھائی کو اور والد اپنے جگر گوشہ بیٹے کو جلتے دیکھ رہا تھا مگر سب مظلوم اور بے بس تھے۔

بجا طور پر اس صدی کا اندوہناک حادثہ اور بدترین سزا کا مستحق جرم ہے۔ عدالت انہیں پھانسی سے زیادہ کوئی سزا دینے کی مجاز نہ تھی۔ ورنہ اسلامی تعزیرات اور حدود کی رُو سے انہیں زیادہ عبرتناک سزا بھی دی جا سکتی تھی، انہیں زندہ جلایا جا سکتا تھا، اور تعزیراً ایسے سنگدل ظالموں کو برسرِ عام سنگسار کیا جا سکتا تھا۔ موجودہ قوانین کے علمبردار اکثر یورپی ممالک تو ایسے بدترین مجرموں کی سزائے موت کے بھی روادار نہ تھے۔ مگر اسلام کا حکم تھا کہ ایسے ننگِ انسانیت افراد کو ملک کے اہم شہروں کے چوراہوں پر سُولی

لٹکا دیا جاتا تاکہ اوروں کے لیے یہ سانحہ ایک سبق بن سکتا۔ ولیشھد عذابھما طائفۃ
من المؤمنین۔

یہ واقعہ اخبارات میں آیا، لوگوں نے پڑھا مگر اس میں غور و فکر کے جو بے شمار سوالیہ
نشان تھے انہیں نظر انداز کرتے ہوئے فراموش کر دیا گیا۔ حالانکہ تاریخ جرم و سزا کے ایسے
واقعات عبرت و موعظت کے لیے دہراتی رہتی ہے۔ یہ دلدوز واقعہ موجودہ مسلم معاشرہ
کی ایک انتہائی بھیانک تصویر پیش کر رہا ہے۔ وہ ہمیں بتلا رہا ہے کہ انسان وحشت،
بربریت اور ذلت و حیوانیت کے کس مقام تک پہنچ گیا ہے؟ واقعی انسان کتنا قابلِ رحم
ہے! چودہ سو سال قبل پوری انسانی سوسائٹی کی ایسی ہی مہیب تصویر حضور خاتم النبیین
صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھی، نہ صرف انسان بلکہ انسانی قدروں کا ہر ذرہ اپنے مقام
سے ہٹ کر نظام عالم کو تہہ و بالا کر رہا تھا۔ حضورؐ نے کس حکیمانہ شان سے نقشہ سامنے
رکھا اور خرابیوں کی اصلاح شروع کی۔ اِس وقت ساری خرابی اور بربادی کا علاج معاشی
اور اقتصادی مسائل میں سمجھا جا رہا ہے مگر ایسے وحشت اثر واقعات ہمیں جھنجھوڑ رہے ہیں
کہ یہ افراتفری اور سراسیمگی صرف پیٹ کے مسائل کی پیداوار نہیں اور نہ ہی ایک نسخۂ
کیمیا رہ گیا ہے، بلکہ اصل مسئلہ اب بھی انسان کو اُس کی انسانیت کی طرف لوٹانا ہے۔
اس کے نفس اور حیوانیت کو سدھارنا ہے، اس کی روح اور باطن کا تزکیہ کرانا ہے۔ معاش سے
ہزار درجہ اہم چیز اخلاق اور معاشرت کی طرف توجہ دینی ہے، اور موجودہ ہیجان اور پریشانی بھی
معاش سے زیادہ اخلاقی اور معاشرتی و تمدنی مسائل ہی کی پیدا کردہ ہے۔ بگڑی طبیعت اور
بُرے اخلاق بھرے پیٹ سے اور بھی بگڑ جاتے ہیں مگر ہمارے ہاں اخلاق اور معاشرت
کی طرف کتنی توجہ دی جا رہی ہے؟ عین اس وقت کہ مشرقی پاکستان میں ۲۰ لاکھ انسانی
آبادی تاریخ کے بدترین طوفان کا لقمۂ تر بن چکی ہے۔ ملک ایک رسوائے زمانہ فاحشہ عورت
شہناز اور اس کے "دوستوں" کے چرچوں سے گونج رہا ہے۔ کالج کی نوجوان طالبات اس کی
آمد آمد کا سُن کر ایک جھلک دیکھنے کے لیے پاگل ہو رہی ہیں، اُس کے گھناؤنے کردار کے
فیچر تیار کرنا اخبارات کا مشغلہ بن گیا ہے۔ اور ایسے دور میں کہ ملک ایک شدید نازک آئینی بحران

سے گذر رہا ہے۔ نہ صرف ہوٹلوں میں چوری چھپے یورپ کی طرز پر حسن کی نمائش کی جا رہی ہے بلکہ تعلیمی اداروں اور کالجوں میں فیشن شو کے نام پر پورے معاشرے کی اخلاقی بربادی کو صلائے عام دی جا رہی ہے۔ (دیکھئے ۲۶، ۲۷ فروری کے اخبارات میں ہوم اکنامکس کالج پشاور کی ایک تقریب کی تفصیلات اور مناظر)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے اصلاح کا ایک عملی نمونہ رکھ دیا تھا انہوں نے انسان کی درندگی کو بندگی اور حیوانیت کو ملکوتیت سے بدل دیا۔ اخلاق سدھر گئے، معاشرہ پاک و صاف ہوا، معاشی مسائل خود بخود حل ہوئے۔ مواسات کے جذبہ نے مساوات کی ضرورت ہی نہ چھوڑی۔ ظلم عدل سے اور وحشت الفت سے بدل گئی۔ حدود اور تعزیر کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بھی زیادہ تعلیم، تربیت اور تزکیہ سے کام لیا گیا۔ انصاف اور حق رسانی کا راستہ نہایت سہل بنا دیا گیا۔ احتساب کی گرفت کڑی رکھی گئی۔ نتیجۃً معاشرہ تاریخ کا ایک مثالی معاشرہ بن گیا۔ مگر اب؟ ساری نگاہ نری معاش پر ہے، معاد کا تصور تک نہیں، ساری توجہ بازاری سیاست پر ہے، اخلاق اور معاشرت کس بلا کا نام ہے؟ تعلیم نام کسب معاش کا رہ گیا ہے، اور اخبارات، فلم، لٹریچر، ٹیلیویژن، ریڈیو اور ثقافت "اخلاقی قدروں" کے لحاظ سے "تعلیم" کی رہی سہی کمی پوری کر جاتی ہے۔

قصبہ علی پور کا یہ المناک سانحہ ہمیں سبق دے رہا ہے کہ تمہارے اسلاف اور تمہارے آقا اور مقتدائے اعظم علیہ السلام نے پوری دنیا کے ایسے ہی ایک معاشرہ کو کس انداز سے تحت الثریٰ سے اٹھا کر اوج ثریا تک پہنچا دیا تھا۔ اس آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام لیواؤ اور خیر امت ہونے کے دعویدارو تم پوری دنیا کو نہیں تو صرف اپنے چھوٹے سے ملک کی گرتی ہوئی انسانیت کو تھامنے کی کوشش تو کرو جو اسفل السافلین کی طرف لڑھکتی جا رہی ہے۔ علی پور کے مظلوم شہداء کی پاکیزہ ارواح تم سے بھیک مانگتی ہیں اور اس بربریت کے مرتکب ظالم قاتلوں کے روح بھی تمہیں جھنجھوڑ رہے ہیں۔

الحق ——— مارچ ۱۹۷۱ء

افسوسناک حادثہ

مِنٰی کی آگ

حج کے موقع پر مِنٰی کے میدان میں آتش زدگی کا افسوسناک حادثہ رُونما ہوا۔ ابتدائی تفصیلات کے مطابق ۱۴۸ حجاجِ کرام جاں بحق اور سینکڑوں یا ہزاروں زخمی ہوئے۔ لاکھوں روپے کی املاک جل کر خاک ہو گئیں۔ کچھ پاکستانی حجاج کا سامان بھی نذرِ آتش ہو گیا۔ یہ واقعہ ہائلہ جتنا افسوسناک ہے اس سے زیادہ عبرت اور نصیحت کی دعوت دیتا ہے۔ حجاج کرام بے شک اللہ کی راہ میں شہید ہو گئے اور عین قربان گاہِ ابراہیمی میں انہوں نے جان کا نذرانہ جانِ آفریں کے سپرد کر دیا۔ مگر آئندہ کے لیے جہاں ظاہری اسباب میں مزید حفاظتی اقدامات اور تدابیر کی ضرورت ہے جس کے لیے سعودی عرب کی حکومت شب و روز کوشاں رہتی ہے وہاں یہ واقعہ دُنیا بھر کے مسلمانوں کو معنوی اور باطنی لحاظ سے بھی سبق دے رہا ہے۔ حج جیسی مقدس عبادت جو ہزاروں حکمتوں اور عظمتوں سے پُر ہے، اس کی عظمت و حرمت کو قائم رکھنے کے لیے پورے عالمِ اسلام بالخصوص حجاج کرام کو ظاہری و معنوی آداب کا پابند بنا دیا گیا ہے۔ ارضِ حرم اور حریمِ قدس کی عظمت و حرمت تمام مسلمانوں سے ان آداب اور احترامات کا تقاضا کرتی ہے مگر دیکھا جائے تو بظاہر حجاج کی تعداد میں جتنا اضافہ ہوتا جا رہا ہے اُتنی ہی حج و زیارت کی حدود و آداب کی پاسداری سے پہلوتہی ہو رہی ہے۔ نہ آداب کا اکثریت کو علم، نہ تقدس ملحوظِ خاطر، نہ احکام سے آگاہی نہ منکرات سے گریز۔ پھر جہاں حدودِ حرم کو عصرِ حاضر کی مغرب زدہ تہذیب و تمدن کی آلائشوں سے محفوظ نہیں رکھا جا رہا وہاں حاجیوں کی تعلیم و تربیت کا بھی نظام نہیں، اِلَّا مَاشَآءَ اللہ۔ حرمین الشریفین خانہ کعبہ اور مدینۃ الرسول

علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی عظمت اور وقار کو تصاویر، کیمروں، فلموں اور ٹیلیویژن کے ذریعہ مجروح کیا جا رہا ہے فحش سینما گاہوں میں اس کی نمائش ہوتی رہتی ہے اور جو عظمت و حرمت غیر مرئی صورت میں قائم رہ سکتی ہے اسے بار بار فلم اور ٹی وی کے پردوں پر دیکھ دیکھ کر ایک مسلمان قائم نہیں رکھ سکتا۔ اس جرم میں نہ صرف سعودی حکومت بلکہ پورا عالم اسلام شریک ہے، پورا عالم اسلام منکرات و فواحش اور تہذیب اور تہذیب مغرب کی لپیٹ میں ہے۔ تو جہاں سارے عالم اسلام اور بسیط ارض کے مسلمان جمع تھے وہاں ایک گونہ اس واقعۂ ہائلہ کی شکل میں پورے عالم اسلام کو ایک تنبیہ کر دی گئی کہ ہماری ذات مستغنی اور بے نیاز ہے، اس کی گرفت سے جہاں وہ چاہے اور جس وقت چاہے کوئی نہیں بچ سکتا۔ حق تعالیٰ اس واقعۂ ہائلہ سے ہم سب مسلمانوں کو سبق لینے کی توفیق دے۔

الحق ـــــ نومبر ۱۹۷۵ء

سلہ احقر مرتب کو اس واقعہ فاجعہ کے عینی شاہد مولانا عبدالواحد صاحب اختر کاتب ماہنامہ الحق نے بتایا کہ میں اس روز قربان گاہ سے واپس اپنے خیمے میں آیا اور اپنے لیے کھانا تیار کرنے کے لیے بیٹھا تھا میں کھانا پکانے میں مصروف تھا کہ دفعتہً میرے قریبی خیموں سے ہندوستان کے چند زائرین اپنے بستر وغیرہ سمیٹنے لگے میں نے اُن سے پوچھا کیا معاملہ ہے؟ انہوں نے کہا آپ کو کیا خبر! باہر جاؤ دیکھو آگ لگی ہوئی ہے میں خیمے سے باہر نکلا اور یہ سراغ لگا رہا تھا کہ یہ آگ کہاں سے شروع ہوئی ہے۔ پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ آگ ایرانی حجاج کے خیمہ میں گیس سلنڈر پھٹنے سے لگی ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے انتہائی شدت اختیار کر لی۔ فائر بریگیڈ کا عملہ اس پر قابو پانے میں مصروف تھا لیکن ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ بعد میں جدہ سے اور عملہ بلایا گیا اور بمشکل تمام اس آگ پر قابو پا لیا گیا۔ اس دوران بھی بعض نا عاقبت اندیش یا علی مدد، یا حسین مدد کے نعرے لگا رہے تھے۔ فوا اسفا۔ (مرتب)

اجتماعی خودکشی

امریکہ کے قصبہ جونزٹاؤن (گی آنا) میں پیپلز ٹمپل فرقہ کے پیروؤں نے اجتماعی خودکشی کرلی۔ ہزار سے اوپر مسخ شدہ سڑی گلی انسانی لاشیں مغربی تہذیب کے کھوکھلے پن کا منہ چڑا رہی ہیں۔ بیسویں صدی کی مہذب و متمدن انسانیت سر پیٹ کر رہ گئی ہے۔ آخر مادیت اور مادی آسائش و آرائش کی کون سی چیز ہے جو مغرب کی مادہ پرست تہذیب نے ان لوگوں کے لیے مہیا نہیں کی مگر پھر بھی روحانیت سے عاری یہ انسان کسی حقیقی چین اور ابدی سکون و عافیت کے لیے سرگردان و حیران رہا۔ اور اس طلب و تشنگی کو ایک سفاک و سنگدل انسان نے زہر کے پیالوں سے دور کرنا چاہا۔ کیا خدا بیزار تہذیب مغرب سے اجتماعی بغاوت کی اس سے بڑھ کر کوئی مثال مل سکتی ہے؟ زندگی سے فرار و گریز کا یہ انتہائی اقدام اور اجتماعی موت پیپلز ٹمپل فرقہ کی نہیں بیسویں صدی کی خدا فراموش اور خود فراموش تہذیب کی موت ہے یہ پورے مغرب کے منہ پر طمانچہ ہے اور اس صدی کی پوری انسانیت کی موت ہے۔ پھر ہے کوئی مردِ حق جو عصرِ حاضر کے اس بے چین و مضطرب انسان کو موت کی وادیوں سے ابدی حیات اور دائمی عافیت و سکون کی جنتوں کی طرف کھینچ لائے کہ جنت کے دروازے تو کھلے ہیں مگر انسان زہر کا متلاشی ہے اور وہ پروانوں کی طرح جلتی ہوئی آگ اور بھڑکتے ہوئے لاووں کی طرف لپک رہا ہے۔ اس امت کے قائد اور امام علیہ الصلوٰۃ والسلام تو ایک ایک انسان کی طرف لپک لپک کر اُسے بچانے کی فکر میں رہا کرتے تھے۔ وانا اٰخذٌ بحجزکم۔ (الحدیث)

الحق ——— نومبر ۱۹۷۸ء

ایتھوپیا میں قحط

ایک افریقی ملک ایتھوپیا میں لاکھوں افراد بھوک کے ہاتھوں موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں، بستیاں اجڑ گئی ہیں، جانور ہلاک ہوگئے ہیں، درخت جل گئے ہیں اور کھیتیاں بھسم ہوکر رہ گئی ہیں۔ ہر طرف مٹی اور گرد وغبار اڑ رہا ہے، معصوم بچے بلک بلک کر جان دے رہے ہیں، ہزاروں افراد کی ٹولیاں اِدھر سے اُدھر بھاگتی پھر رہی ہیں اور ہر طرف لاشوں کا ڈھیر چھوڑ جاتی ہیں۔

یہ بیسویں صدی کی بات ہے۔ راکٹوں اور میزائلوں کا دور اور خلائی سیاروں کا زمانہ، مغرب نے ستاروں پر کمند ڈالی اور مشرق نے کمیونزم کی شکل میں روٹی کا مسئلہ حل کرنے کا ڈھنڈورا پیٹا۔ اس تہذیب وتمدن، اس ایجاد اور انکشاف کے طوفانی دور میں لاکھوں انسان بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیں۔ اللہ اکبر! اِنہی تہذیب کی ساری طمطراق، رعنائی اور چکاچوند اور نام نہاد ترقی وعروج پر اس سے بڑھ کر خدائی تھپڑ اور کونسا ہوتا ہے؟ کہ اس تہذیب وتمدن نے انسانوں کو تحفہ دیا تو نیوکلیرائی ایٹمی ہتھیاروں کے ڈھیر لگا دیئے۔ موت کا سامان تاریخ میں کبھی اتنا ارزاں نہ تھا کہ آج اگر ایٹمی اور دیگر جنگی ہتھیار انسانوں میں بانٹ دیئے جائیں تو خدا کی اس بستی کے ہر ہر باسی کو دو دو ٹن ہلاکت خیز مادہ اور ہتھیار مل جائیں مگر نہ دے سکا تو دو وقت کھانا تو خیر بڑی بات ہے، دو دو لقمے بھی میسر نہ کرا سکا، اِدھر بھوک اور فقر وفاقہ اور اُدھر جنگی ساز وسامان میں مسابقت کہ زمین تو کیا اب خلاء اور فضائیں بھی انسان کی ہلاکت آفرینیوں کی زد میں ہیں۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی ارشادِ خداوندی فاذاقھم اللہ لباس الجوع والخوف بما کانوا یکسبون کا عملی مظاہرہ ہوسکتا ہے؟

الحق ـــــ نومبر ۱۹۸۴ء

سانحۂ بھوپال

اس نام نہاد انسانی ارتقاء کا خمیازہ بھوپال (بھارت) کے بے گناہ انسانوں کو بھی بھگتنا پڑا۔ گیس کا ایک پلانٹ پھٹنے سے دو ہزار سے زیادہ انسان ہلاک، ہزاروں نابینا، مفلوج اور اذیت ناک بیماریوں کے کرب والم میں عمر بھر کے لیے مبتلا ہو گئے، لاکھوں افراد متاثر ہوئے۔

ہیروشیما اور ناگاساکی کے بعد کسی شہر کا اتنے بڑے پیمانے پر مبتلائے آفات و مصائب ہو جانا، اور وہ بھی تمدنی ضروریات اور سائنسی ترقیات و ایجادات کے نام سے ڈوب مرنے کا مقام ہے[1] آج انسانیت ماتم کناں اور شرافت خندہ زن ہے اس مادہ پرست تہذیب و تمدن پر کہ جس کے پیدا کردہ "انسانی آفات" آفاتِ سماوی کو بھی پیچھے چھوڑ گئی ہیں۔

الحق

نومبر ۱۹۸۴ء

---

[1] اس سانحہ کی بھیانک تفصیلات اخبارات میں آچکی ہیں۔ (مرتب)
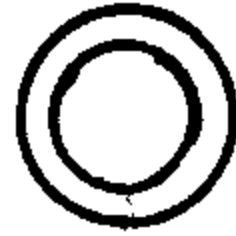
مؤتمر المصنفین کی علمی اور تاریخی پیش کش

افاداتِ حلیم

جس میں متکلم عصر شیخ التفسیر والحدیث حضرت العلامہ مولینا عبدالحلیم صاحب قدس سرہٗ صدر المدرسین دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے ختم بخاری شریف پر افادات اور مسلم شریف کے باب الکبائر کی تشریح کے ساتھ ساتھ ان کی مختصر سوانح بھی شامل ہے۔

مرتب

حافظ محمد ابراہیم فانی مدرس دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

ناشر

مؤتمر المصنفین ◎ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور

ہدیہ :- ۶/- روپے علاوہ ڈاک خرچ

مطبوعات مؤتمر المصنفین (۲)

اسلام اور عصرِ حاضر

عصرِ حاضر کی مادہ پرست تہذیب اور عالمِ اسلام پر اس کے فکری تمدنی اور عملی اثرات کا جائزہ
علمی دینی فتنوں تجدد و استشراق اور فرقِ باطلہ کا تعاقب موجودہ دور کے سیاسی معاشی تمدنی اخلاقی معاشرتی
اور آئینی مسائل میں اسلام کا موقف، قانونِ فتح و شکست اور اسباب عروج و زوال الغرض بیسویں صدی
کے کارزارِ حق و باطل میں اسلام کی بالادستی کی ایک جھلک

مولانا سمیع الحق

مؤتمر المصنفین
دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (پشاور)
پاکستان

مطبوعات مؤتمر المصنفین (۲۷)

حیات صدر المدرسین

متکلم عصر حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب زروبوی رحمۃ اللہ علیہ

صدر المدرسین دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

جس میں

آپ کے خاندانی مشائخ و اساتذہ کا تعارف حالات زندگی، کمالات و خصوصیات، علمی و ادبی خدمات اور دیگر امتیازات پر مفصل تبصرہ اور تعارف آگیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب صرف حضرت مرحوم کی سوانح حیات ہے بلکہ دار العلوم حقانیہ کی اجمالی تاریخ بھی ہے۔

مرتب

مولانا محمد ابراہیم فانی (زروبی) مدرس دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

مؤتمر المصنفین دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک